مابعد نو آبادیات اور اُردو ادب: منتخب اُردو آپ بیتیوں میں رد استعمار تناظر کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

Post Colonialism & Literatur: A critical Reasearch & study of seleted Urdu Autobiogaphies in the perspective of De-colonialism.

مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)

مقالہ نگار:

سید زاہد حسین کاظمی

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

©نومبر 2024ء

مابعد نو آبادیات اور اُردو ادب: منتخب اُردو آپ بیتیوں میں رد استعمار تناظر کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

Post Colonialism & Literatur: A critical Reasearch & study of seleted Urdu Autobiogaphies in the perspective of De-colonialism.

مقالہ نگار:

سید زاہد حسین کاظمی

یہ مقالہ

پی ایچ ڈی (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اُردو زبان و ادب)

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

©نومبر 2024ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: مابعد نو آبادیات اور اُردو ادب: منتخب اُردو آپ بیتیوں میں رد استعمار تناظر کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

پیش کار: سید زاہد حسین کاظمی رجسٹریشن نمبر: PhD/URD/S20

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبۂ اردو زبان و ادب

اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر رخشندہ مراد _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

میجر جنرل (ر) شاہد محمود کیانی، ہلال امتیاز (ملٹری) _____

ریکٹر

تاریخ: _____

اقرار نامہ

میں، سید زاہد حسین کاظمی حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے پی ایچ ڈی اسکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر رخشندہ مراد صاحبہ کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

_____

سید زاہد حسین کاظمی

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
سرورق	i
مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	ii
اقرار نامہ	iii
فہرست ابواب	iv
Abstract	vi
اظہارِ تشکر	vii

باب اول: موضوع کا تعارف اور اُصولی مباحث

الف: تمہید

i.	موضوع کا تعارف	1
ii.	بیان مسئلہ	2
iii.	مقاصد تحقیق	2
iv.	تحقیقی سوالات	2
v.	نظری دائرہ کار	3
vi.	تحقیقی طریقہ کار	4
vii.	مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	5
viii.	تحدید	7
ix.	پس منظری مطالعہ	7
x.	تحقیق کی اہمیت	8

ب۔ ردِ استعماریت کے تناظرات و مفاہیم

1.	معنی، مفہوم: ادبی تعریف و مباحث	9
2.	نوآبادیات: تصور و تناظر	16
3.	مابعد نوآبادیات: ارتقائی تصور و مفہوم	30

4. استعماریت اور ردِ استعماریت : مفہوم و معنی کی ارتقا پذیری 35
5. ردِ استعماریت کے جدید تناظر 38
○ لسانی شعور (سیاسی، سماجی اور مذہبی معنویت) 41
○ دوہری شخصیت (سیاسی، سماجی اور مذہبی معنویت) 43
○ تہذیبی آمیزش (سیاسی، سماجی اور مذہبی معنویت) 46
حوالہ جات 53
باب دوم : منتخب اُردو آپ بیتیوں میں ردِ استعماری لسانی شعور کا مطالعہ 55
(سیاسی، سماجی، مذہبی محرکات واثرات)
حوالہ جات 66
باب سوم: منتخب اُردو آپ بیتیوں میں "ردِ استعماری تشخص" کا مطالعہ 67
(سیاسی، سماجی، مذہبی محرکات واثرات)
حوالہ جات 170
باب چہارم : منتخب اُردو آپ بیتیوں میں "ردِ استعماری تہذیبی شعور" کا مطالعہ 175
(سیاسی، سماجی، مذہبی محرکات واثرات)
حوالہ جات 201
باب پنجم: ماحصل
i. مجموعی جائزہ 202
ii. تحقیقی نتائج 213
iii. شفارشات 215
کتابیات 216

Abstract

Colonialism and De-colonialism are the terms which has broadly affected the societies in all fields. These terms have greatly reflected in the literature of colony, especially the autobiographies written by the intellectuals of the colony. Colonialism is a type of governance in which the powerful unitedly enslave the oppressors. Colonialism calmly exploits economic, social, political and sociological rights of the natives.

In this research dissertation, author have conducted the research in autobiographies named “KALA-PANI”, “KAID-E-FARANG”, “BOE GUL NALAE-DIL DODE CHARAGHE MEHFIL” and “NAKABAL-E- FARAMOSH”, in the light of colonialist and De-colonialistic back ground.

In the autobiographies, autobiographists had depicted the conditions which they had faced. The autobiographies show the facts through which the colonieser got control over the religious, political, sociological and economical fields of life of British India.

As for as the resistance to this panorama, De-coloialistic movements have prevailed in the colonial era.

Yet colonialism have also affected the native civilization and languages. Colonialism have changed the internal fabric of the colonized society and have transformed the educational, artistic and traditional face of the colony.

اظہارِ تشکر

میں اس تحقیق کی تکمیل پر خدائے بزرگ و برتر کا شکر گزار ہوں کہ جس کی عنایت سے اس قابل ہوا اور سلام ہو اللہ کے ان منتخب بندوں پر جنہیں اپنی بارگاہ مقدسہ سے سرفراز کیا اور معلمی کا شرف بخشا۔

سید زاہد حسین کاظمی

باب اول

موضوع کا تعارف اور اُصولی مباحث

الف: تمہید

1- موضوع کا تعارف (Introduction to Proposed Research)

اس مقالہ میں مابعد نوآبادیات کے اثرات اور ردِ استعمار کے تناظر میں پاکستانی منتخب اُردو آپ بیتیوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ مقصود ہے۔ آپ بیتی وہ صنف سخن ہے جو خیال آفرینی کی آمیزش سے کسی حد تک مبرا ہے اور اس کی مدد سے ذاتی مشاہدات اور تغیر پذیر معاشرتی اقدار اور ردِ استعمار کی حقیقی تصویر پیش کی جا سکتی ہے۔ یہ ایک غیر افسانوی صنف سخن ہے اور جو حقیقی واقعات پر مبنی ہے۔

نوآبادیاتی نظام شروع تو اس لئے ہوا کہ طاقتور نوآبادکاروں کے پاس معاشی وسائل کم ہو گئے تو انہوں نے کمزور عسکری قوت کے علاقوں کو فتح کیا اور ان کے وسائل پر قابض ہو گئے۔ جہاں جہاں یہ نوآبادیات قائم ہوئیں وہاں نوآبادکاروں نے اپنے قوانین، معاشرت اور حکومت مسلط کی، یوں قابض گروہ اور مقامی باشندوں کے درمیان جبر و استحصال کا تعلق سامنے آیا۔ چنانچہ نوآبادیات اور استعماریت لازم و ملزوم ہیں۔ کیونکہ استعماریت وہ تصور ہے جس کے ذریعے نوآبادیاتی نظام کو عملاً نافذ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مابعد نوآبادیات مطالعے کسی بھی خطے میں نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد کی صورتحال پر مبنی ہوتے ہیں۔

مابعدِ نوآبادیات جدید تھیوری کا ایک نیا طرز ہے جو حاکم و محکوم کے سماجی، سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی رشتوں کا مطالعہ کرتا ہے جو کہ استعماریت کے بعد معرض وجود میں آتے ہیں۔ مابعد نوآبادیاتی مطالعات، نوآبادیاتی دَور میں وضع شدہ بیانیوں کو واشگاف کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مابعد نوآبادیات کی جدید تھیوری نوآبادیاتی نظام اور اس عہد کے فکر و عمل کے اثرات کے بارے میں آگاہی دیتی ہے۔ منتخب آپ بیتیوں کو بنیادی مآخذ بناتے ہوئے ان پر اس تھیوری کے حوالے سے سماجی اثرات کا جائزہ لیا جائے گا۔

2- بیان مسئلہ (Statement of Problem)

اردو آپ بیتیوں میں قومیت پرستی، مخاصمت و مفاہمت ، لسانی شعور، دوہری شخصیت اور تہذیبی آمیزش کے روّیے نوآبادیات کے بیانیوں کا ردِ عمل ہیں۔انہیں تنقیدی مطالعہ کا حصہ بننا چاہئے اور مابعدِ نوآبادیات میں رد استعمار کے تناظر میں جامعاتی سطح پر ان بیانیوں کا تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ کیا جانا چاہئے ۔اس لئے مجوزہ تحقیقی مقالہ منتخب اردو آپ بیتوں کو بنیادی مآخذ بناتے ہوئے مابعد نوآبادیاتی بیانیوں اور رویوں تک پہنچنے کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ ہے۔اس تحقیق میں منتخب آپ بیتیوں میں فکر و احساس اور ابلاغ و اظہار کے ان تازہ گوشوں کا جائزہ لینا مقصود ہے، جو مابعد نوآبادیات اور ردِ استعماریت کے تناظرات کی تفہیم کرتے ہوں چنانچہ اس مقالے میں مجوزہ تھیوری کی تمام جزئیات کو سامنے رکھتے ہوئے اُن پوشیدہ محرکات واثرات کو سامنے لانا ہے جس پر آپ بیتی کی صنف کے تناظر میں ابھی تک تحقیقی کام نہیں ہوا۔

3- مقاصد تحقیق (Research Objectives)

مجوزہ تحقیقی مقالہ کے مقاصد درج ذیل ہیں:-

1۔ مابعد نوآبادیات تھیوری کے ناقدین کے ہاں سیاسی و سماجی تبدیلیوں کے زیر اثر مابعد نوآبادیات کے ارتقا پذیر مفاہیم کا جائزہ لینا۔

2۔ منتخب آپ بیتیوں میں مابعد نوآبادیاتی تناظر کے ردِ استعماری عناصر و عوامل کی نوعیت کا مطالعہ کرنا۔

3۔ منتخب آپ بیتیوں میں ردِ استعماریت کے تناظر میں لسانی شعور، دوہری شخصیت اور تہذیبی آمیزش کے بیانیوں کا مطالعہ کرنا۔

4- تحقیقی سوالات (Research Questions)

1۔ مابعد نوآبادیاتی تھیوری میں ردِ استعماریت کے مختلف تصورات کی ارتقائی صورتیں کیا ہیں؟

2۔ منتخب آپ بیتوں میں مابعد نوآبادیاتی تناظر کے ردِ استعماری عناصر و عوامل کی نوعیت کیا ہے؟

3۔ منتخب اُردو آپ بیتیوں میں ردِاستعمایت کے تناظر میں لسانی شعور، دوہری شخصیت اور تہذیبی آمیزش کے بیانیوں کی سیاسی، سماجی اور ادبی معنویت کیا ہے؟

5- نظری دائرہ کار (Theoretical Framework)

مقالے کا مجوزہ عنوان " مابعد نوآبادیات اور ادب : منتخب اردو آپ بیتیوں میں رد استعمار تناظر کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ " ہے۔ فرانز فینن (Frantz Fanon) مابعد نوآبادیات کی جدید تھیوری کے سالاروں میں شامل ہیں۔ فینن (Fanon) نے اپنے نظریات 1961ء میں اپنی کتاب "The Wretched of the Earth" میں پیش کئے۔ اس کتاب کا اُردو ترجمہ "اُفتادگانِ خاک" کے نام سے کیا گیا ہے۔ مابعد مطالعوں میں دوسرا اہم نام ایڈورڈ سعید (Edward W. Said) کا ہے۔ ایڈورڈ سعید کو مابعد نوآبادیاتی تنقید کا بنیاد گذار تسلیم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب "Orientalism" (اُردو ترجمہ : شرق شناسی) میں اس موضوع پر بحث کی ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں :

> "امپیریل ازم سے مُراد دُور دراز خطے پر حکمرانی کرنے والے کس غالب میٹروپولیٹن مرکز کا عمل، نظریہ اور رویے ہیں۔ کولونیل ازم جو تقریباً ہمیشہ امپیریل ازم کا نتیجہ ہوتا ہے، وہ دور دراز خطے پر آبادکاری کو مسلط کرنے کا نام ہے۔ "

سی ایل اِنس (C.L.Innes) مابعد نوآبادیاتی تجزیے کے مقصود کے ضمن میں لکھتے ہیں :

> "(مابعد نوآبادیات) ثقافتی تبادلے میں طاقت کے رشتوں کی اہمیت اس حد تک تسلیم کرتی ہے۔ جس حد تک آبادکار اپنی زبان، اپنی ثقافت اور طرز عمل کا مجموعہ مسلط کرتا ہے اور جس حد تک محکوم باشندے اس تسلط کے خلاف مزاحمت کرنے، اس سے ہم آہنگ ہونے یا اسے زیروزبر کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ "

ناصر عباس نیر کے نزدیک مابعد نوآبادیاتی مطالعوں کی معنویت کچھ یوں ہے :

> "مابعد نوآبادیاتی مطالعہ ، ثقافت اور فکر کو استعمار کی مخفی اور عیاں زنجیروں سے رہائی دلاتا ہے۔ "

درج بالا ناقدین کے ردِاستعماریت تناظرات کو سامنے رکھتے ہوئے فریم ورک ترتیب دیا جائے گا جو کہ درج ذیل ہونگے۔

مابعد نوآبادیاتی مطالعوں میں ردِاستعماری تناظر:

i. لسانی شعور

ii. دوہری شخصیت

iii. تہذیبی آمیزش

مجوزہ تحقیقی مقالے میں ردِاستعماریت کے تناظر میں منتخب آپ بیتیوں کے متن کا مطالعہ کیا جائے گا اور دیکھا جائے گا کہ مابعد نوآبادیاتی مطالعوں میں ردِاستعماریت کے تناظر میں لسانی شعور، دوہری شخصیت اور تہذیبی آمیزش کے بیانیوں کے پس پردہ سیاسی، سماجی اور مذہبی عوامل کی حقیقت کیا ہے۔

6- تحقیقی طریقِ کار (Research Methodology)

یہ موضوع خالصتا تحقیقی و تنقیدی ہے۔اس میں مابعد نوآبادیاتی تنقیدی تصورات و نظریات کے اطلاق کا مطالعہ شامل ہے۔اس تحقیق کا طریقہ کار "تاریخی اور دستاویزی" اختیار کیا جائے گا۔جو کہ استقرائی طریقہ تحقیق کے ضمن میں آتی ہے۔فرانز فینن (Frantz Fanon) کے نزدیک مابعد نوآبادیات کا مطالعہ دراصل نوآبادیات کے اثرات کا جائزہ لینا ہے۔جو مقامی اقوام میں قومیت کا شعور ابھارتا ہے۔اور وہ اپنی طاقت کو از سر نو مجتمع کرتے ہوئے طاغوتی طاقتوں سے نبرد آزما ہونے کی ٹھان لیتے ہیں اور ردِاستعمار کی صورتحال سامنے آتی ہے اور استعمار زدہ آزادی کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔مابعد نوآبادیات تنقید حاکم و محکوم کے درمیان رشتوں کا تجزیہ کرتی ہے جس میں استعمار کو برتری حاصل ہے وہ جبر و استبداد اور استحصالی قوتوں کو بروئے کار لا کر اپنے مشن میں کامیاب رہتا ہے۔مابعد نوآبادیاتی مطالعہ دراصل نوآبادیاتی ثقافت کی تشریح نہیں بلکہ یہ اس کی تعبیر ہے جسے واشگاف کیا جائے گا۔

کتب و رسائل کے لئے شہر کی لائبریریوں سے استفادہ کیا جائے گا۔مابعد نوآبادیات کے حوالے سے انگریزی ادب کی کافی کتب انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔ ریختہ ڈاٹ کام اور انٹرنیٹ سے لی جائے گی۔ جن کا اندراج کتابیات میں کر دیا گیا ہے۔اس کے علاوہ صاحب علم دوستوں اور اساتذہ سے رہنمائی لی جائے گی۔ موضوع کے چناؤ میں کسی قسم کا بھی تذبذب سد راہ نہ بنا کیونکہ اس پہلو پر ابھی تک کام نہیں ہوا۔ مابعد نوآبادیات کا فلسفہ جتنا سادہ نظر آتا ہے حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

زیر تحقیق متون کا انتخاب رجحان ساز شخصیات کی آپ بیتیوں سے کیا ہے کیونکہ موضوع بڑا وقیع ہے۔اس لئے درج ذیل آپ بیتیوں کو منتخب کیا گیا۔ ان میں "کالا پانی المعروف تواریخ عجیب از محمد جعفر تھانیسری، "قید فرنگ" از حسرت موہانی، "بوئے گل، نالۂ دل، دُودِ چراغِ محفل" از شورش کاشمیری ، اور "ناقابل فراموش" دیوان سنگھ مفتون۔ مابعد نوآبادیاتی مطالعوں میں ردِاستعماریت کے تناظر میں قومیت پرستی، باہمی مخاصمت و مفاہمت، احساس کمتری، لسانی شعور، منافقت اور تہذیبی آمیزش کے رویوں کا سماجی ، سیاسی، مذہبی اور ثقافتی عناصر کو مد نظر رکھتے ہوئے۔ مذکورہ آپ بیتیوں کے متون کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کیا جائے گا۔ اور ان شخصیات کی آپ بیتیوں کے حوالے سے ملک کے نامور ادبا کے انٹرویوز کئے جائیں گے اور اہل علم حضرات سے سوالنامے پُر کروائے جائیں گے تاکہ حقائق کی بازیافت عمدگی سے کی جاسکے۔

7- مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق (Works already done)

مجوزہ موضوع "مابعد نوآبادیات اور ادب : منتخب اردو آپ بیتیوں میں رد استعمار تناظر کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ " کرنا مقصود ہے۔ ایچ ای سی کی ویب سائٹ، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور دیگر جامعات کی کتب اور فہرستوں سے یہ جانکاری ہوئی ہے کہ اس موضوع پر ابھی تک رسمی و غیر رسمی کسی بھی سطح پر تحقیقی و تنقیدی کام نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ چند معروف ادبا، شعرا، سیاستدان، فوجی اور ٹیکنوکریٹ کی آپ بیتیوں پر فکر و فن اور اسلوبیاتی سطح پر کام کیا گیا ہے جبکہ مجوزہ تحقیقی و تنقیدی

منصوبے پر کوئی کام نہیں ہوا ہے۔ابھی تک جن موضوعات پر کام ہوا ہے ان عنوانات کی فہرست تفصیل کے ساتھ ذیل میں درج ہے۔

1. لبنیٰ نصیر، "اردو کے تین فکشن نگاروں (ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر رشید امجد اور نثار عزیز بٹ) کی آپ بیتیوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ"، بہاؤالدین یونیورسٹی، ملتان، 2005ء، ایم فل
2. مدیحہ بتول، "اختر حسین رائے پوری اور حمید اختر کی آپ بیتیوں کے فنی امتیازات"، بہاؤالدین یونیورسٹی، ملتان، 2006ء، ایم فل
3. ثمینہ یاسمین، "ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کی سوانح 'اپنا گریبان چاک' کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ "اسلامی انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد، 2009ء، پی ایچ ڈی
4. فریدہ نذیر، "قدرت اللہ شہاب اور ان کے ادبی کارنامے"، اے آئی اویو، اسلام آباد، 1991ء، ایم فل
5. حمیرا ماجد، "پاکستان میں اہم آپ بیتیوں کی تاریخ کا تنقیدی جائزہ"، جی سی یونیورسٹی، لاہور، 2003ء، ایم فل
6. اطہر قسیم، "اردو ادب کی آپ بیتیاں: تحقیقی و تنقیدی جائزہ"، نمل، اسلام آباد، 2008ء، پی ایچ ڈی
7. محمد طاہر صابر، "اردو آپ بیتیاں اور یادداشتیں: لاہور کی ادبی ثقافتی، سیاسی و سماجی صورتحال کی عہد بہ عہد عکاسی" نمل، اسلام آباد، پی ایچ ڈی
8. ممتاز پروین، "اردو ادب کی خواتین آپ بیتی نگار"، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، 2004ء، ایم فل
9. صدیقہ ہاشمی، "کار جہاں دراز میں: فکری و فنی جائزہ"، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، 2007ء، ایم فل
10. عصمت اللہ، "اردو ادب کی متنوع شخصیت۔ڈاکٹر سلیم اختر: خود نوشت اور سفر نامے کے تناظر میں"، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، 2010ء، ایم فل

8- تحدید (Delimitation)

مجوزہ مقالے کا عنوان " مابعد نوآبادیات اور اُردو ادب : منتخب اُردو آپ بیتیوں میں ردِاستعمار تناظر کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ " ہے۔ یہ موضوع نیا اور جدید ہے۔ جامعاتی سطح پر ابھی تک اس پر کام نہیں ہوا ہے۔ اس موضوع کے لئے درج ذیل آپ بیتوں کا انتخاب کیا گیا ہے اور یہ آپ بیتیاں مختلف الذہن معروف شخصیات کی ہیں جو دَور ردِ استعماریت کے رجحان ساز کہلائے اور ان کا انتخاب بھی اس لئے کیا گیا ہے۔ تاکہ حقائق کا ادراک ہو سکے۔ منتخب آپ بیتیوں کے نام ذیل میں درج ہیں۔ "کالا پانی المعروف تواریخ عجیب " از محمد جعفر تھانیسری، "قید فرنگ" از حسرت موہانی، "بوئے گل، نالۂ دل، دُودِ چراغِ محفل" از شورش کاشمیری، "ناقابل فراموش" دیوان سنگھ مفتون۔ ان آپ بیتیوں کے متون کو مابعد نوآبادیات کے حوالے سے ردِ استعماریت کے تناظر میں پرکھا جائے گا اور امید کی جا سکتی ہے کہ اس کے نتائج کا استخراج قاری کو ایک بار پھر فکری سطح پر متحرک کرے گا اور اس کی فکری آسودگی کا باعث بنے گا۔

9- پس منظری مطالعہ (Literature Review)

مجوزہ موضوع پر کام کرنے کے لئے جن کتب کا مطالعہ کیا گیا ہے ان میں بنیادی مآخذ کے علاوہ تنقیدی اُردو کتب ، انگریزی کتب اور ان کے تراجم شامل ہیں۔ جن کی تفصیل کتابیات میں درج ہے۔

مابعد نوآبادیاتی تھیوری اور ردِ استعماریت کے حوالے سے جن کتب کا مطالعہ کیا جائے گا وہ یہ ہیں۔

1۔ ناصر عباس نیر، "مابعد نوآبادیات : اردو کے تناظر میں

2۔ ناصر عباس نیر، "اردو ادب کی تشکیل جدید"

3۔ اشفاق سلیم مرزا، "فلسفہ تاریخ نوآبادیات اور جمہوریت"

4۔ محمد عامر سہیل، "نوآبادیات و مابعد نوآبادیات : نظریہ، تاریخ، اطلاق"

5۔ سبط حسن، "پاکستان میں تہذیب کا ارتقا" اور پاکستان کے تہذیبی و سیاسی مسائل"

6۔ جمیل جالبی، " پاکستانی کلچر" لاہور
7۔ فینن فرانز، "افتادگان خاک"، مترجم: محمد پرویز، سجاد باقر رضوی
8۔ ایڈورڈ سعید، " شرق شناسی"،
9۔ طارق ہاشمی، "داغ دہلوی (مابعد نوآبادیاتی مطالعہ)"

10- تحقیق کی اہمیت (Significance of study)

تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ گذشتہ ادوار میں استعماریت کس طرح غالب رہی اور اس کے جبر و استبداد کا مقابلہ اُن اقوام نے کس طرح کیا؟ اور بعد میں ردِ استعماریت کے اثرات کیا رہے؟ اس کے علاوہ استعماریت نے کس طرح اس علاقے کے خزائن سے اِستفادہ کیا اور کون سی آسانیاں پیدا کی گئیں اور اس خطے کی سیاست و ثقافت، تہذیب و تمدن پر کون سے نقوش مرتب کئے؟ وہ کونسے سخت مقامات تھے۔ جہاں روایات اور کلچر ضعف کا شکار ہو کر زوال آمادہ ہوئے۔ ان تمام اٹھائے گئے نکات سے اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ جو کہ مابعد نوآبادیات میں ردِ استعماریت کے تناظر میں آتے ہیں۔ اور یہ حاکم و محکوم کے سماجی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی رشتوں کا مطالعہ کرتی ہے۔ کیونکہ دونوں کا بندھن نوآبادیاتی و استعماری نظام کے تحت قائم ہوتا ہے۔ اس نظام میں استعمار اپنی طاقت کے ذریعے سیاسی، علمی، اقتصادی اور ثقافتی میدان میں اثر انداز ہوتا ہے اور آئینی اصلاحات کے ذریعے ان کے نفوذ کو ممکن بناتا ہے۔ جس کے نتیجے میں نئی تہذیبی و علمی، فکری و ادبی روشیں پیدا ہوتی ہیں اور مابعد نوآبادیات تھیوری ردِ استعماریت کے تناظر میں استعمار کی بالادستی اور وہاں کی ثقافتی، سیاسی، تعلیمی اور اقتصادی صورتحال اور حاکم و محکوم کے رشتوں کا تجزیہ کرنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ جنہیں اُنھیں نے ابلاغِ عامہ، تعلیمی و ادبی انجمنوں اور کتب کے ذریعے مستعمل کیا۔

جب قوموں کو محکوم بنالیا جائے اور ماحول گھٹن زدہ ہو، فکر و قلم پر پہرے بٹھادیے جائیں تو تخلیق کار اپنی تحریروں میں ان رویوں اور اقدار کا تذکرہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ ان ٹیبوز کو توڑتا ہے اور اپنی پوری تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس پُر آشوب دور کے منظر نامے کو بڑی جرات

و بہادری سے اپنی فکر کی زینت بنایا اور پھر اس کا اظہار اپنی زبان و قلم سے کرتا ہے۔ اس لئے اُس دَور کی رجحان ساز شخصیات کی آپ بیتیوں کو موضوع بنایا۔ اس گھٹن زدہ ماحول میں کئے گئے کام کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کرتے ہوئے ضروری ہے کہ اُن حالات و واقعات کے تاریخی حقائق سے نئی نسل کے لئے آگاہی کا سبب بنیں اور حقیقت کا ادراک رکھتے ہوئے ۔ اُن مضمرات سے پردہ اُٹھائیں۔ کیونکہ آپ بیتی کسی حد تک اس دَور کی حقیقی تصویر اور خیال آفرینی سے مبرا ہوتی ہے۔ یہ وقیع کام محقیق کے لئے یہ جواز فراہم کرتا ہے کہ وہ آج کے قاری اور محقق کے لئے آسانی پیدا کرتے ہوئے۔ اس دور کی بندشوں کو منظر عام پر لائے اور تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کرے تاکہ دور حاضر کا قاری اس کی تفہیم سے استفادہ کر سکے۔

ب۔ ردِ استعماریت کے تناظرات و مفاہیم

ا۔ رد استعماریت، معنی، مفہوم: ادبی تعریف و مباحث

جب سے یہ دنیا وجود میں آئی ہے اس وقت سے انسانوں کے درمیان باہمی رقابتوں کی داستان جاری ہے۔ یعنی باہمی کشمکش، غلبہ پسندی اور طاقت کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ بقول علامہ ڈاکٹر محمد اقبال:

"ستیزہ کار رہا ہے۔ ازل سے تا امروز"

قابیل، نمرود، فرعون، شداد اور اس طرح کے بے شمار ستیزہ کار معاشرتی افق پر براجمان رہے ہیں۔ کبھی عربی، ترکی، ایرانی، برطانوی یعنی مختلف اقوام کا راج قائم رہا ہے یا یوں کہیے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس " مقولہ کے مصداق حکومتیں قائم رہیں۔ بالکل اسی طرح برصغیر کی تاریخ بھی اپنے جلو میں کچھ اس قسم کے محرکات سمیٹے ہوئے ہے۔ استعمار نے اس سرزمین پر بھی اپنے پنجے گاڑھے اور اس خطے کے فیوض و ثمرات سے بہرہ مند ہوئے۔ اگر تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو پتہ چلے گا کہ گذشتہ ادوار میں استعمار کس طرح قابض رہا، اس کے جبر و استبداد کا مقابلہ ان اقوام نے کس طرح کیا اور یہ اس معاشرے پر کون سے دُور رس اثرات چھوڑ گیا۔ استعمار کے طاقت ور حربوں سے معاشرے پر پڑنے والے اثرات کو با آسانی سمجھا جا سکتا ہے جس نے صدیوں سے مروج نظام، رواج، زبان اور روایات کو تہہ بالا کر دیا۔ استعمار کے خلاف استعمار زدہ اقوام کی کش

مکش کو دیکھا جاسکتا ہے۔ جس سے رد استعماریت کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر غلامی کا لبادہ اتارنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ سب سے پہلے ان تمام اصطلاحات و محرکات کا جائزہ لیا جائے جس کی وجہ سے استعماریت اور رد استعماریت معرض وجود میں آئی۔

استعماریت ایک تاریخی عمل ہے۔ اردو میں " نوآبادیات " جبکہ انگریزی میں "Colonialism" کہتے ہیں۔ اور لغوی اعتبار سے "استعماریت" کے معنی ہیں کہ زبردستی کسی قریبی ملک کو اپنے ساتھ ملا لینا یا دوسری مکمل آبادیوں پر قابض ہو جانا۔ "استعمار" کو انگریزی میں "Colonisation" کہتے ہیں اور اس کے لفظی معنی کسی کو کسی مقام پر بسانا اور غاصبانہ قبضہ کے ہیں اس سے مراد دوسرے ملک کو نوآبادی بنا کر اس سے فائدہ حاصل کرنا اور یہ لفظ تعمیر کے مترادف ہے یعنی یہ تخریب کی ضد ہے۔ لفظ " استعماری " استعمار کی صفت یا اس سے منسوب کے ہیں یعنی یہ صفت نسبتی ہے۔ " استعمار " یہ ان لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو ہجرت کر کے ایک جگہ سے کسی دوسری جگہ جاتے ہیں اور اسے اپنا وطن بناتے ہیں۔ اور اس طرح استعمار مکمل سیاسی غلبے کے ساتھ ظلم و بربریت سے کام لے کر مقامی ثقافتوں کو مسخ کر دیتا ہے اور اپنے نئے نظام کو متعارف کرواتا ہے۔ جس میں طاقتور ممالک یا اقوام معاشی، سیاسی اور سماجی وجوہات کی بنا پر دوسرے ممالک پر اپنا تسلط قائم کرتی ہیں اور اس معاشرے میں اپنا اثر رسوخ بڑھاتی ہیں یہ تسلط اکثر مختلف ذرائع سے حاصل کیا جاتا ہے جن میں اپنی فوجی طاقت، سیاسی جوڑ توڑ، معاشی استحصال اور ثقافتی یلغار شامل ہیں۔ زیر تسلط علاقوں کو نوآبادیات یا استعماریت کہا جاتا ہے۔ استعمار کی بنیادی خصوصیات میں سے پہلی خصوصیت سامراجیت ہے۔ سامراجیت کے لغوی معنی ملوکیت یا شہنشاہیت کے ہیں اور انگریزی میں اسے "Imperialism " کہتے ہیں. سامراجیت سیاسی اطاعت کا خواہشمند نظام حکومت ہے جس میں صرف سیاسی غلبہ حاصل کیا جاتا ہے یا محدود خطے کو مزید وسعت دے کر اپنی برتری کا پرچم لہرا دیا جاتا ہے۔ ایڈورڈ سعید کہتے ہیں:

"Imperialism means the practice, the theory, and the attitudes of a dominating metropolitan centre ruling

a distant territory: 'colonialism' which is almost always a consequence of imperialism, is implanting of settlements on distant territory."

"سامراج کا مطلب ہے دور دراز علاقے پر حکمرانی کرنے والے غالب میٹروپولیٹن مرکز کا عمل، نظریہ اور رویے ہیں۔ استعمار جو کہ تقریباً ہمیشہ سامراج کا نتیجہ ہوتا ہے، دور دراز علاقے پر بستیوں کی آبادکاری کا نام ہے۔"[1]

استعماریت اور سامراجیت میں تاریخی تعلق ہے حالانکہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جبکہ استعماریت کا سامراج کے ساتھ گہرا تعلق ہے جہاں طاقتور اقوام دوسرے ممالک پر اپنا تسلط حاصل کرنے اور بعد ازاں اسے برقرار رکھنے کے لیے اپنی طاقت اور اثر و رسوخ کو بڑھانے کی کوشش کرتی ہیں۔ سامراجی طاقتیں اکثر اپنے فائدے کے لیے نوآبادیاتی علاقوں کے وسائل پر قبضہ کرنے کے ساتھ وہاں کے محنت کشوں کا استحصال کرتی ہیں۔ استعماریت کی دوسری بڑی خصوصیت معاشی استحصال ہے استعمار کے بنیادی محرکات میں سے ایک محرک محکوم ملک کی معیشت سے فائدہ اٹھانا ہے۔ وہ اپنے آبائی ممالک کو مالا مال کرنے کے لیے نوآبادیاتی علاقوں سے قیمتی وسائل اپنے ملک میں منتقل کرتے ہیں جن میں معدنیات ہوں یا زرعی مصنوعات سبھی پر ہاتھ صاف کرتے ہیں جس سے استعماری ملک کی مالی حالت بہتر ہو جاتی ہے بعد ازاں یہ معاشی استحصال، دولت اور ترقی میں نمایاں فرق کا باعث بنتا ہے۔ استعمار کی اگلی خصوصیت ان علاقوں کو سیاسی طور پر اپنا دست نگر رکھنا ہے تاکہ ساری عمر وہ محکومی کی زندگی گذاریں۔ اس لئے وہ ان نوآبادیاتی علاقوں پر اپنا سیاسی اختیار استعمال کرتے ہیں۔ استعمار کی چالاکیاں ان کی اختیار کی گئی حکمت عملیوں سے عیاں ہے۔ مقامی طاقتور لوگوں کو اپنا زرخرید بنا کر انہیں راضی کیا جاتا ہے کہ وہ ان کے ہر طرح کے مفادات کا خیال رکھیں اور وہ استعمار زدہ کو قابو میں رکھ کر ان کو مطیع و فرمانبردار بنائیں اور ان علاقوں کا انتظام وانصرام اپنے محکوم نمائندوں کے ذریعے قائم کرتے ہیں لیکن ایسے نوآبادیاتی علاقوں کی حکومتی ڈھانچے میں سیاسی خود مختاری عام طور پر محدود ہوتی ہے لیکن مقامی استعمارزدہ لوگوں کی کوئی نمائندگی نہیں ہوتی بلکہ ان کی سیاسی آزادی بھی سوالیہ نشان ہے۔ استعمار اپنے

مقامی نمائندوں کے ذریعے اپنے بے جا احکامات و قوانین نافذ کرتا ہے اور ان پر عمل پیرا کروانے کے لئے استعمار زدہ سے ناروا سلوک روا رکھا جاتا ہے. میکالے کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

"We must have present do over best to form a class who maybeinterpreting between US and the million home we govern- a class of persons Indian in blood and colours but English in tastes in opinion in morals and intellect"

"ترجمہ: ہمیں ایک ایسا طبقہ تشکیل دینے کے لیے پوری کوشش کرنی چاہیے جو شاید امریکہ اور ان کڑوڑوں لوگو کے درمیان جن پر ہم حکومت کر رہے ہیں۔ لوگوں کا ایک ایسا طبقہ جو خون اور رنگ میں ہندوستانی ہو لیکن ذوق، اخلاق، ذہن اور رائے کے لحاظ سے انگریز"[2]

لارڈ میکالے، جس کا پورا نام تھامس بیبنگٹن میکالے تھا وہ انیسویں صدی کا ایک ممتاز برطانوی پارلیمنٹیرین, ہندوستانی سپریم کونسل کا ممبر قانون اور مقالہ نگار تھے۔ یہ ان کی مشہور تعلیمی رپورٹ جو انہوں نے ہندوستان کے حوالے سے لکھی اس کا اقتباس ہے۔ جس میں وہ ایک ایسا طبقہ وجود میں لانے کے لئے کوشاں ہیں جو اس معاشرے میں ہماری نمائندگی کرے جس کا تعلق اسی معاشرے سے ہو اور وہ ہماری حمایت کرے اور ہمارے پیغام کو آگے پہنچائے۔ یہ گروہ ایسے افراد پر مشتمل ہو جو مقامی دیکھائی دے۔ اس کا قد کاٹھ، رنگ و خاندان کے اعتبار سے ہندوستانی دیکھائی دے لیکن اخلاقی روایات، ذہانت اور فراست کے لحاظ سے انگریز دیکھائی دے۔ انہوں نے 1830ء کی دہائی میں گورنر جنرل کونسل کے لاء ممبر کی حیثیت سے اپنے دور میں برٹش انڈیا کے بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ وہ اپنے "منیٹ آن ایجوکیشن" کے لیے مشہور ہیں، جو ہندوستان میں انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اور وہاں مغربی تعلیمی نظام متعارف کرانے کی وکالت کرتے ہیں۔ مزید برآں، وہ اپنے تاریخی کاموں کے لیے جانے جاتے ہے، خاص

طور پر ان کی کثیر جلدوں پر مشتمل "ہسٹری آف انگلینڈ" میں واضح درج ہے۔ "لارڈ میکالے" یہ وہ شخصیت ہیں۔ جنہوں نے 1835ء میں ہندوستان کا " نظام تعلیم" ترتیب دیا گیا اور آج تقریباً 75 سال گزر جانے کے بعد بھی اسی نظام تعلیم کا حصہ ہیں گو کہ اس میں کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں لیکن بنیادی ڈھانچہ وہی ہے۔ 2 فروری 1835ء میں "لارڈ میکالے" پورے ہندوستان کا سفر کیا تا کہ وہ جائزہ لے سکے اور وہ بہت سارے لوگوں سے ملا تا کہ انہیں پرکھ سکے اس کے بعد اس نے کہا تھا کہ اس ملک میں دولت بہت ہے ہر شخص محنتی اور ایماندار ہے۔ ان کی اخلاقی قدریں بہت گہری ہیں۔ ذہنی استعداد کار بھی بہت اچھی ہے۔ اور یہ بہت اچھی روایات کے مالک ہیں۔ ہم انہیں اس وقت تک شکست نہیں دے سکتے جب تک ہم ان کو ذہنی طور پر اپنا غلام نہ بنالیں اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان کی مذہبی اور ثقافتی اقدار باقی ہیں۔ ان کی زندگیوں کا محور ہیں۔ انہوں نے کچھ تجاویز پیش کیں۔ جس میں بتایا گیا کہ ان کے نظام تعلیم کو یکسر تبدیل ہونا چاہیے تا کہ وہ ہمارے دیئے گئے نظام تعلیم کو اپنا کر اپنے آپ کو مہذب کہلوا سکیں۔ ان کی تہذیب کو تبدیل ہونا چاہیے اور اس جگہ پر ہماری دی گئی تہذیب و ثقافت کو اپنا کر فخر محسوس کریں گے۔ جس سے وہ اپنی ساکھ کھو دیں گے اور حقیقت میں وہ ہمارے مطیع و فرمانبردار بن جائیں گے۔ اس سے اندازہ لگانا انتہائی آسان ہے کہ انہوں نے کس طرح انتہائی مربوط طریقہ سے منصوبہ سازی کی کہ فریق دوم کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔

استعماریت کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ثقافتی آمیزش بھی ہے۔ استعمار اپنے تسلط کو مضبوط کرنے اور اسے طول دینے کے لئے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتا رہا ہے ان میں سے ایک تہذیبی آمیزش ہے جس کے ذریعے وہ اپنی مقبوضہ آبادیوں پر اپنی ثقافت، زبان، مذہب اور رسم و رواج کو مسلط کرتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں مقامی ثقافت و روایات دب کر رہ جاتی ہیں اور اس طرح بدیسی ثقافت و روایات سماجی معاشرت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ سر سید احمد خان نے " مقالات سر سید" میں اپنے ایک مضمون " نئی تہذیب" میں مقامی باشندوں کی صورتحال کو بیان کیا ہے:

> "(یورپین) کہتے ہیں کہ ہندوستانی بندر کے موافق ہیں جو چوتڑوں کے بل زمین پر بیٹھتے ہیں. بندر کے موافق کھانے میں ہاتھ سان کر ہاتھ سے کھانا کھاتے ہیں۔

کوئی تمیز ان کی معاشرت میں نہیں ہے۔ وحشیوں سے کسی قدر بہتر ان کا لباس
ہے۔ گو قطع اس کے مشابہ ہے جو جنگلی، وحشی، نامہذب قومیں اب تک پہنتی
ہیں"[3]

جس سے محکوم معاشرت پر گہرے اور دیر پا سماجی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور ان اثرات کی وجہ سے سماجی شیرازہ بکھر جاتا ہے اور یہ امتیازی سلوک مقامی برادریوں کی نقل مکانی کی وجہ بنتی ہے جس کے نتیجے میں نفرت و بغاوت کا یہ لاوہ آہستہ آہستہ پکتا رہتا ہے اور بعض حالات میں استعمار کے خلاف مزاحمت کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں تشدد، بے راہ روی اور تنازعات جنم لیتے ہیں اس طرح معاشرہ اور ملک ابتری کا شکار ہو جاتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ رد استعماریت کی تحاریک جنم لیتی ہیں اور یوں آزادی یا خود ارادیت کھل کر سامنے آتی ہے اور یہ مزاحمت اکثر ہمیں باہمی مذاکرات یا مسلح جدوجہد کی شکل میں نظر آتی ہے۔ استعماریت کے حوالے سے بعض ناقدین کا نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ استعماریت نے دنیا کے بہت سے ممالک اور خطوں کی تاریخ، سیاست اور ترقی پر بے پایاں اثرات مرتب کیے ہیں جس کی وجہ سے اس خطے کی قسمت جاگ اٹھتی ہے اگرچہ کچھ لوگ یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ اس نے معاشی اور تکنیکی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے لیکن ان کے رویوں پر عدم مساوات، استحصال اور مقامی ثقافتوں کو دبانے پر ان کے کردار پر کڑی تنقید کی گئی ہے اس لئے رد استعماریت "استعماریت" کے دوران عالمی سطح پر ہونے والے دیر پا اثرات و محرکات کو موضوع بحث بناتی ہے تا کہ ان کا تفصیلا جائزہ لیا جا سکے۔

رد استعماریت کی تاریخی اور سماجی تحریک ہے۔ انگریزی میں "Decolonization" کہتے ہیں جبکہ اسے "ترک نو آبادیات" بھی لکھا جاتا ہے۔ یہ "استعماریت" کا رد عمل ہے۔ اس لئے اسے "رد استعماریت" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ نو آبادیاتی مخالف نظریہ ہے اس سے مراد وہ سیاسی، سماجی اور ثقافتی تحریکیں یا نظریات ہیں جو استعماریت، سامراجیت، اور ایک ملک یا گروہ کسی دوسرے ملک کے استحصال وزیادتی کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس کی جڑیں نو آبادیاتی لوگوں کے خود مختاری، آزادی، اور ان کے اپنے ثقافتی، سماجی اور اقتصادی طریقوں کے تحفظ کے حقوق پر ہیں۔ رد استعماریت کی اہمیت اس کے سابقہ نو آبادیاتی ممالک یا لوگوں

کے لیے انصاف، مساوات اور خودمختاری کے حصول میں مضمر ہے۔ یہ تاریخی ناانصافیوں کو دور کرنے، خودمختاری کی بحالی، اور ان کمیونٹیز کو بااختیار بنانے کی کوشش کرتا ہے جو نوآبادیاتی طاقتوں کے ہاتھوں پسماندہ یا مظلوم ہیں۔ ردِاستعماریت تحریکوں نے جدید جغرافیائی سیاست کی تشکیل اور پوری دنیا میں مقامی آبادی کے حقوق کی وکالت کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ فرانز فینن کو "ردِاستعماریت" کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ فرانز فینن کا تعلق فرانس کے شہر "مارٹنیک" سے تھا وہ ایک ممتاز ماہر نفسیات، فلسفی اور انقلابی شخصیت کے حامل تھے۔ وہ "ردِاستعماریت "(Decolonialism) کی تحریک میں ایک اہم شخصیت تھے اور نوآبادیات کے نفسیاتی اثرات اور وہ آزادی کی جدوجہد کے بارے میں اپنے کاموں کے لیے مشہور ہیں۔ ان کی بااثر کتابیں، جیسے "بلیک سکن، وائٹ ماسک" اور "دی ریچڈ آف دی ارتھ"، نوآبادیات، نسل پرستی اور شناخت کے حوالے سے بہت اہم ہیں۔

ردِاستعماریت استعمار یا سامراجی تسلط کی مخالفت کرتی ہے اس کی جڑیں خودمختاری اور استعماری طاقتوں سے آزادی کی جدوجہد سے جڑی ہوئی ہیں کیونکہ وہ اس نظریے کو رد کرتی ہیں کہ کوئی غیر ملکی طاقت کسی دوسرے ملک کی آزادی میں مداخلت کرے یا دوسری اقوام پر غلبہ پانے یا استحصال کرنے کی کوشش کریں۔ سہیل احمد لکھتے ہیں:

> "ردِنوآبادیاتی تنقید سامراجی قدروں اور نظریات کو ہی نشانہ ہدف نہیں بناتی بلکہ دیگر جمہوری, معاشرتی اور سیاسی نظاموں میں چھپے ہوئے . نوآبادیاتی سامراجی عناصر کو بھی شناخت کر لیتی ہے"[4]

ردِاستعماریت استعمار زدہ کے حقوق کا تحفظ، اس کی سماجی، سیاسی و معاشی اور ثقافتی پہچان کی وکالت کرتی ہے۔ استعماریت نے استعمار زدہ پر یورپی ثقافت، مذہب اور سماجی اصولوں کو مسلط کیا اور ان مقامی لوگوں کو اپنے تابع بنایا کیونکہ استعمار سمجھتا تھا کہ ان پسماندہ معاشروں کو مہذب اور جدید بنانے کے لیے حکمرانہ رویہ درست ہے۔ استعمار نے معاشی ہتھکنڈوں کو بھی آزمایا اور ان کے قدرتی وسائل سے خوب فائدہ اٹھایا۔ ان سے جبری

مشقت لی اور اپنی معیشت کے استحکام کے لیے تجارتی نیٹ ورک قائم کیا۔ رد استعماریت نے مقامی لوگوں کے وسائل کی لوٹ کھسوٹ، انسانی حقوق اور ظالمانہ ہتھکنڈوں کے خلاف مربوط آواز اٹھائی۔ مقامی لوگ حکمرانوں کی غیر مساویانہ تقسیم اور ناانصافیوں سے آگاہ ہوئے۔ جس کی وجہ سے انہوں نے مزاحمت اور خود مختاری کا مطالبہ کر دیا اور اس طرح بیسویں صدی کے آغاز میں استعمار مخالف تحاریک شروع ہوئیں اور انہوں نے آزادی کی جدوجہد شروع کر دی۔ استعمار کے جابرانہ طرز عمل نے یہ مواقع دیے جس سے یہ رویے نمودار ہوئے۔ رد استعماریت سے ابتدائی مزاحمت شروع ہوئی جس نے بغاوتوں، ثقافتی شناختوں اور مقامی روایات کے تحفظ کی شکل اختیار کی اور استعمار کی میراث کو للکارا۔ رد استعماریت نے استعمار کے معاشرے پر دیرپا اثرات کا معاشی، سیاسی، ثقافتی اور تہذیبی حوالے سے جائزہ پیش کیا تاکہ معاشرے کو مزید خلفشار سے بچایا جائے اور یہ مقابلہ عدم تشدد، سفارت کاری اور بین الاقوامی دباؤ کے ذریعے کرنے کی کوشش کی۔ مہاتما گاندھی، قوامی نکرومہ اور دیگر شخصیات نے استعمار کے خلاف اپنے کردار ادا کیا۔

۲۔ نو آبادیات: تصور و تناظر

نو آبادیات کے لیے "استعماریت" کا لفظ مستعمل ہے۔ "استعماریت" کے لفظی معنی "غاصبانہ تسلّط" کے ہیں۔ نو آبادیاتی نظام سے مراد وہ نظام حکومت ہے جہاں طاقتور اقوام کمزور لوگوں، خطوں یا علاقوں پر اپنا تسلط یا غلبہ بڑھاتی ہیں جو کہ اکثر دور دراز جغرافیائی علاقے میں واقع ہوتے ہیں۔ نو آبادیاتی نظام کا بنیادی مقصد نو آبادیاتی علاقوں پر سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی تسلط قائم کرنا اور اسے برقرار رکھنا ہوتا ہے اور یہ غلبہ عام طور پر فوجی طاقت، سیاسی جوڑ توڑ اور نو آبادیاتی علاقوں میں بستیوں کے قیام سے حاصل کیا جاتا ہے۔ ان علاقوں کے مقامی باشندوں کو "استعمار زدہ" کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان علاقوں میں وہ براہ راست اپنا اختیار استعمال کرتی ہیں اس کے لیے انہیں انتظامی ڈھانچے کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے وہ وہاں نو آبادیاتی حکومتیں اور ادارے قائم کرتی ہیں یہ حکومتیں اور ادارے اپنے مفاد کے لیے ان علاقوں کے وسائل کے ساتھ ساتھ مقامی لوگوں سے مشقت بھی لیتے ہیں اور آہستہ آہستہ ان کی معیشت پر غلبہ پالیتی ہیں لیکن مکمل تسلط کے لیے زبان و ادب کے ساتھ ان کی ہزاروں سالہ پرانی ثقافت کو پسماندہ کر دیتی ہیں۔ گویا نو آبادیات سامراج کی ایک مخصوص شکل ہے جہاں

طاقتور اقوام مخصوص خطوں پر اپنا تسلط قائم کرتی ہیں جبکہ سامراج ایک وسیع تصور ہے جس میں طاقت اور اثرورسوخ کو بڑھانے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ استعمار کو سامراجی طاقتوں کی طرف سے اپنی تسلط کے مقاصد کے حصول کے لیے مکمل تعاون درکار ہوتا ہے اس لئے استعمار اور سامراج دونوں نے دنیا پر اہم تاریخی اور دیرپا اثرات مرتب کیے ہیں جس کے نتیجے میں متعلقہ معاشروں میں زبان وادب کے ساتھ ان کی نئی ثقافت کو بھی تشکیل دیا گیا ہے۔ ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:-

"نو آبادیاتی عہد میں محکوم ملکوں کی تاریخ کو مسخ کرنے کے لیے آئیڈیالوجیکل طریقے اختیار کیے گئے مگر ان کا اثر وہی ہوا جو نفسی تشدد کے نتیجے میں کسی شخص کے حافظے پر ہوتا ہے اور وہ واقعات کو الگ الگ دیکھنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے"[5]

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ استعمار کے علمبردار کون ہیں؟ استعمار میں مختلف یورپی طاقتیں شامل تھیں، جن میں سپین، پرتگال، انگلینڈ، فرانس اور ہالینڈ شامل ہیں۔ نوآبادیات کے علمبرداروں میں کرسٹوفر کولمبس، ہرنان کورٹس، اور واسکو ڈی گاما جیسے متلاشی شامل ہیں، جنہوں نے ایج آف ڈسکوری کے دوران یورپی سلطنتوں کی توسیع میں اہم کردار ادا کیا۔

نو آبادیات ایک تاریخی رجحان ہے اور یہ رجحان عام طور پر پندرھویں صدی کے بعد سے یورپی اقوام میں نظر آیا حالانکہ تاریخ میں زمانہ قدیم سے دنیا کے دیگر حصوں میں بھی اسی طرح کی تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ میں دنیا کے کن علاقوں میں استعماری ریاستیں قائم کی گئیں؟ نوآبادیاتی ریاستیں مختلف یورپی طاقتوں نے قائم کیں۔ یہ کالونیاں دنیا کے مختلف خطوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کچھ قابل ذکر ہیں جیسے شمالی امریکہ میں برطانیہ، فرانس اور اسپین کی قائم کردہ کالونیاں ہیں اس کے علاوہ مزید برطانوی شمالی امریکہ میں تیرہ کالونیاں ہیں اسی طرح جنوبی امریکہ میں نیو اسپین، ہسپانویاور پرتگالی برازیل جیسی کالونیاں شامل ہیں اگر افریقہ کی بات کی جائے تو مختلف یورپی طاقتوں نے برطانیہ، فرانس، جرمنی، بیلجیم اور دیگر کے زیر کنٹرول علاقوں کے ساتھ کالونیاں قائم کیں۔ اسی

طرح اگر ایشیا کا تذکرہ کیا جائے تو وہاں یورپی طاقتوں، جیسے برطانیہ، نیدرلینڈز، اور پرتگال نے ہندوستان، جنوب مشرقی ایشیا اور ایسٹ انڈیز جیسے علاقوں میں کالونیاں قائم کیں۔اسی طرح اوشیانا :آسٹریلیا اور بحرالکاہل کے کچھ حصوں کو برطانیہ اور فرانس نے نوآبادیات بنایا تھا۔اور ان نوآبادیاتی ریاستوں نے جدید دنیا کے جغرافیائی سیاسی منظرنامے اور ثقافتی تنوع کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پوری دنیا میں کتنی کالونیاں قائم ہوئیں؟ اگر پوری تاریخ میں قائم ہونے والی کالونیوں کی تعداد کا شمار کیا جائے تو یہ ایک مشکل امر ہے بہرحال اس کی تعداد بہت وسیع ہے۔ یہ وقت اور مدت کے لحاظ سے اور نوآبادیاتی طاقتوں اور متاثرہ علاقوں کے لحاظ، سے نمایاں طور پر مختلف ہوتی ہے۔یورپی طاقتوں، جیسے سپین، پرتگال، انگلینڈ، فرانس، اور نیدرلینڈز نے افریقہ، ایشیا، امریکہ اور اوشیانا میں کالونیاں قائم کیں۔نوآبادیاتی تاریخ کی پیچیدہ اور متحرک نوعیت کی وجہ سے کالونیوں کی کل تعداد کا درست تعین کرنا مشکل ہے۔ ہاں یہ بتانا بھی قدر مشکل ہے کہ پوری دنیا کے کتنے فیصد پر کالونیاں قائم کی گئیں۔کیونکہ نوآبادیاتی تاریخ کی ابھرتی ہوئی فطرت اور مختلف خطوں میں کنٹرول کی مختلف حدوں کی وجہ سے دنیا کی صحیح فیصد کا تعین کرنا مشکل ہے۔تاہم انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں استعمار کے عروج کے دوران، دنیا کا ایک اہم حصہ نوآبادیاتی حکمرانی کے تحت تھا۔ یورپی طاقتوں نے افریقہ، ایشیا، امریکہ اور اوشیانا میں کافی علاقوں کو کنٹرول کیا لیکن یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل تک، یورپی سلطنتوں نے دنیا کی زمینی سطح کے تقریباً 84 فیصد حصے پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن یہ امر قابل غور ہے کہ جہاں استعمار نے بہت سے معاشروں پر منفی اثرات مرتب کیے وہیں ان خطوں کے بنیادی ڈھانچے کی ترقی، مشینی صنعت اور اطلاقی علوم کے شعبہ جات کے علاوہ مختلف نظریات کے پھیلاؤ کے حوالے سے بھی کچھ مثبت اثرات مرتب کئے۔ جس طرح زبان اردو کی ترویج کے لیے مختلف علوم کے تراجم اردو زبان میں کروائے گئے۔۔ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:-

"فورٹ ولیم کالج کے محرکات سیاسی تھے لیکن اس کے ثمرات نے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ادب کو بھی متاثر کیا اور اردو نثر کی ایک موثر تحریک کو جنم دیا

یہی وجہ ہے کہ اردو کا مورخ فورٹ ولیم کالج کو ہمیشہ تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے"[6]

فورٹ ولیم کالج نے اس معاشرے کو جدید علوم سے روشناس کروایا جبکہ وہاں ان علوم کا دور دور تک نام ونشان بھی نہیں تھا لیکن معاشرتی شطح پر ان فوائد کی غیر مساویانہ تقسیم نے مختلف مسائل کو جنم دیا کیونکہ استعمار زدہ کے لیے یہ فوائد زیادہ قیمت پہ آتے تھے جبکہ باقیوں کے لیے تقریبا مفت تھے۔ استعمار کا یہ ورثہ تاریخ عالم اور سیاست کے عصری مباحث میں ابھی بھی زیر بحث ہے۔ "استعمار" ایک پیچیدہ اور متنازع تاریخی رجحان ہے جس کے دنیا پر دور رس نتائج مرتب ہوئے ہیں ہر کسی کا اپنا نقطہ نظر ہے اور وہ ان تجربات اور نظریاتی موقف کو اپنی نظر سے دیکھتا ہے اس لیے استعمار کے بارے میں زاویہ نگاہ وسیع پیمانے پر مختلف ہے اگر سامراجی نقطہ نظر کی پرکھ کی جائے تو استعمار کے حامی استعماریت کی طرف سے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ حکومتیں ان خطوں میں اعلی تہذیب و ثقافت، مشینی صنعت کے ساتھ اطلاقی علوم کے شعبہ جات ان کی ترقی کا پیش خیمہ بنے اور ان کا دعوی ہے کہ نو آبادیاتی طاقتوں نے ان علاقوں میں تعلیم کے ساتھ انتظامی ڈھانچے بھی فراہم کیے جس سے ان کی معاشی ترقی ہوئی اگر اس کے برعکس رد استعماریت نقطہ نظر پر توجہ مرکوز کی جائے تو ان کا کہنا ہے کہ یہ بنیادی طور پر استحصالی اور جابرانہ عمل تھا اور وہ اسے سامراجی طاقتوں کے معاشی، ثقافتی اور سیاسی تسلط کی مضبوطی کی شکل کے طور پر دیکھتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے تسلط کو طول دینے کے لیے اسے ایک ہتھکنڈے کے طور پر استعمال کیا جس سے مقامی لوگوں کا استحصال ہوا۔ مقامی ثقافتوں کی تباہی اور نابودی کی گئی، قدرتی وسائل کو بڑے بے رحمانہ طریقے سے لوٹا گیا۔ مقامی وسائل کو مقامی لوگوں پر ممنوع قرار دے کر بعد میں مہنگا بیچا گیا۔ بعض لوگ جدید دنیا میں استعمار کے ورثہ پر توجہ مرکوز کرتے ہیں اور وہ استدلال کرتے ہیں کہ استعمار نے سابقہ نو آبادیاتی قوموں پر دیرپا نقوش مرتب کیے ہیں جس میں معاشی عدم مساوات، سیاسی عدم استحکام اور سماجی تقسیم اہم ہیں جبکہ مابعد نو آبادیاتی محققین اس بات کا بھی جائزہ لیتے ہیں کہ کس طرح استعمار عالمی طاقتوں کے استکباری رویہ سے ان علاقوں کی ثقافتی شناخت کو تشکیل دیتے ہیں۔ نو آبادیاتی نقطہ نظر کے مخالفین کہتے ہیں

نو آبادیات کے قائم ہونے کے بعد دیکھا گیا ہے کہ اکثر مقامی آبادیوں پر مسلط یورپی اقوام نے اپنی زبانوں کو ترجیح دی جیسے برصغیر میں مقامی زبانوں کے علاوہ سرکاری زبانیں عربی و فارسی کو دیس نکالا دے کر انگریزی اور اردو کا چلن قائم کیا۔ 1835ء میں ہندوستانیوں کی تعلیم و تدریس کے لئے "English Education Act" بنایا گیا اور لارڈ میکالے یہ چاہتا تھا کہ ہندوستانیوں کو انگریزی سیکھائی جائے اور انگریزی ادبیات پڑھائی جائے تاکہ وہ انگریزی نظام اور ہماری تہذیب و ثقافت کو سمجھ سکیں حالانکہ اس زمانے میں انگریز خود اپنے معاشرے میں سائنسی علوم متعارف کروا چکے تھے اور اس کے متعلق تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انگریز اچھی طرح جانتا تھا کہ اس ملک کی ترقی کو کیسے روکا جاسکتا ہے۔ وہ صرف خام مال کی تیاری کے لئے اپنے ملازم پیدا کرنا چاہتا تھا۔ وہ انہیں سائنسی ترقی سے بے بہرہ رکھنا چاہتا تھا۔ بالکل اسی طرح مختلف عقائد کو مسلط کیا گیا اور یہ تبدیلی ثقافتی تنوع کے نقصانات اور مقامی تعلیمی ڈھانچے کی بربادی سے عیاں ہے۔ اگر اقتصادی نقطہ نظر کو مد نظر رکھتے ہوئے بات کی جائے تو ماہرین اقتصادیات اور مورخین استعمار کے معاشی نتائج پر بحث کرتے نظر آتے ہیں کچھ لوگ یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ اس کی وجہ سے نو آبادیاتی علاقوں میں معاشی پسماندگی ہوئی کیونکہ وسائل نو آبادیاتی طاقتوں کے قبضہ میں تھے اور انہوں نے اسے اپنے لیے استعمال کیا اس سے مقامی صنعت کو دھچکا لگا اور مقامی لوگوں کا روزگار چھن گیا۔ ایک موقف یہ بھی ہے کہ "استعمار" نے نئی صنعت و حرفت سے مشینی انقلاب برپا کیا جس کی وجہ سے معاشرے پر طویل مدتی اثرات مرتب ہوئے اور معاشرتی انصاف کے حامی نمائندگان، استعماریت کے دوران ہونے والی تاریخی نا انصافیوں کی تلافی کو معاوضے کی صورت میں ادائیگی پر زور دیتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ استعمار کی وجہ سے ہونے والے نقصانات کو تسلیم کیا جائے اور اس کے جاری اثرات جیسے کہ غربت، عدم مساوات کے تفاوت کو دور کیا جائے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ کسی بھی ملک کی سیاست پر اس کے جغرافیائی حالات کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے اس لیے اس خطے پر غلبہ نو آبادیاتی طاقتوں کے درمیان عالمی طاقت کی جدوجہد کا مظہر تھا یہ نقطہ نظر استعمار کو وسیع تر جغرافیائی، سیاسی تدابیر اور مخاصمت کا حصہ سمجھتے ہیں۔ سر ہمفری گلبرٹ جو کہ ایک برطانوی جاسوس تھے انہوں نے کتاب "ہمفرے کے اعترافات" میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے بارے میں کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ وہ اعتراف کرتے ہیں:

"ایسٹ انڈیا کمپنی بظاہر تجارتی نوعیت کی تھی مگر در حقیقت جاسوسی کاڈاتھااور
اس کے قیام کا مقصد ہندوستان میں ان صورتوں یاراستوں کی تلاش تھی جن
کے ذریعے اس سرزمین پر مکمل طور پر برطانیہ کا اثر و نفوس قائم ہو سکے اور
مشرق وسطی پر اس کی گرفت مضبوط ہو سکے."[7]

سر ہمفری گلبرٹ کے اس اعتراف سے آگاہی ملتی ہے کہ وہ جاسوس ہوں یانہ ہوں۔ انہوں نے اپنی حکومت کو مضبوط کرنے اور اس کے اثر و نفوذ کو باقاعدہ بنانے کے لیے بھرپور کوششیں کیں اور وہ اس خطے میں اکیلے نہیں تھے۔ مختلف شعبہ جات میں ان کی مختلف جماعتیں تھیں جو اپنے اپنے علم و فن میں یکتا تھے اور جو مسلسل روبہ عمل تھے۔ ان کی کارکردگی ہی معنی خیز ہے۔ ان میں چند کے نام تخصص کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں۔ سر ولیم جونز:- محقق اور ماہر فلکیات تھے۔ انہوں نے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی بنیاد 1784ء میں کولکتہ میں رکھی۔ قدیم ہندوستان اور سنسکرت زبان کی تفہیم میں بہت مشہور ہوئے انہوں نے تقابلی لسانیت پر نمایاں کام کیا اور ہندوستانی تاریخ، زبانوں، ثقافت کا مطالعہ، انمول تاریخی دستاویزات اور نمونوں کو جمع کرنے اور محفوظ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔، این بی ہیلڈ:- آکسفورڈ کے پڑھے لکھے، محقق اور برطانوی تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی خدمت میں پیش پیش رہے۔ انہوں نے اصل سنسکرت کے فارسی ورژن سے ہندو قانونی کوڈ کا ترجمہ کیا یہ ترجمہ 1776ء میں کوڈ آف جینسٹولاز کے نام سے شائع ہوا ہے۔ 1778ء میں انہوں نے بنگالی زبان کی گرامر لکھی جسے شائع کرنے کے لیے ہندوستان میں پہلا بنگالی پریس قائم کیا گیا۔ ،ڈاکٹر جان بیرٹ گل کرائسٹ:- وہ بنیادی طور پر ہندوستانی زبان کے مطالعہ کے لیے جانا جاتا ہے، جس کی وجہ سے اسے برطانوی استعمار اور مقامی لوگوں نے شمالی ہندوستان بشمول موجودہ پاکستان کی زبان کے طور پر اپنایا۔ انہوں نے انگریزی-ہندوستانی ڈکشنری، ہندستانی زبان کی گرامر اور مینٹل لسانیات،۔ لغت عربی، عربی رسم الخط، ناگری رسم الخط، اور رومی نقل میں شائع ہوئی اور بہت کچھ مرتب اور تصنیف کیا۔، سر ولیم ولسن ہنٹر:- ان کا تعلق گلاسکو سکاٹ لینڈ سے تھا۔ وہ ایک مورخ، محقق، شماریات دان اور ہندوستان میں سول سروس کے رکن تھے۔ ان کا نام ہندوستان کے ایمپیریل گزٹیئر کے لیے جانا جاتا ہے جو نو جلدوں پر مشتمل 1881ء میں شائع ہوا۔

انہوں نے ہندوستان کی غیر آریائی زبانوں کی ایک تقابلی لغت بھی مرتب کی جسے بولیوں کی لغت کہا جاتا ہے۔
،ڈنکن فوربیس:- وہ سکاٹش مورخ تھے۔ 1970ء میں پیلیکن بوکس نے ڈیوڈ ہیوم کی ہسٹری آف گریٹ برطانیہ کی جلدیں شائع کیں۔ روشن خیال قرار دیا گیا۔،ڈاکٹر ولیم کیری:- وہ ہندوستان میں نو آبادیاتی دور کی ایک مشہور تاریخی شخصیت ہیں۔ وہ ایک برطانوی عیسائی مشنری، ایک عالم اور ماہر لسانیات تھے جنہوں نے ہندوستانی زبانوں میں گہری دلچسپی ظاہر کی۔ لسانیات میں ان کے تعاون اور متعدد ہندوستانی زبانوں میں بائبل کا ترجمہ کرنے پر ان کی کوششوں کو سراہا جاتا ہے۔ انہوں نے برطانوی نو آبادیاتی دور میں ہندوستانی زبانوں کے مطالعہ اور فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔،جان ٹی پلیٹس:- وہ ہندی اور اردو زبانوں پر اپنے کام کے لیے مشہور ہیں۔ وہ ماہر لسانیات، محقق اور لغت نگار تھے اور انہوں نے ان زبانوں کے لیے "اردو، کلاسیکی ہندی اور انگریزی کی ڈکشنری" کے نام سے ایک معروف لغت تصنیف کی۔ ان کے علاوہ اور بھی ہیں جنہوں نے اپنی کاوشیں پیش کیں۔ان زعماء کی ہندوستانی زبانوں کے علم اور اس سے دلچسپی کی وجہ بخوبی سمجھ آتی ہے کہ انہوں نے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے مکمل طور پر اپنے آپ کو کیموفلاج کیا ہوا تھا۔ یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ انہیں ہماری زبانوں سے کوئی سروکار نہیں تھا بلکہ وہ ہماری زبانوں کے ساتھ اثر پذیری چاہتے تھے۔ تاکہ وہ ہمارے وسائل کے ساتھ ہماری زبان ہماری ثقافت ہمارا کلچر اور ہمارے سماج کو اپنی جکڑ بندیوں میں لے سکیں اور وہاں پر اپنی زبان اپنی ثقافت اور اپنے کلچر کو فروغ دے سکے اور یہ کلچر ایسا ہو جو انہیں ان کی پرکھوں کی روایات سے دور کر سکے اور وہ آسانی کے ساتھ ان کے یورپین کلچر کے ساتھ مدغم ہو سکیں اور وہ ہمیشہ کے لیے تذبذب کا شکار رہیں۔ اگر وہ اس طرح کی نفسیاتی کیفیات میں مبتلا ہوں گے تو وہ آسانی کے ساتھ ہمارے مرہون منت رہ سکیں گے۔ انہوں نے اردو مقولہ کے مطابق "ایک پنتھ دو کاج" جیسا کام کیا اس لیے انہوں نے ہندوستانی زبان کے قواعد وضوابط پر ماہرانہ انداز سے کام کیا۔ زبان و ادب کے حوالے سے محسن ٹھہرے کیونکہ ان کا لسانی شعور آج بھی ہماری رگوں میں پیہم ہے۔ ثقافتی آمیزش کے حوالے سے بات کی جائے تو وہ ہمارے مربی تھے ایسے ہی جیسے ایک مقولہ بولا جاتا ہے "گلے کی ہڈی" جو آج تک ہمارے گلے میں پھنسی ہوئی ہے۔ نہ انہوں نے ہمیں اپنے اسلاف کی امانتوں کے آمین ہونے پر قائم رہنے دیا اور نہ ہی ہمیں اپنے

تابناک مستقبل کو دیکھنے کا موقع فراہم کیا۔ آج بھی ہم اس گون مگوں کیفیت میں زندگی گزار رہے ہیں جو ان کی طرف سے ہمیں عنایت ہے۔ انہوں نے بڑی چابک دستی سے ہمارے منہ میں اپنے الفاظ، ہمارے ذہنوں میں اپنی منصوبہ سازی کچھ اس طرح سے پیوست کی ہے کہ جس سے چھٹکارا نا ممکن معلوم ہوتا ہے۔ اگر اس گفتگو کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مستشرقین کے متون آج بھی بنیادی ماخذ ہیں۔ دیگر اقوام کی ہندوستانی زبانوں میں دلچسپی کی وجہ بخوبی سمجھ آتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ لوگ جاسوس نہیں تھے مگر ان کے مقاصد برطانیہ کے مکمل مسلط کے لیے تھے۔ ان کے مقاصد میں مقامی زبان کا علم، مقامی ذہن، مقامی طریقہ ابلاغ تک رسائی تھی۔ ہندوستانی زبانوں کے قواعد اور لغات پر ماہرانہ دسترس حاصل کرنا چاہتے تھے اور وہ دوستی کی آڑ میں اپنی نیت کو چھپانے میں کامیاب رہے۔

سنسکرت زبان کی دریافت کے حوالے سے استعمار کا دعوی ہے کہ یہ ایک یورپی کارنامہ ہے انہوں نے اس کے دریافت کو عظیم خدمت کے طور پر پیش کیا اور ہندوستانی ادب کی خدمت قرار دیا۔ اس کی رفعت اور عظمت کے قلابے ملاتے ہوئے اس سے انسانی ذہن کے کمالات اور بے بہا سرمایہ قرار دیا ہے تاکہ استعمار زدہ ان کے اس کلامیے کے جھانسے میں آجائیں اور ان کی علمی دیانت داری کے قائل ہو جائیں وہ اپنے اس کلامیوں کو باقاعدہ عملی شکل دیتے ہوئے اس کی مزید تحقیق کے لیے تعلیمی و تحقیقی ادارے قائم کرتی ہیں جس میں سنسکرت، عربی اور فارسی کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے اور وہ ان مطالعات کو بڑی خصوصیت سے پیش کرتے ہوئے ان کی تشہیر کی جاتی ہے اور ان کے نتائج کو اس طریقے سے مشتہر کیا جاتا ہے کہ یہ زبانیں گراں مایہ عظمت و توقیر کی حامل ہیں۔ ان تمام منابع کے معبر بنتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان زبانوں کی عظمت کے باوجود عصر حاضر کی ثقافت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے یہ متون ماضی میں معرض وجود میں آئے اور انہوں نے اپنے دور میں خوب شہرت کمائی اور وہ اپنے وقتوں میں موثر بھی ہوں گے لیکن جبکہ اب یہ ماضی بعید کا حصہ ہیں۔ عصر حاضر سے ان کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ استعمار نے ہمیشہ یہی تگ و دو کی ہے کہ وہ جو کچھ کہے استعمار زدہ اسے سچ قبول کرتے ہوئے عمل پیرا ہو۔ استعمار نے ہمیشہ اپنی چالوں کو چھپایا ہے لیکن اس نے ظاہری حلیہ قابل تقلید بنایا۔ اس لیے اس کے کارنامے میں بڑے بڑے کارنامے ہیں جیسے بنیادی مذہبی اور تاریخی متون کے مطالعہ کے بعد

اس کے کمزور پہلوؤں کو اجاگر کر کے اختلافات کو ہوا دینا، مختلف ممالک کے ثقافتی اور تاریخی متون کے ایسے پہلو تراشنا جس سے نفرت پیدا ہو تفرقے کو جنم دینا، نسلی، لسانی اور قبائلی رنگا رنگی کو تعصب و نفرت کی عینک پہنا کر دشمنی میں بدلنا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کو اس انداز سے پیش کرنا کہ شک کا گمان تک نہ ہونے پائے۔ استعمار کی شاطرانہ چالیں ہمیشہ کامیاب رہیں بلکہ ان کی توقع سے زیادہ پذیرائی پائی لیکن اس نے بھی اپنی طرح نہ بدلی ہمیشہ متضاد عناصر کو اپنی توجہ کا مرکز بنا کر خلفشار پیدا کرنے کی کوشش۔ انہوں نے استعمارزادہ کو اپنا مقلد بنایا ہوا تھا اس کے بارے میں جان لاک وڈ کپنگ کہتے ہیں:

"The most vague an incorrect statement are accepted and repeated without thought, a habit common to all populations, but more family rooted in India than elsewhere. First hand observation and accurate statement affect seem almost impossible to the Oriental, and education has not hithertor availed to help him. In the West public instruction becomes more real and vital year by year but in the East, it is still bound hand and food to the corpse of the Dead literature"

"ترجمہ: ہندوستانیوں کی حالت یہ ہے کہ وہ انتہائی مبہم اور غلط بیانات کو بلا تامل قبول کر لیتے اور دہراتے رہتے ہیں۔ اگرچہ یہ عادت تمام لوگوں کی ہے، مگر جس شدت سے ہندوستان میں ہے، اور کہیں نہیں، حقیقت کا براہ راست مشاہدہ اور اس کا ٹھیک ٹھیک بیان، مشرقیوں کے لیے قریب قریب ناممکن ہے۔ مغرب میں تعلیمات عامہ سال بہ سال مزید پختہ اور قوی ہوتی جاتی ہیں، جبکہ مشرق میں یہ تاحال مردہ ادب کی لاش سے پوری طرح بندھی ہیں"[8]

حقوق انسانی کے علمبر دار نو آبادیاتی ادوار میں استعمار کی چیر ادستیوں کو اجاگر کرتے ہیں ان میں جبری مشقت، استعمارزادہ کے خلاف تشدد اور ان کے حقوق کی پامالی جیسے سنگین جرائم ہیں اور اس کے نتیجے میں قوم پرستی کی شدت میں اضافہ ہوا ہے۔ قوم پرستوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس لیے نو آبادیات کے رد عمل کے طور پر قوم پرست تحریک اُبھری اور انہوں نے قومی آزادی کے لیے کوششیں شروع کیں۔ قوم پرستوں نے اکثر سیاسی اور مسلح جدوجہد کے ذریعے اپنے لوگوں کے لیے حق خود مختاری دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ناقدین اپنے تائیں کوششیں کر رہے ہیں کہ استعمار کی دوسری شکلیں جیسے کہ نسل پرستی، جنس پرستی اور ماحولیاتی انحطاط کو واضح کیا جائے اور کس طرح استعماریت نے پسماندہ گروہوں کے تجربات کو تشکیل دیا ہے اور کس طرح "استعمار" کی حیلہ گری عالمی سیاست، معیشت اور ثقافت پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے اور اس کے اثرات و مضمرات کے بارے میں تنقیدی و تحقیقی مطالعہ جاری ہے تا کہ اس کی کارگردگی کو من و عن سامنے لایا جاسکے۔ جو کہ اب بھی مسلسل علمی اور سماجی دلچسپی کا موضوع بنا ہوا ہے۔ استعمار پر کئی تھیورسٹ لکھ چکے ہیں۔ لیکن ان میں سے کچھ قابل ذکر شخصیات ہیں جیسے فرانٹز فینون، ایڈورڈ سید، البرٹ میمی، اور نگگو وا تھیونگ شامل ہیں۔ ان مفکرین نے نو آبادیات کے سماجی، ثقافتی اور نفسیاتی جہتوں کو دریافت کیا ہے، جس سے نو آبادیات اور نو آبادیاتی معاشروں دونوں پر اس کے اثرات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:-

> "کلونیل ازم ایک نیا ڈرامہ تھا جس کا سکرپٹ یورپ نے لکھا اور جسے کھیلنے کے لیے ایشیا اور افریقہ کی سرزمینوں کو منتخب کیا گیا ڈرامے کے مرکزی کردار یورپی تھے تاہم کچھ معاونین اور ضمنی کردار ایشیائی و افریقی تھے"[9]

استعماریت نے مقامی لوگوں کو زبردستی ان کی آبائی زمینوں سے بے دخل کر دیا تھا اس نقل مکانی کے نتیجے میں اکثر مقامی برادریاں منتشر ہو گئیں۔ اس جبری نقل مکانی کرنے والوں کو اپنی ثقافتی شناخت، زمین اور حق خود ارادیت کے نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے اپنی آبائی زمینوں اور گھروں سے جبری بے دخلی کے بعد اپنی سالوں پرانی شناخت کھو دی اور وہ شہر شہر، قریہ قریہ سرگرداں رہے. وہ مقامی لوگ جو بے دخل کیے گئے یا

اپنی مرضی سے تارکین وطن ہوئے انہوں نے استعمار کے تناظر میں اہم کردار ادا کیا لیکن ان کے تجربات، حالات اور محرکات مختلف تھے۔ استعماریت جس میں یورپی اقوام کے علاوہ بھی غیر ملکی نمائندے مختلف حصوں سے فوج میں شامل تھے انہوں نے استعمار اور استعمار زدہ دونوں پر گہرے سماجی، اقتصادی اور سیاسی اثرات مرتب کیے یہ دونوں کئی طریقوں سے فعالیت کے حوالے سے مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ استعمار نے خاص طور پر امریکہ، افریقہ اور ایشیا میں اپنی وابستگی والے لوگوں کو بھرتی کیا اور دوسرے خطوں سے لوگوں کو غلام بنا کر ان کی نگرانی میں جبری مشقت لیتے رہے۔ ان تارکین وطن کو سخت حالات اور استحصال کا نشانہ بنایا گیا انہیں باغات، کانوں اور دیگر محنت طلب صنعتوں میں کام کرنے پر مجبور کیا گیا لیکن کچھ خانداں جن کا تعلق یورپی ایشیائی اور افریقی ممالک سے تھا انہوں نے حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے اور معاشی تنگی سے بچنے کے لیے۔ رضاکارانا طور پر نو آبادیاتی علاقوں میں ہجرت کی اور وہ ان بستیوں میں آکر آباد ہو گئے ۔ مختلف خطوں کے تارکین وطن اپنے ساتھ اپنی زبانیں، مذہب اور روایات لے کر آئے جس سے مقامی ثقافتوں کے ساتھ ملاپ ہوا۔ اور اس طرح "استعمار" مقامی آبادیوں اور تارکین وطن کے درمیان مختلف تہذیبی شناختوں کے باہمی تعاملات سے نئی ثقافت تشکیل پائی۔ اس ثقافتی تبادلے سے معاشرے پر دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ بے دخل کیے گئے تارکین وطن استعمار کے خلاف مزاحمتی تحریکوں میں پیش پیش تھے۔ وہ اکثر مقامی برادریوں کے ساتھ مل کر جبر کے خلاف مزاحمت کرتے اور اپنے حقوق کی آواز اٹھاتے۔ دنیائے عالم میں اس کی بے چمار مثالیں موجود ہیں ان میں قابل ذکر مثال امریکہ کی مارون کمیونٹی ہے۔ مارون کی اصطلاح ہسپانوی لفظ "Crimarron" سے نکلی ہے جس کا معنی "جنگلی" یا "بے داغ" کے ہیں۔ مارون کمیونٹیز کی تاریخ اپنے اندر دلچسپ پہلو اور غلامی سے بچنے کے لیے کوششوں پر منتج ہے۔ مارون کمیونٹی امریکہ کے غلام افریقیوں کی اولاد پر مشتمل گروہ ہے جنہوں نے امریکی جزیرے سے فرار ہو کر آزاد برادریاں تشکیل دیں۔ ایسی کمیونٹیز نا قابل رسائی علاقوں جیسے گھنے جنگلوں، پہاڑوں یا دلدلی زمینوں میں رہائش پذیر ہوتے تھے جہاں وہ حکام کی گرفت سے بچ سکتے تھے اور انہوں نے غلامی کے خلاف مزاحمت اور آزادی کی جدوجہد میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے اپنی کمیونٹی کے

لیے منفرد ثقافتوں، زبانوں اور سماجی ڈھانچے کو تیار کیا اور مقامی پسماندہ کمیونٹیز کو ساتھ ملایا ان میں قابل ذکر کولمبیا کی مارون کمیونٹی "پیلنک" برازیل کی مارون کمیونٹی "کولومبس" اور جمیکا کی مارون کمیونٹی ہے۔

جنوبی ایشیا میں بھی آزادی کی جدوجہد میں اسی طرح آزادی پسندوں کی بھرپور تاریخ ہے جنہوں نے استعمار سے آزادی کی جدوجہد میں اہم کردار ادا کیا۔ ان میں بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا، میانمار اور دوسرے ممالک کے زعماء شامل ہیں۔ انہوں نے حق خودارادیت، حقوق انسانی اور استعمار سے آزادی کے لیے جدوجہد کی اور ابھی تک ان کی کاوشوں کو اس خطے کی تاریخ میں یاد کیا جاتا ہے۔ مسٹر ہمفرے اٹھارویں صدی کے آغاز میں ایک برطانوی جاسوس تھے انہوں نے اپنی زندگی میں مختلف مذاہب کا علم سیکھا اور مختلف زبانوں پر عبور حاصل کیا خاص طور پر مسلمانوں کی شباہت اختیار کی۔ وہ اپنی یادداشتوں میں اعتراف کرتے ہیں:

> "میں خوشی خوشی بحری جہازوں کے ذریعے استنبول روانہ ہوا میرے ذمے اب دو اہم کام تھے پہلے ترکی زبان پر عبور حاصل کرنا جو ان دنوں وہاں کی قومی زبان تھی۔۔۔ اس کے بعد مجھے عربی زبان، قران، اس کی تفسیر اور پھر فارسی سیکھنا تھی۔۔۔ مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ میں ان زبانوں میں ایسی مہارت حاصل کروں کہ مجھ میں اور وہاں کے لوگوں میں زبان کے اعتبار سے کوئی فرق محسوس نہ ہو۔۔۔ میں اس بات پر مجبور تھا کہ ان غیر ملکی زبانوں کو اس طرح سیکھوں کہ ان کے قواعد و رموز کا کوئی نقطہ فروگزاشت نہ ہو۔ کوئی میرے ترک، ایرانی یا عرب ہونے پر شک نہ کرے۔"[10]

استعماریت نے اپنے مقبوضہ علاقوں کے انتظام و انصرام کے لیے مختلف حکمت عملیوں کے تحت قوانین بنائے۔ ان کی یہ حکمت عملیاں مختلف نسلی گروہوں کو الگ کرنے سے لے کر بعض برادریوں کی نقل و حرکت اور ان کے حقوق کو محدود کرنے تک تھیں کیونکہ اس وقت امتیازی سلوک عام تھا لیکن استعمار اکثر اپنے مقامی لوگوں کی حمایت کرتا تھا کیونکہ وہ لوگ اسی کے لیے کام کرتے تھے۔ مہاجر طبقے نے استعمار کے تناظر میں پیچیدہ کردار ادا کیا جو نوآبادیاتی حکمرانی کے ظالمانہ پہلوؤں، افراد اور برادریوں کے موافقت کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان

کے تجربات نے نو آبادیاتی علاقوں کی سماجی، ثقافتی اور سیاسی منظر نامے کو تشکیل دیا اور وہ آج تک پرانے نو آبادیاتی معاشروں پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے تجربات، ان کے حالات، محرکات اور مخصوص تاریخی تناظرات کی بنیاد پر بہت مختلف تھے۔ جس میں انہوں نے خود کو پایا۔ مہاجر طبقہ نے معاشی وجوہات کی بنا پر ہجرت اختیار کی۔ انہوں نے اپنے آبائی ممالک میں غربت یا معاشی مشکلات سے بچنے کے لیے نو آبادیاتی علاقوں کا رخ اختیار کیا اور بہتر معاشی مواقع کی تلاش کی۔ کچھ جلاوطن سیاسی یا مذہبی لوگ ظلم و ستم کی وجہ سے اپنے وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ انہوں نے نو آبادیاتی علاقوں میں پناہ لی جہاں انہیں جبر سے آزادی ملنے کی امید تھی۔ کچھ لوگ تجسس کے احساس سے نو آبادیاتی علاقوں میں ہجرت کر گئے وہ اکثر نئی زمینوں اور ثقافتوں کی تلاش کے امکان سے حوصلہ افزا تھے۔ مہاجرین نو آبادیاتی معاشرے میں کامیابی کے ساتھ شامل ہو گئے۔ نو آبادیات کے رسم و رواج، زبان اور طرز زندگی کو بڑھاتے ہوئے انہوں نے اکثر نو آبادیاتی انتظامیہ، تجارت اور ثقافت میں اہم کردار ادا کیا اور کچھ نے نو آبادیات اور مقامی آبادیوں کے درمیان ثقافتی تبادلے میں حصہ لیا یہ تبادلہ ثقافتوں کی آمیزش اور منفرد ثقافت کا پیش خیمہ بنا مہاجر طبقہ خاص طور پر نچلے سماجی طبقے سے تعلق رکھنے والے تھے اکثر نو آبادیاتی معاشروں میں امتیازی سلوک اور استحصال کا سامنا کرتے وہ مزدوروں کے استحصال کا شکار ہوتے یا سماجی طور پر پسماندہ ہوتے۔

سیاسی مہاجروں نے نو آبادیاتی مخالف تحریکوں میں اکثر اہم کردار ادا کیا انہوں نے اپنے آبائی ملک کی نو آبادیاتی حکمرانوں کے خلاف مزاحمت کی منصوبہ بندی اور اپنے آپ کو منظم کرنے کے لیے نو آبادیاتی علاقوں کو محفوظ پناہ گاہوں کے طور پر استعمال کیا اور انہوں نے نو آبادیاتی انضمام کی کوششوں کے مقابلے میں اپنی ثقافتوں، زبانوں کے تحفظ اور فروغ کے لیے کافی کام کیا۔ انہوں نے نو آبادیاتی علاقوں کے اپنے ثقافتی ورثے کی حفاظت کے لیے اقدامات کیے۔ جلاوطنوں کو نئے ماحول سے ہم آہنگ ہونے اور اپنے وطن کے ساتھ روابط برقرار رکھنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں اکثر مقامی آبادیوں یا دیگر ہمدرد جلاوطنوں کی خیر سگالی پر انحصار کرنا پڑا۔ تارکین وطن جفاکش اور مزدور لوگ تھے اور انہوں نے اکثر مزدوری کا ایک ذریعہ فراہم کیا جو نو آبادیاتی معیشتوں کی کامیابی کے لیے ایک اہم عنصر تھا۔ مہاجرین کی موجودگی نے نو آبادیاتی معاشروں کے

اندر ثقافتی تنوع میں اہم کردار ادا کیا یہ تنوع بعض اوقات استعمار کے لئے مزاحمت پیدا کر کے مقامی ثقافت کو متاثر کر سکتا تھا اس لیے انہوں نے نو آبادیاتی حکمرانوں کے خلاف مزاحمتی تحریکوں میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ ردا استعماریت کی جدوجہد کے لیے علم، قیادت اور مقصد کا احساس لے کر آئے۔ نو آبادیات کے دوران مہاجرین کے تجربات کثیر الجہتی تھے جبکہ کچھ کو اقتصادی ترقی اور ثقافتی تبادلے کے مواقع ملے اور کچھ کو امتیازی سلوک اور استحصال کا سامنا کرنا پڑا۔ مہاجرین نے خاص طور پر سیاسی مزاحمت اور ثقافتی تحفظ دونوں میں اہم کردار ادا کیا ان کے اجتماعی تجربات اور شراکت نے دنیا کے مختلف خطوں میں استعمار کی تاریخ اور میراث پر دیرپا اثرات چھوڑے۔

استعماریت کی تشکیل جدید کے حوالے سے انیسویں اور بیسویں صدی اہم تھی۔ حالات زمانہ نے کروٹ بدلی اور ہر چیز بدل کر رکھ دی اس لیے یہ استعمار کی مجبوری بن گئی اور انہیں اپنے انتظامی ڈھانچوں میں تبدیلی کرنا پڑی۔ وہ صدی نظاموں کی تبدیلی کی صدی ٹھہری کیونکہ یورپی استعماری طاقتوں نے بدلتے ہوئے معاشی، سیاسی اور سماجی حالات کے مطابق اپنے آپ کو تبدیل کیا۔ اس عمل میں اپنی نو آبادیاتی سلطنتوں کو برقرار رکھنے اور بڑھانے کے لیے نئی مشینی صنعت و حرفت اور اطلاقی علوم کا شعبہ، اقتصادی ڈھانچہ اور انتظامی طریقہ کار کو بہتر کیا۔ استعمار نے تیزی سے مقبوضہ علاقوں سے دولت اور وسائل نکالنے کی کوشش کی تاکہ ان کی اپنی صنعت کاری اور معاشی ترقی کی رفتار کے ساتھ معاشی نمو برقرار رہے جس میں باغات کا قیام، کان کنی کے کام اور قدرتی وسائل جیسے ربڑ، معدنیات اور زرعی مصنوعات سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور اپنی معیشت کو پروان چڑھایا۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومتی عملداری اور اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے انتظامی ڈھانچے کو مزید موثر بنایا گیا اور انتظامیہ کی سہولت کے لیے سرمایہ کاری کی گئی اس میں ریلوے، سڑکیں، بندرگاہیں اور ٹیلی کمیونیکیشن نیٹ ورک کی تعمیر شامل تھی اور پھر استعماری انتظامیہ نے زیادہ موثر اور کفایت شعاری کے حوالے سے دور رس تبدیلیاں کی گئیں اور ساتھ ہی افسر شاہی کے نظام کی تنظیم نو کی گئی۔ بعض اوقات مقامی اشرافیہ کو ان علاقوں پر حکومت کرنے میں مدد کے لیے منتخب کیا جاتا کیونکہ ان کا مقصد تھا کہ نو آبادیاتی علاقوں میں بدیسی منتظمین کم سے کم رکھے جائیں اور افسر شاہی کی معاونت سے تسلط برقرار رکھا جائے۔ کچھ نو آبادیاتی طاقتوں نے

اپنی زبانوں اور ثقافت کو فروغ دینے کے لیے تعلیمی نظام متعارف کروایا اور مشنریوں، نو آبادیاتی عہدے داروں نے اکثر اس عمل میں اپنا کردار ادا کیا۔ مقامی آبادیوں کو یورپی طرز زندگی میں ضم کرنے کی کوشش کی گئی اور اسے مثالی زندگی قرار دے کر اس کو اپنانے کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کیے گئے۔ اس کے علاوہ نقل و حمل اور مواصلاتی صنعت میں سرمایہ کاری کی اور اسے ترقی دی جیسے کہ ٹیلی گراف، سٹیم سے چلنے والا جہاز اور ریلوے جیسے ذرائع بنائے اور پھر ان ذرائع نے استعمار کے لیے وسیع علاقوں پر تسلط اور اقتصادی سرگرمیوں کو مربوط کرنے میں آسانی پیدا کی۔ ان مواصلات اور ذرائع آمدورفت نے نو آبادیوں کو عالمی اقتصادی نظام سے مربوط کیا ہوا تھا جو نو آبادیاتی ممالک سے خام مال اور تیار کردہ سامان کے خریدار بن جاتے تھے اور اس معاشی انحصار نے نو آبادیاتی تعلقات کو مزید پختہ کیا۔ استعمار نے اپنی پرانی روش کو برقرار رکھتے ہوئے نو آبادیاتی نظام کی جدید کاری میں نو آبادیوں کے اندر سماجی درجہ بندی کو تقویت دی اور مقامی آبادیوں کو اکثر پسماندہ رکھا اور انہیں امتیازی قوانین سے نشانہ بنایا جاتا رہا۔ جیسے جیسے استعماری طاقتوں نے اپنے نظام کو جدید بنایا ویسے ویسے انہیں بڑھتی ہوئی قوم پرست تحریکوں اور مقامی آبادیوں کی مزاحمت کا بھی سامنا کرنا پڑا اور اس مزاحمت کی مختلف صورتیں تھیں۔ کہیں پر امن احتجاج تو کہیں مسلح بغاوت جاری تھی۔ نو آبادیات کی جدید کاری کے مختلف، پیچیدہ اور متنوع اثرات مرتب ہوئے جبکہ کچھ نو آبادیوں نے معاشی ترقی اور بنیادی ڈھانچے میں بہتری کا تجربہ کیا اور انہیں مقامی حقوق کے ساتھ اپنی حکومت آپ چلانے کا اختیار دیا۔ نو آبادیات کی وراثت آج بھی بہت سے خطوں اور قوموں میں متشکل ہے جس میں معاشروں، معیشتوں اور ثقافتوں پر اس دور کے دیرپا اثرات پائے جاتے ہیں۔

۳۔ مابعد نو آبادیات: ارتقائی تصور و مفہوم

مابعد نو آبادیات جدید فکر کا ایک نیا انداز ہے جو استعمار اور استعمارزدہ کے سماجی، ثقافتی، سیاسی اور اقتصادی تعاملات کا مطالعہ کرتا ہے اور یہ باہمی روابط استعماریت کے بعد وقوع پذیر ہوئے۔ مابعد نو آبادیات مطالعات دراصل استعمار کے میلانات کی وضاحت بڑی عمدگی سے کرتی ہے۔ استعمار معاشرتی سطح پر اپنے فائدے کے لیے جو تبدیلیاں لایا وہ اسے شاندار قرار دیتا تھا جبکہ وہ تبدیلیاں سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی

میدانوں میں مزید استعماریت کی مضبوطی کا سبب بنیں۔ استعمار کی جدت طرازیاں درحقیقت اپنے ہی فائدے کے لیے تھیں اور وہ اسے اپنے لیے ہی ترتیب دے رہا تھا وہ اپنے انتظامی ڈھانچے کو مضبوط کرنے مقامی آبادیوں پر مکمل تسلط قائم کرنے کے لیے ہر ممکن اقدامات کا سہارا لے رہا تھا ان کے ساتھ وہ اس محکوم طبقے کی ذہن سازی بھی کر رہا تھا تاکہ اس کی حکومت کو دوام رہے۔ مابعد نو آبادیات کی جدید تھیوری نو آبادیاتی نظام اور اس عہد کے فکری و عملی اثرات کے بارے میں آگہی دیتی ہے۔ ممتاز مصنفین جنہوں نے مابعد نو آبادیاتی نظریہ میں حصہ ڈالا ہے ان میں ایڈورڈ سید، گایتری چکرورتی سپیواک، ہومی کے بھابھا، چنوا اچیبی، اور نگگو وا تھیونگ شامل ہیں۔ ان کے کام نو آبادیات کے بعد کی دنیا میں طاقت کی حرکیات، ثقافتی شناخت، اور نو آبادیاتی تاریخ کی میراث کی جانچ میں مصروف عمل ہیں۔

مابعد نو آبادیات ایک نظریاتی ڈھانچہ اور بین الکلیاتی علمی مطالعہ ہے جو جنگ عظیم دوئم کی تباہ کاریوں کے بعد منصہ شہود پر نمودار ہوا۔ یہ علم اپنے اندر اتنی گہرائی لیے ہوئے ہے کہ اس کا اندازہ کچھ یوں کیا جا سکتا ہے کہ مابعد نو آبادیاتی نظام ادب ہو یا تاریخ، سماجیات ہو یا بشریات، ثقافتی علوم ہوں یا لسانیاتی معلومات سب اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے یعنی استعماریت کے تسلط شدہ علاقوں پر استعمار اور سامراج کے ثقافتی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی اثرات کے علاوہ دنیا میں استعماریت کے جاری اثرات کو سمجھنے، پرکھنے اور تجزیہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مابعد نو آبادیات کے بنیادی ارتقائی تصورات کا جائزہ لیا جائے تو وہ مختلف نظریات کی وضاحت کرتی ہے جیسا کہ نو آبادیاتی عمل جو مختلف خطوں پر تسلط، نئی بستیوں کا قیام، مقامی آبادیوں کو محکوم بنانا اور معاشی، سیاسی، ثقافتی سطح پر استحصال کرنا شامل ہے۔

انس (C.L.INNES) لکھتے ہیں:

> " ...Ackoledge to the importance of power relations in that cultural exchange the degree to which the colonizer imposes a language, a culture and a set of attitudes, and the degree to which the colonized

people are able to resist, adapt to or subvert that imposition"

"ترجمہ:...اس ثقافتی تبادلے میں طاقت کے تعلقات کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں جس حد تک نو آبادکار ایک زبان، ایک ثقافت اور رویوں کا ایک مجموعہ، اور اس حد تک کہ نو آبادیاتی لوگ اس مسلط کی مزاحمت، موافقت یا اس کو ختم کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔"[11]

سی ایل انس کہتے ہیں کہ مابعد نو آبادیات ثقافتی تبادلے میں طاقت کے رشتوں کی اہمیت اس حد تک تسلیم کرتی ہے, جس حد تک استعمار اپنی زبان و ثقافت کو مسلط کر نہیں لیتا اور جب تک استعمار زدہ اس تسلط کے خلاف مزاحمت کرنے یا قبول کرنے کے قابل ہوتے ہیں. اس طرح سامراجیت بھی ایک بین الاقوامی تسلط ہے جو کہ طاقتور اقوام کمزور قوموں یا خطوں پر روا رکھے ہوئے ہے۔ اس جبر واستبداد کی کیفیات میں رد استعمار کا تصور بھی ہے جس میں محکوم قومیں استعمار سے سیاسی آزادی حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور اپنی خود مختاری پر زور دیتی ہیں۔ یہ عمل مختلف تحریکوں، مذاکرات اور انتھک محنت کے بعد مکمل ہوتا ہے۔ مابعد نو آبادیاتی نظام ان تصورات و مفاہیم کا بھی جائزہ لیتا ہے جو استعمار نے اپنے تسلط کی خاطر ان علاقوں میں عملی طور پر پیش کیے جیسے "دوغلا پن" اپنی ثقافت کے نفوس کے لیے مقامی ثقافت کو گھٹیا، کمزور قرار دلوایا گیا۔ اپنی تعلیمی پالیسی کو مسلط کرنے کے لیے پنجاب کی لازمی تعلیم کو پس انداز کیا گیا تاکہ استعمار زدہ تعلیمی میدان میں بھی انہی کے مرہون منت رہیں یعنی انہوں نے درجہ بندی اور دقیہ نوسی تصورات کو تقویت دی اور اس عمل کی غیر محسوس انداز سے پیوندکاری کی گئی جس کے نتیجے میں نئی تہذیبی و علمی، فکری و ادبی روشیں پیدا ہوئیں۔ جنہیں استعمار نے ابلاغ عامہ کے طور پر نشر کیا اور تعلیمی و ادبی انجمنوں اور کتب کے ذریعے مروج کیا۔ جس سے ثقافتوں اور شناختوں کا اختلاط ہوا۔ متعین شدہ ثقافتی شناخت کا تصور ابھرا۔ مابعد نو آبادیات نے ان معاشرتی ثقافتی تعاملات کی پیچیدیوں کو نمایاں کیا۔Eurocentism اس کی اہم دلیل ہے۔ یہ ایک عالمی نظریہ ہے جو یورپ اور یورپی ثقافت کو تاریخی، سیاسی اور ثقافتی بیانیے کے مرکز میں رکھتا ہے، اکثر دوسرے

خطوں اور ثقافتوں کے تناظر کو پسماندہ یا نظر انداز کر دیتا ہے۔یہ تعصب کی ایک شکل ہے جہاں یورپی کامیابیوں اور تجربات کو کامل معیار سمجھا جاتا ہے اوراس کو مد نظر رکھ کر دوسرے معاشروں کے خلاف فیصلہ کیا جاتا ہے۔مابعد نو آبادیات اس تعصب پر تنقید کرتی ہے۔ یورپ نے کئی سیاسی ،معاشی، معاشرتی اور ثقافتی مقاصد حاصل کیے جس کے نتیجے میں کئی روشیں پیدا ہوئیں اگرچہ نو آبادیات کا خاتمہ ہو چکا لیکن اب بھی وہ کسی نہ کسی طرح اپنی شکل میں موجود ہے اور اس کے مابعد اثرات اب تک مختلف صورتوں میں متشکل ہیں۔مابعد نو آبادیات تھیوری استعمار اور استعمارزدہ کے درمیان رشتوں کا تجزیہ کرتی ہے جس میں استعمار کو برتری حاصل ہے۔استعمار جبر واستبداد اور استحصالی قوتوں کو بروئے کار لا کر اپنے مشن میں کامیاب رہتا ہے۔ مابعد نو آبادیاتی مطالعہ دراصل نو آبادیاتی ثقافت کی تشریح نہیں بلکہ یہ اس کی تعبیر ہے۔مابعد نو آبادیاتی نظریہ کے ممتاز مفکرین اور مصنفین میں ایڈورڈ سعید:- وہ ایک فلسطی نزاد امریکی ادبی تھوریسٹ اور ثقافتی نقاد تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب "اورینٹیلزم" میں مغربی طاقت کی حرکیات ،تعصبات اور دقیانوسی تصورات پر روشنی ڈالی۔اور یہ 1978ء میں شائع ہوئی۔ان کی دوسری کتاب "کلچر اینڈ امپیریل ازم" ہے جن میں انہوں نے مابعد نو آبادیاتی مطالعات، ثقافتی مطالعات کے تناظر میں سامراجی نظریات کو چیلنج کیا ہے اور ان میں مغربی مفادات کو آشکار کیا ہے۔، فرانز فینن:- وہ ماہر نفسیات، محقق اور فرانسیسی فلسفی تھے۔انہوں نے اپنی تحریروں میں نو آبادیات کے نفسیاتی اور سماجی اثرات اور رد استعمار کی جدوجہد کو مرکوز کیا ہے۔ان کے بااثر کاموں میں ان کی کتابیں "بلیک سکن,وائٹ ماسک" اور "رچرڈ آف دی ارتھ" بہت مشہور ہوئیں۔اپنی تحریروں میں انہوں نے استعمار کے جبر اور اس کے اثرات کے طریقوں کا تجزیہ کیا ہے کہ انہوں نے استعمارزدہ کو کس طرح احساس کمتری اور بیگانگی کی کیفیات میں مبتلا رکھا اور ساتھ ہی ساتھ استعمار زدہ کی وکالت کرتے ہوئے ان کی شناخت، ثقافت اور حقوق کی بحالی کی جدوجہد میں پیش پیش رہے۔ ان کی تحریریں مابعد نو آبادیاتی مطالعات، تنقیدی نظریہ اور آزادی کی تحریکوں پر اثر انداز ہوئیں۔ ،پروفیسر چنوا اچنیبی:-وہ شاعر مضمون نگار اور ناول نگار تھے ۔ان کا تعلق نائجیریا سے تھا ان کا شمار افریقہ کے ممتاز مصنفین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں نو آبادیاتی نظام اور یورپی اثرات پر تنقیدی نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ افریقی معاشروں پر استعمار کے اثرات اور

ثقافتی تصادم کو کھل کر بیان کیا ہے۔ 1858ء میں شائع ہونے والا ناول ان کی سب سے مشہور تصنیف ہے۔ ان کے علاوہ ہومی بابا، گائتری چکرورتی سسپیواک جیسے محقق شامل ہیں۔ ان کے کاموں نے مابعد نو آبادیاتی نظریے کی ترقی اور مختلف شعبوں میں اس کے اطلاق میں اہم کردار ادا کیا ہے دنیا بھر کے معاشروں اور افراد پر استعمار کے پیچیدہ اور دیرپا اثرات کا جائزہ پیش کیا۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مابعد نو آبادیات سماجی علوم اور انسانیت میں مطالعہ کا ایک اہم اور اُبھرتا ہوا نظریہ ہے۔ مابعد نو آبادیاتی نظام اس بات کا بھی جائزہ لیتا ہے کہ تسلط شدہ معاشرے کس طرح استعمار سے متاثر ہوئے اور کس طرح انہوں نے استعمار سے اپنی شناخت اور آزادی پر زور دینے کی کوشش کی۔ یہ شناخت، نمائندگی اور ثقافتی تعاملات کے مسائل کو بھی دریافت کرتا ہے۔ مابعد نو آبادیات حیاتیات، لمارکسن یا ڈارون کے لحاظ سے کوئی ارتقائی تصور نہیں ہے بلکہ یہ ایک نظریاتی ڈھانچہ اور فکری تحریک ہے جو بیسویں صدی کے وسط میں استعماریت کے کارناموں کے جواب میں اُبھری۔ مابعد نو آبادیات بنیادی طور پر نو آبادیاتی معاشروں پر یورپی استعمار کی سماجی، سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی اثرات اور ان کے بعد ان کی آزادی اور شناخت پر زور دینے کی کوششوں کا جائزہ لیتی ہے۔ مابعد نو آبادیات کا تصور طاقت کے پہلوؤں، مساوات اور ثقافتی سامراج کا جائزہ لیتی ہے جو نو آبادیاتی منصوبے میں شامل تھے۔ مابعد نو آبادیات جن نقوش کا جائزہ پیش کرتی ہے ان میں بیسویں صدی کے دوران دنیا کے کئی حصوں میں نو آبادیاتی حکمرانی سے سیاسی آزادی حاصل کرنے کے عمل کو پیش کرتی ہے کہ انہوں نے کس طرح آزادی حاصل کی اور نو آبادیات میں ثقافتوں کا ملاپ کیسے ہوا۔ مابعد نو آبادیات کا نظریہ کھل کر ان معاملات کو واضح کرتا ہے اور اس کے پیچھے چھپے ہوئے مستشرقیت کے عزائم کو آشکارہ کرتا ہے۔ ایڈورڈ سعید کے ذریعے وضع کردہ اصطلاح "اورینٹیلزم" سے مراد دقیانوسی تصورات اور مشرق کی متعصبانہ نمائندگی کی مغربی تعبیر ہے جس نے نو آبادیاتی غلبے کو جواز بخشا اور برقرار رکھنے کے لیے مدد و معاون رہی۔ "Eurocentrism" جس میں یورپی ثقافت، تاریخ اور اقدار کو مرکزیت حاصل تھی اور جس نے غیر مغربی تناظر کو پسماندہ کرنے میں اپنا کلیدی کردار ادا کیا۔ استعماریت کی طاقت کا نشہ سیاسی، ثقافتی اور اقتصادی نقطہ نظر سے استحصالی رویہ جانچنے کے علاوہ پسماندہ اور مظلوم گروہوں کے تناظر اور تجربات کا جائزہ ہے۔ جنہیں اکثر مرکزی دھارے کی تاریخی اور ادبی داستانوں

میں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ مابعد نو آبادیاتی مطالعہ ایک پیچیدہ اور متنوع شعبہ ہے جس میں مختلف نظریات اور نقطہ ہائے نظر شامل ہیں اور ان کا اطلاق ادب، تاریخ، عمرانیات، بشریات اور سیاسیات سمیت مختلف شعبوں پر کیا گیا ہے اور اس نے عصری عالمی امور پر استعمار کے پائیدار اثرات کو تنقیدی نظر سے جائزہ پیش کیا ہے۔

۴۔ استعماریت اور ردِ استعماریت: مفہوم و معنی کی ارتقا پذیری

استعماریت اور رد استعماریت پیچیدہ تصورات ہیں جنہوں نے بہت سے ممالک اور خطوں کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ استعمار کے معنی نو آبادیات کے ہیں اور اس سے مراد طاقتور اقوام کا گروہ ہے جو کمزور اقوام یا علاقے پر سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی تسلط قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے کا عمل ہے۔ یہ غلبہ اکثر فوجی طاقت، معاشی استحصال اور مقبوضہ خطے پر نو آبادیاتی ثقافت اور اقدار کو مسلط کر کے حاصل کیا جاتا ہے۔ استعمار کی تاریخ طویل ہے اور اس نے صدیوں سے مختلف طریقوں اور شکلوں سے وقوع پذیر ہے۔ پندرویں اور سولویں صدیوں کو "تلاش زمانہ" سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اور اسی دوران استعمار نے شکل اختیار کرنا شروع کی جب یورپی طاقتوں نے افریقہ، ایشیا، امریکہ اور دنیا کے دیگر حصوں میں اپنی بستیاں قائم کیں۔ استعمار کے محرکات میں دولت، تجارت، وسائل کا حصول اور عیسائیت کا پھیلاؤ شامل تھا۔ استعماریت کے مقبوضہ معاشروں پر گہرے اور تباہ کن اثرات مرتب ہوئے اس کی وجہ سے مقامی ثقافتوں کی نقل مکانی، پسماندگی اور قدرتی وسائل کا استحصال ہوا۔ غیر ملکی قوانین اور حکمرانی کا نظام ترتیب دیا گیا بہت سے نو آبادیاتی علاقوں نے اس کے نتیجے میں معاشی، پسماندگی اور سماجی بدحالی کا سامنا کیا۔

استعمار جانتا ہے کہ ہر ثقافتی گروہ کے وجود و بقا اور ترقی و زوال کے پیچیدہ عمل کو اس ثقافت کی بنیادی روایات ور سمیات اور ان کی تعبیرات کنٹرول کر رہی ہوتی ہیں۔ اور سب کچھ ظاہر ہے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے کہ ہر ثقافت کے متون سو فیصدی اغلاط سے مبرا نہیں ہوے کیونکہ تاریخ سازی جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے اس میں انسانی خطا کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ استعمار انہی متضاد اور بے محل اغلاط کو اپنی توجہ کا مرکز بناتا ہے اور پھر ان کی تعبیرات اپنی بساط اور فائدے کے لیے کرتا ہے۔ اس حوالے سے سر ہمفری گلبرٹ کہتے ہیں:

"ہم بادشاہوں اور سنی شیعہ علماء کے افکار اور ان کے میلان طبع سے آشنائی حاصل کرتے ہیں۔ پھر ان مکالمات کو پرکھا جاتا ہے اور ان سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں اور پھر ہم علاقے کے دینی اور سیاسی مسائل میں دخل اندازی کرتے ہیں۔ (یہ) عمل ہمیں اس بات میں بھی مدد دیتا ہے کہ ہم اسلام کے احکام و فرامین سے ایک فرد مسلم کے طرز استنباط کو سمجھیں اور اس کے ذہن میں شک اور تذبذب پیدا کرنے کے لیے زیادہ واضح اور زیادہ منطقی مطالب فراہم کریں اور اس کے عقائد کو باطل قرار دیں۔ اختلافات، تفرقے، گڑبڑ اور مسلمانوں کے عقائد میں تزلزل پیدا کرنے کے لیے اس طرح کے اقدامات بے انتہا موثر پائے جاتے ہیں"[12]

استعمار کے قیام میں یہ ایک عمومی طریقہ تھا اور وہ اس میں انتہائی مذموم منصوبہ سازی سے کامیاب و کامران رہے۔ انہوں نے ایسے ہی نہیں مقامی زبانوں کے علم پر عرق ریزی کی اور ساتھ ہی مقامی طریقہ ابلاغ تک رسائی حاصل کی۔ وہ ان لوگوں کے معبر ٹھہرے۔ انہوں نے اپنے علم اور زاویہ نظر کے مطابق ان کے بنیادی مذہبی اور تاریخی متون میں سے اختلافات کو مجتمع کیا اور ان اختلافات کو بھڑکایا۔ اپنی تعبیروں سے ثقافتی، تاریخی، نسلی، قبائلی، روایتی، لسانی تعصبات کو ابھارا اور اسے ایک وقیع کام کے طور پر پیش کیا ہے تاکہ ان کی سہ باقی رہے۔ استعمار کی چالاکیوں میں سے یہ ایک مبہم قسم کی کوشش تھی۔ مسلمانوں اور دیگر مکاتب فکر کے مذہبی و تاریخی متونوں کو بنیاد بنا کر ان میں اختلافات کو بھڑکانا اور ان کے اندر باہمی اشتراکات کو اس طریقے سے پیش کرنا کہ جیسے وہ اپنے مذہب کی توہین کر رہے ہیں ان کے خیر خواہ بنتے ہوئے انہیں تعصب اور دشمنی میں بدل دینا اور پھر انہیں ان کے مذہب کی حقیقی ضرورت کے طور پر پیش کرتے ہوئے اجر و ثواب کا باعث قرار دیتے ہوئے اپنے آپ کو ان اقوام کا مراجع اور احسان مند قرار دیا۔

یہ ایک تاریخی اور سیاسی نظام ہے جس میں طاقتور اور ترقی یافتہ ممالک یا اقوام دوسرے خطوں یا علاقوں پر اقتصادی سیاسی یا سماجی مقاصد کے لیے اپنا تسلط قائم کرتے ہیں۔ وہ اس تسلط کے لیے ان علاقوں میں

بستیاں قائم کرتے ہیں اور انہوں نے ان بستیوں پر اپنی مکمل عملداری کے لیے سخت قوانین بنائے اور ان پر زبردستی عمل کروایا۔ اپنی حکمرانی قائم رکھنے کے لیے فوجی طاقت کا بے دریغ استعمال کیا۔ مقامی طبقہ کو بے گھر کر دیا گیا یا اپنے حکمانہ رویے سے انہیں دبا دیا گیا۔ طاقت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مقامی وسائل کو بے دردی سے لوٹا گیا۔ اپنی ثقافتی یلغار شروع کی جس سے مقامی زبانوں، ثقافتوں اور سماجی وسیاسی اصولوں کو منسوخ کر کے اپنی زبان و ثقافت کو ترویج دی گئی اس نتیجے میں مقامی ثقافتوں اور روایات کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ مضبوط انتظامی ڈھانچہ متعارف کروایا گیا جس نے رہی سہی کسر پوری کی۔ اس خطے کو اپنی مضبوط حکمت عملی سے بالواسطہ یا بلاواسطہ قابو میں رکھا جو اس نے اپنے مفادات کے لیے تشکیل دیا تھا۔ استعماریت نے جدید دنیا کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا جس کے مثبت اور منفی دونوں طرح کے نتائج موجود ہیں یہ جدید ٹیکنالوجی نظریات اور ثقافتوں کے پھیلاؤ کا باعث بنی ہیں جس نے بین الاقوامی سطح پر عروج پایا۔ جبکہ دنیا کے کئی حصوں میں معاشی، سیاسی، ثقافتی اور سماجی سطح پر استحصال اور ظلم و بربریت کا سبب رہی لیکن اس کے اثرات آج بھی عالمی سطح سیاست، معیشت اور ثقافت پر دیکھے جاسکتے ہیں، استعماریت کا دور مختلف تحریکوں، رجحانات اور طرز ہائے فکر سے عبارت ہے اور یہ سب استعماریت اور رد استعماریت کی باہمی کشمکش کے اثرات یا نتائج کی پیداوار ہے۔

رد استعماریت ایک سماجی اور سیاسی تحریک ہے جو استعمار کے ورثہ کی عقدہ کشائی کرنے اور اس کے جاری اثرات کو زائل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس میں متعدد نظریات اور حکمت عملیوں کا احاطہ کیا گیا ہے جس کا مقصد استعمار سے سماجی، سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی آزادی حاصل کرنا ہے۔ رد استعماریت کی تحریک نے بیسویں صدی کے وسط میں زور پکڑا کیونکہ افریقہ، ایشیا اور امریکہ کی بہت سی قوموں نے اپنے نو آبادیاتی حکمرانوں سے آزادی حاصل کی۔ تاہم رد استعماریت محض سیاسی آزادی سے بالاتر ہے۔ اس میں استعمار کی طویل حکمرانی، طاقت، جبر کے قوانین، استحصالی انتظامی ڈھانچے اور نظریات کو للکارنا اور بے جا پابندیوں کے خلاف شعوری کوششیں بھی شامل ہیں۔ استعماری نظام کا خاتمہ دراصل پراگندہ ذہنوں، اداروں اور نظاموں کو ختم کرنے کی کوشش ہے۔ رد استعماریت نے تعلیم، سیاست اور ثقافتی عناصر پر نمایاں اثر ڈالا اور اس نے استعماری نظام کی تاریخی ناانصافیوں، مقامی اور پسماندہ طبقوں کے لیے معاوضے، زمینی حقوق اور ثقافت کی دوبارہ بحالی کی

ضرورت کے بارے میں عوامی بیداری میں اضافہ کیا اور اس فکر نے مابعد نو آبادیاتی ادب، فن اور قوتِ عمل کو بھی متاثر کیا ہے۔ ایڈورڈ سعید نے لارڈ کرومر کی کتاب جدید مصر (Modern Egypt) سے ایک اقتباس نقل کیا ہے۔

بقول لارڈ کرومر (Lord Cromer) :

" I content myself with noting the fact that some how or other the Oriental generally acts, speaks, and things in a manner exactly opposite to the Eruopean"

"ترجمہ: میں اس حقیقت کو نوٹ کر کے اپنے آپ کو مطمئن کرتا ہوں کہ کچھ اورینٹل عام طور پر یوروپین کے بالکل مخالف طریقے سے کام کرتے ہیں، بولتے ہیں اور چیزیں کرتے ہیں"[13]

استعمار کی طرز فکر کا یہ جملہ دراصل یہ اس رویہ کی نمائندگی کرتا ہے کہ استعمار زدہ بالکل اجڈ اور تہذیب سے عاری ہیں۔ یہ ایک ایسی مخلوق ہے جو بے عمل، اچھی گفتگو سے عاری، سائنسی اور فلسفیانہ سوچ سے بہت دور ہے ان کے رویوں سے مشرقی اور مغربی تہذیب کے فرق کا پتہ چلتا ہے کہ کون سی تہذیب مہذب ہے۔ رد استعماریت دراصل استعماریت کا ارتقا، تسلط اور استحصال سے خود ارادیت، انصاف، مقامی شناختوں اور مقامی ثقافتوں کی بحالی پر توجہ مرکوز خاطر کرنے کی نمائندگی کرتی ہے۔ رد استعماریت ایک مسلسل عمل ہے جو مختلف شکلوں اور مختلف خطوں میں ہونے والی استعماریت کی وراثت کو حل کرنے کی کوششوں کے ساتھ عالمی منظر نامے کا خاکہ مرتب کرنا ہے۔

۵۔ ردِ استعماریت کے جدید تناظر

رد استعماریت ایک متنوع نقطہ نظر ہے۔ یہ استعماریت کی تاریخی حیثیت، اس کے وراثت میں چھوڑے گئے اثرات کے بر خلاف دستور العمل ہے جب کہ اس کے یہ بنیادی اصول وقت کے ساتھ بڑی حد تک مطابقت رکھتے ہیں۔ یہ استعماریت کی چیرہ دستیوں کے خلاف جدید نقطہ نظر ہے جس نے نئے چیلنجوں کے

مطابق نیا طرز اختیار کیا۔ رد استعماریت کے جدید تناظرات میں نو آبادیاتی دور میں ہونے والی تاریخی ناانصافیوں اور استحصال جو ان لوگوں نے برداشت کیا ان کا احاطہ کرنا بھی شامل ہے۔ ان زیادتیوں میں تشدد، معاشی استحصال، مقامی ثقافت کی معدومی اور سیاسی محکومی کو تسلیم کرنا شامل تھا اور اس کا مقصد صرف استعماریت کا خاتمہ نہیں بلکہ رد استعماریت کے تناظر میں استعماریت کے انتظامی ڈھانچے کا خاتمہ ہے تاکہ استعمار زدہ پر ان اثرات کو زائل کیا جائے اور مقامی ثقافتوں، زبانوں اور شناختوں کے تحفظ اور احیاء کی اہمیت پر زور دیا جائے۔ اس میں تعلیم، عجائب گھروں اور دیگر ثقافتی اداروں کو ختم کرنے کی کوششوں کی حمایت کرنا ہے۔ رد استعماریت کے جدید تناظرات میں ثقافتی اور فکری تحریکیں بھی شامل ہیں۔ جن کا مقصد مقامی زبانوں، روایات اور تعلیم و تعلم کے نظام کو دوبارہ بحال کرنا اور معدوم کی گئی ثقافتوں کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے جدوجہد کو جاری رکھنا ہے۔

معاشی عدم مساوات، منصفانہ تجارت، قرضوں سے نجات، معاشی ترقی اور معاشی تفاوت کو دور کرنا استعمار کے خلاف ایک اہم پہلو ہے۔ استعمار کے معاشی، سیاسی اور ثقافتی اثرات جو مختلف شکلوں میں ابھی تک برقرار ہیں ان کا خاتمہ کرنا دراصل استعمارزدہ کی خود مختاری کی بحالی کی طرف ایک اہم قدم ہے۔ رد استعماریت سامراج مخالف نقطہ نظر ہے جو استعماری طرز عمل پر تنقید کرتا ہے۔ استعماریت وہ مسلسل اثر رسوخ اور تسلط ہے جو استعماری طاقتیں یا کثیر القومی کارپوریشنیں یا طاقتور اقوام نو آبادیات کے خاتمے کے بعد بھی کمزور اقوام پر اپنا اثرورسوخ قائم رکھنے کے لئے استعمال کرتی ہیں لیکن اب انہیں مزاحمت کا سامنا ہے۔ سماجی انصاف کی تحریکیں جیسے حقوق نسواں، ماحولیات اور نسل پرستی کا مطالبہ ہے کہ استعمار اپنے خلاف نو آبادیاتی جدوجہد کے باہمی تعلق کو تسلیم کرے کہ استعماریت نے جبر کے دوسرے نظاموں کو اپنے مفادات کے لیے ایک کو دوسرے سے ملایا اور ان کو تقویت دے کر اپنے مقاصد حاصل کیے جبکہ رد استعماریت نقطہ نظر جبر سے وابستہ یا اس کی مختلف صورتیں جیسے نسل پرستی، جنس پرستی اور معاشی استحصال سے جڑی ہوئی ہر کاوش کو بے نقاب کرتا ہے اور یہ باہمی مفاہمتی نقطہ نظر سے سماجی انصاف کی دیگر تحریکوں کے ساتھ یکجہتی اور اتحاد سازی کا مطالبہ کرتا ہے۔ رد استعماریت ان کے خلاف مزاحمت ہے۔ مقامی لوگوں کے حق خدارادیت، زمین اور وسائل کی حمایت کرنا ہے۔ مقامی حکومتیں استحصال کا غیر متناسب بوجھ اٹھاتی ہیں خود مختاری اور انصاف کے لیے ان کی جدوجہد رد

استعماریت کے لیے لازم وملزوم ہے۔ رد استعماریت کے جدید تناظرات ماحولیاتی انصاف سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔ استعمار زدہ غیر متناسب طور پر ماحولیاتی انحطاط اور موسمیاتی تبدیلیوں سے متاثر ہیں جبکہ رد استعماریت ماحولیاتی استحکام اور مقامی زمینوں اور وسائل کے تحفظ کی حمایت کرتی ہے۔ جو اکثر استعمار مخالف جدوجہد، انصاف اور مساوات کے لیے ایک وسیع تر عالمی تحریک کا حصہ ہے۔ انتظامی ناانصافیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے باہمی تعاون اور یکجہتی ضروری ہے۔ ثقافتوں، معاشروں اور شناختوں پر استعمار کے دیرپا اثرات کے بارے میں آگاہی دینے کا یہ نقطہ نظر جدید دنیا میں استعمار مخالف جدوجہد کی پیچیدگیوں کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ ماضی کے ساتھ مفاہمت کی کوششوں کو فروغ دینا اور تاریخی غلطیوں کو تسلیم کرنا ہے۔ جس میں مقامی حکومتوں کو درپیش مشکلات کا ادراک، تاریخی ناانصافیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے منصفانہ جدوجہد جاری رکھنے کا عزم ہے۔ فرانز فینن لکھتے ہیں:

> "استعمار کی شکست کبھی خاموشی سے عمل میں نہیں آئی اس لئے کہ یہ افراد کو متاثر کرتی ہے اور اُن میں بنیادی تبدیلیاں لاتی ہے یہ ان تماشائیوں کو جو اپنی لا معنویت کے بوجھ تلے دبے ہوتے ہیں بامعنی اداکاروں میں تبدیل کر دیتی ہے۔"[14]

مابعد نو آبادیاتی مطالعات کے محققین جیسے تعلیمی مضامین، نو آبادیات کی ثقافتی، سیاسی اور اقتصادی وراثتوں کا تنقیدی جائزہ لینے کے لیے سامنے آئے ہیں۔ اس شعبے کے ماہرین ادب، تاریخ، شناخت اور طاقت پر استعمار کے اثرات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ آج کل کے دور میں ڈیجیٹل میڈیا نے تہلکہ مچایا ہوا ہے اس نے کارکنوں کے اندر بیداری پیدا کرنے، ان کی حمایت کو متحرک کرنے اور استعماری بیانیے کو چیلنج کرنے کے لیے نئی راہیں فراہم کی ہیں۔ سوشل میڈیا اور آن لائن پلیٹ فارم استعمار مخالف آوازوں کو بڑھانے کے لیے اہم ہتھیار بن چکے ہے۔ استعمار نے تعلیم کو ختم کرنے کے لیے تعلیمی نظام میں جو تبدیلیاں کی تھیں اس کے ازالے کے لیے نصاب، نصابی کتب اور تدریسی طریقوں پر نظر ثانی کرنا شامل ہے تاکہ مقامی اور رد استعماری نقطہ نظر کو اس میں شامل کیا جاسکے اور Eurocentric Approach کو چیلنج کیا جاسکے۔ مقامی سطح کی تحریکوں کی قیادت اکثر

مقامی لوگ ہی کرتے ہیں۔ ردا ستعماریت اس جدوجہد کو آگے بڑھانے میں مدد کرتی ہے۔ ان تحریکوں کا مقصد زمینی حقوق، ثقافتی ورثہ اور سیاسی خود مختاری کا تحفظ کرنا ہے۔ ردا ستعماریت کا نقطہ نظر یکساں نہیں ہے اور یہ مخصوص تاریخی اور ثقافتی لحاظ سے مختلف ہو سکتے ہیں جن میں وہ پیدا ہوتے ہیں مزید بر آں یہ تناظر نئے چیلنجوں اور مواقع کے جواب میں اپنی مختلف صورتوں میں متشکل ہوتے رہتے ہیں۔

- لسانی شعور (سیاسی، سماجی اور مذہبی معنویت):

ردا ستعماریت کے تناظر میں لسانی شعور ایک اہم تصور ہے اور اس کی جڑیں استعماری نظریہ میں ہیں۔ اس تناظر میں استعماریت کی زبان اور ثقافتی شناخت کے کردار کو سمجھنا ایک اہم وجہ ہے۔ یہ زبان کے استعمال سے وابستہ ثقافتی مضمرات کے بارے میں آگاہی ہے کہ کس طرح زبان کو ایک آلے کے طور پر طاقت اور تسلط کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور کس طرح مقامی زبانوں کو دوبارہ زندہ کرنے کا عمل مزاحمت کا ذریعہ بن سکتا ہے کیونکہ استعمار نے مقامی زبانوں کو پسماندہ رکھنے کے لئے کمال ہوشیاری سے اپنی زبانوں کو مقامی آبادیوں پر مسلط کر دیا تھا۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ زبان محض رابطے کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ یہ ثقافتی شناخت بھی ہے اس لیے استعمار نے مقامی ثقافتی شناخت ختم کرنے کے لیے مقامی مادری زبانوں کو مٹا کر اپنی زبانوں کو رائج کیا تا کہ ابلاغ میں آسانی رہے۔ ردا ستعماریت کے تناظر میں لسانی شعور اس بات کی بھی پرکھ کرتی ہے کہ زبان ابھی تک کس طرح استعمار کی طاقت اور تعصبات کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ مقامی اور پسماندہ معاشرے کی زبان کے حقوق کو پہچاننے اور اس کی حفاظت اور پرداخت پر توجہ دیتی ہے۔ زبان کے حقوق میں مادری زبان میں تعلیم، سرکاری دستاویزات میں استعمال اور ثقافتی سطح پر اس کا اظہار شامل ہے۔ ردا ستعماریت کے جدید تناظر میں لسانی شعور مقامی زبانوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر زور دیتا ہے وہ ان زبانوں کو سکھانے، محفوظ کرنے اور فروغ دینے کی کوششوں میں مصروف عمل ہے کیونکہ یہ زبانیں استعمار کی وجہ سے معدومی یا خطرے کا شکار ہوئیں۔ لسانی شعور اس بات کا بھی جائزہ پیش کرتا ہے کہ استعمار کس طرح اپنی طاقت اور تعصب کو برقرار رکھے ہوئے ہے اور آج بھی اس کی زبانیں اور لسانی ڈھانچے مقامی زبانوں پر حاوی ہیں اس لیے وہ مقامی زبان کے حقوق کو پہچاننے اور اس کی حق تلفی سے باز رکھنے کے لیے جامع نقطہ نظر کو فروغ دیتے ہیں۔ ردا ستعماریت، استعماری زبانوں کے غلبہ

اور درجہ بندی کو ملعون ٹھہراتی ہے۔ یہ بھی ایک کثیر الجہتی تصور ہے جس سے تاریخی ناانصافیوں کی اصلاح اور ثقافتی مساوات کو فروغ دینے میں مدد ملتی ہے۔ رد استعماریت کے تناظرات میں زبان کو ایک طاقتور ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ جدید لسانی شعور کے تناظر میں سماجی، سیاسی اور مذہبی پہلو جو استعمار سے منسلک ہیں ان کے خلاف مزاحمت کا جائزہ لیتی ہے۔ زبان ایک طاقتور ہتھیار اور اس کی حقیقت مسلمہ ہے اس لئے استعمار نے اس سے بھرپور استفادہ کیا اور اسے جبر کے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ رد استعماری جدوجہد میں لسانی شعور کی بحالی ہوئی ہے وہ اسے بیانیہ کی شکل دینے، اپنی شناخت کا اظہار کرنے اور مقامی لوگوں میں شعور اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی حمایت حاصل کر کے انہیں متحرک کرنے کے لیے استعمال کرتی ہے۔

سیاسی تناظر میں جدید لسانی شعور کی اہمیت بھی مسلمہ ہے استعمار نے سیاسی جبر اور غلبہ کے لیے اسے استعمال کیا۔ اپنی حکومتوں کو مسلط کرنے اور اسے طول دینے کے لیے مقامی زبانوں کی بے توقیری کی گئی۔ انہوں نے اپنے سیاسی دور میں جبر کے قوانین مرتب کیے اور ایسا سیاسی انتظامی ڈھانچہ تشکیل دیا کہ جس سے سیاسی انتشار مزید بڑھتا گیا۔ اپنی زبانوں کو مقامی سطح پر رائج کیا گیا اور اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے انہیں استعمال کیا گیا۔ رد استعماریت نے بھی زبان کی مسلمہ حقیقت کو مانا ہے کہ یہ مزاحمت کے لیے آلے کے طور پر استعمال کی جاسکتی ہے۔ استعمار کی بیخ کنی اور اپنے مطالبات کو بیان کرنے کے لیے ایک موثر ذریعہ ہے۔ سیاسی و قانونی ضابطوں کی مزاحمت کے لیے بھی زبان کا استعمال ایک اہم اور طاقتور آلہ ہے اور یہ لسانی شعور ان تحریکوں میں ظاہر ہوتا ہے جو مقامی زبانوں کو سرکاری سطح پر تعلیمی نظام کا حصہ بنانے، ان کی تدریس کے مطالبے کے ساتھ نصاب سازی میں ان زبانوں کو شامل کرنے کے لیے جدوجہد کرتی ہے اور یہ وسیع تر سیاسی خود مختاری کے لئے اہم ہے۔

کسی بھی معاشرے میں زبان کو مرکزیت حاصل ہے اور یہ اس معاشرے کی سماجی اور ثقافتی شناخت میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ کوئی بھی معاشرہ اپنی شناخت برقرار نہیں رکھ سکتا جب تک کہ وہ اپنی مادری زبان کی حفاظت نہ کرے۔ مادری زبان، ثقافت، روایات اور سینہ بہ سینہ سفر کرتی ہوئی کہانیوں کا نایاب مجموعہ ہے۔ مختلف قوموں میں ثقافتی امتیاز خوبصورتی کا درجہ رکھتا ہے نہ کہ یہ عمل باعث نزاع اور مجبوری کا باعث ہو۔

دنیاوی رنگارنگی، یکسانیت کی تکذیب کرتی ہے اور اس طرح مقامی زبانوں کے ذریعے مختلف طریقوں سے رسومات وعبادات کی ادائیگی معاشرتی اطمینان کا باعث ہے۔ اس طرح مذہبی متون رسومات کی شکل میں مقامی زبانوں میں موجود ہیں تاکہ لوگ اُن سے آسانی سے استفادہ کر سکیں اور اپنے مذہب کی جزئیات کو سمجھ سکیں تاکہ وہ دلی سکون، یکسوئی اور خشوع وخضوع کے ساتھ اپنی عبادات کو سرانجام دے سکیں۔ بین الاقوامی سطح پر زبان ایک متحدہ قوت کے طور پر کام کر سکتی ہے اگر تمام زبانوں کی قدر اور حفاظت پر خلوص ہو کر مساویانہ اور منصفانہ حقوق پر کی جائے تاکہ کسی بھی جگہ تسلط یا مسلط کا زاویہ نگاہ محسوس نہ ہو۔ رد استعماریت میں لسانی شعور نے ان تناظرات کا اظہار واضح طریقے سے کیا تاکہ اس کی قدر وقیمت کا اندازہ لگایا جا سکے۔

- دوہری شخصیت (سیاسی، سماجی اور مذہبی معنویت):

استعماریت مقامی شناختوں اور ثقافتوں کو اپنے اثرات سے دوچار کرتی رہی ہے۔ استعمار زدہ اپنی مقامی شناخت اور روایتی ثقافت جو اسے اپنے پرکھوں سے ورثہ میں ملی اور استعمار کی مسلط کردہ جدید شناخت اور ثقافتی اثرات میں پھنس کر رہ گیا۔ اس قدیم وجدید شناخت کے دو متضاد پہلوؤں سے صحیح سمت راستہ نکالنا بدیہی بات تھی اور یہ نفسیاتی تناؤ کا حوالہ دوہری شخصیت کا اظہار تھا کیونکہ استعماریت نے مقامی ثقافت کو معزول کیا اور اس کی جگہ نئی سیاسی شہریت کی حامل ثقافت کو رائج کیا۔ ایک بااثر امریکی ماہر عمرانیات ڈبلیو ای بی ڈوبوئس نے اپنی کتاب "The souls of Black folk" جو کہ 1903ء میں شائع ہوئی اس میں انہوں نے دوہری شخصیت کے تصور کو دوہرا شعور بھی قرار دیا ہے۔ انہوں نے یہ تصور انیسویں صدی کے آخر میں امریکیوں اور افریقیوں کے تجربات کو بیان کرنے کے لیے متعارف کروایا جو کہ ایک سفید اور سیاہ فارم امریکیوں کے درمیان اپنی شناخت اور دوہرے شعور کو درست سمت سمجھنا اور اختیار کرنا تھا۔ یہ دوہری شخصیت یا دوہرا شعور غلامی، نسل پرستی اور امتیازی سلوک کی وجہ سے معرض وجود میں آیا اور یہ دوہری شخصیت ان متوازی نظاموں کے ذریعے پیدا ہونے والی عدم انصاف و مساوات کا پیش خیمہ ہے تاہم یہ بھی ایک پیچیدہ اور کثیر جہتی عمل اور استعمار زدہ کے لیے چنوتی کا درجہ رکھتا ہے۔ قوم پرستی، مزاحمت، منقسم شعور، تہذیبی آویزش اور دہری شخصیت یا دوہرا شعور انہی تعاملات کے رد عمل کا شاخسانہ ہے یہ استعماریت کا نفسیاتی اثر ہے جس سے ابہام جنم

لیتا ہے جو کہ دوہری شخصیت کا باعث بنتا ہے اور یہ مقامی پسماندہ طبقات کی طرف سے تجربہ کردہ اندرونی کشمکش کا اظہار ہے اور پھر یہ بیداری کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں انہیں دوزاویہ نگاہ سے دیکھنا پڑتا ہے اس میں ایک اپنا نقطہ نظر اور دوسرا اکثریتی ثقافت کا نقطہ نظر ہے۔ یہ دوہری شخصیت یا دوہرا شعور دراصل مقامی افراد کو درپیش مسائل جو سماجی، ثقافتی اور نسلی تعصبات سے اُبھرتا ہے۔ ایک سے زیادہ سماجی شناختوں اور ثقافتوں میں خود کا احساس پیدا ہونا ایک مشکل امر ہے البتہ دوغلے پن یا دوہری شخصیت یا دوہرے شعور کا احساس محسوس ہوتا رہتا ہے۔ ایک مقامی تہذیب اور ایک بدیسی معاشرت دراصل دو روحیں، دو خیالات، دو غیر موافق قوتیں ، مشترکہ زبان و ثقافت، ایک جسم اور دو متحارب نظریات کا ایک جگہ سمانہ نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن بھی تھا۔ معاشرتی مساویانہ روش کے لیے ضروری ہے کہ دوہرے شعور پر قابو پایا جائے کیونکہ دو طرفہ شناخت پر مبنی مساوات کو دوہرے شعور کی بنیاد کو ختم کیے بغیر اس کا حصول ممکن نہیں۔ استعمار زدہ اور مقامی طبقات پر اس کے نفسیاتی اثرات دیکھے جاسکتے ہیں جو بعد میں رد استعماریت کے تناظر میں نظر آئے۔ سیاسی طور پر مقامی لوگوں کو متحرک کرنے اور انہیں سیاسی آزادی کے لیے استعمال کیا گیا۔ یہ سیاسی نقطہ نظر کے حوالے سے "دوہری شخصیت" رد استعماریت میں مشترکہ خصوصیت تھی. استعمار زدہ کے لیے اس کا معاشی عدم استحکام اور اس کی بقا ایک اہم مسئلہ تھا اس لیے وہ اپنے معاشی استحصال کی وجہ سے استعماری معاشی نظام کا حصہ بننے کے لیے مجبور ہوئے اور بعد ازاں اس استحصالی رویہ پر مزاحم بھی ہوئے۔ استعماریت جہاں "دوہری شخصیت" کو جنم دینے کا باعث بنی وہاں دوہرا نظام انصاف نافذ کرنے کا بھی موجب تھی۔ "دوہری شخصیت" نے ان غیر متوازی قانون و انصاف کے ذریعے پیدا ہونے والی عدم مساوات پر مزاحمت پیش کی۔

رد استعماریت کے تناظرات کی تشریحات پیچیدہ کاوشوں کے نشاندہی کرتی ہیں جن کا سامنا استعماریت کے اثرات سے نپٹنے کے دوران کیا۔ رد استعماریت کے جدید تناظر میں دوہری شخصیت یا دوہرا شعور اپنے اندر سیاسی، سماجی اور مذہبی حوالے سے کثیر جہتی تصور لیے ہوئے ہے۔ اس لیے استعماریت کے خلاف رد استعماریت کی تحریکیں چلیں۔ اگر سیاسی اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ استعماریت کے تناظر میں " دوہری شخصیت" نے مزاحمت اور موافقت دونوں طرح اپنی حکمت عملیوں کا اظہار کیا. مقامی لوگ یعنی استعمار زدہ

حکومت کے تابع ہونے کے دونوں کرداروں کو نبھاتے رہے یعنی استعمار کے آلہ کار بھی رہے اور انہی سے تعاون بھی کرتے رہے اور ساتھ ہی ان کی طاقت کو ختم کرنے کے لیے آپس میں منظم ہونے کے ساتھ ساتھ جبر کی مزاحمت بھی کرتے رہے۔ استعمار اور اس کے نمائندوں نے استعمار زدہ کو قابو میں رکھنے کے لیے "دوہری شخصیت" پر مبنی حکومتیں قائم کی۔ اس جبر اور ناانصافی نے مقامی حکومتی نمائندوں کے اندر بھی دوہری شخصیت یا دوہرا شعوری تصور پیدا کیا جس کی وجہ سے انہیں بھی دوہرے کرداروں سے گزرنا پڑا۔ اس طرح ان کا استعمار سے بھی تعاون جاری رہا اور رد استعماریت میں بھی انتہائی خاموش سپاہی کا کردار ادا کرتے رہے۔

دوہرا شعور یا دوہری شخصیت اپنی ثقافتی شناخت کو برقرار رکھنے کے لیے استعماری ثقافتی اصولوں اور اقدار کو اپنانے میں دلچسپی نہیں رکھتی تھی کیونکہ مقامی لوگ روایتی طرز زندگی کو اولیت دیتے تھے وہ اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنا چاہتے تھے جبکہ استعماری شناخت نے انہیں مجبور کیا تو وہ چاروناچار دونوں کو متوازن کرنے کے لیے اپنانے پر مجبور ہوئے تو اس طرح ان کی دوہری سماجی شناخت بنی اس دوہری سماجی شناخت کے حوالے سے وہ استعماری اصولوں اور توقعات کے مطابق شامل تھے جبکہ ان کے تحفظات میں خفیہ طور پر سماجی مزاحمت کو فروغ دینا شامل تھا۔ جس میں اپنی مقامی زبانوں، رسم ورواج اور سماجی ڈھانچے کا تحفظ شامل تھا دراصل یہ مقامی ثقافتوں کو مٹانے کے خلاف ایک مطعون کوشش تھی۔

رد استعماریت کے حوالے سے جدید تناظر میں دوہری شخصیت کی مذہبی معنویت اس نظام سے ہم آہنگی تھی۔ جس کا تعلق مقامی مذاہب اور استعماری مذہبی نظام کے طریقوں کی مجامعت میں تھا۔ استعمار زدہ نے محکومی صورتحال کے پیش نظر استعمار کے مذہبی پہلوؤں کو اپنے عقیدے کے نظام میں ڈھال لیا جس سے "دوہری مذہبی شناخت" معرض وجود میں آئی۔ رد استعماریت میں یہی ہم آہنگی ایک مذہبی مزاحمت کی شکل میں سامنے آئی اور اپنی روحانی روایات کے تحفظ کا ذریعہ بنی۔ رد استعمار کی کچھ تحریکوں کی جڑیں مذہبی اصولوں پر تھیں اور ان میں مزاحمتی رویہ پیدا کرنے کے حوالے سے مذہبی اداروں کا استعمال بھی تھا۔ مذہبی دوہری شخصیت میں استعمار زدہ ظاہری طور پر استعمار کی طرف سے مسلط کردہ مذہبی اصولوں کے مطابق شامل تھے جبکہ خفیہ طور پر ان اداروں کو استعمار کے مخالف کوششوں کی حمایت میں استعمال کیا جاتا رہا۔ رد استعماریت کے جدید

تناظر میں دوہری شخصیت استعمار کے خلاف مزاحمت کرنے، اپنی مقامی ثقافتوں کو برقرار رکھنے اور اپنی مذہبی و سماجی روایات کو برقرار رکھنے کے لیے استعمار زدہ کی طرف سے استعمال کی گئی پیچیدہ حکمت عملیوں اور ان سے نبٹنے کے طریقے کار کی نمائندگی کرتی ہے۔ رداستعماریت کی جدوجہد کثیر جہتی نوعیت اور جابرانہ استعماری حکومتوں کے خلاف لڑنے والوں کی موافقت کی نشاندہی کرتی ہے۔

- تہذیبی آمیزش (سیاسی، سماجی اور مذہبی معنویت):

رداستعماریت کے جدید تناظر میں تہذیبی آمیزش بھی ایک پیچیدہ عمل ہے۔ جس میں استعمار نے جبر اور تسلط سے اپنی تہذیب و ثقافت کو مقامی سماج پر مسلط کیا جس سے مختلف گروہوں کی تہذیب و ثقافت کا ارتباط ہوا اور اس امتزاج کے اثرات پورے معاشرے پر پھیل گئے جب کہ رداستعماریت ایک سیاسی اور سماجی تحریک ہے جو استعماری جبر و استحصالی نظام کی مخالفت کرتی ہے استعمار سے آزادی، اپنی مقامی اقدار کو بحال کرنا اور استعمار کی مسلط کردہ تہذیب و ثقافت سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔ رداستعماریت کے جدید تناظر میں ثقافتی عناصر اور طرز عمل کی آمیزش بھی ایک مزاحمتی عنصر تھا۔ رداستعماریت میں استعماری دور میں جو ثقافتی میلاپ ہوا تھا تو اس دور میں مقامی تہذیب و ثقافت اور سماجی روایات کا احیا شامل تھا جنہیں استعمار نے اپنے سخت قوانین سے مقامی سماج پر مسلط کیا اور مقامی ثقافتوں کو پسماندہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ چارلس ایڈورڈ ٹریولین لکھتے ہیں:

> "Familiarly acquainted with us by means of our literature, the Indian youth almost cease to regard us as foreigners. They speak of our great men with same enthusiasm as we do. Educated in the same way, interested in the same objects, engaged in the same pursuits with our selves, they become more English

than Hindus, just as the Roman provincials became more Romans than Gauls or Italians."

"ہمارے ادب کے ذریعے ہم سے آشنا ہونے کے بعد، ہندوستانی نوجوان ہمیں غیر ملکی ماننا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ ہمارے عظیم آدمیوں کے بارے میں اسی جوش و خروش سے بات کرتے ہیں جیسا کہ ہم کرتے ہیں۔ اسی طرح تعلیم یافتہ، ایک ہی چیزوں میں دلچسپی رکھنے والے، اپنی ذات کے ساتھ ایک جیسے مشاغل میں مصروف، وہ ہندوؤں سے زیادہ انگریز بن جاتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے رومی صوبے والے گال یا اطالویوں سے زیادہ رومی بن گئے۔"[15]

ٹریولین نے واضح اعتراف کیا ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنی تہذیب و تمدن کو نوجوانوں میں راسخ کیا ۔ انہوں نے سماجی سطح پر اپنی پوری دانش اور طاقت سے معاشرے کو بدل دیا جس نے استعمارزدہ کو نفسیاتی کیفیات سے دوچار کیا۔ ہندوستان مذہب اور ثقافت کے اعتبار سے انتہائی زرخیز ملک تھا اس میں دنیا کے تمام مذاہب و ثقافت کے لوگ مکین رہے ہیں ثقافتی امانگی ہو یا مذہبی گویا یہاں انسانی برادری کی ثقافت تھی اور اس کے روح رواں صوفیا اور اولیاء اللہ تھے انہوں نے رنگ و نسل اور زبان کے بتوں کو پاش پاش کر دیا تھا یعنی انہوں نے تمام امتیازات کی نفی کی تمام مذاہب کے لوگ رواداری سے کام لیتے ہوئے اپنے مذہبی معاملات کی ادائیگی میں مصروف تھے اپنے اپنے مذہبی عقیدے کے فرق کو قائم رکھتے ہوئے صوفیا اولیاء اللہ اور مزاروں سے قلبی عقیدت کے ساتھ حاضری دیتے تھے استعمار کی برصغیر امد کے ساتھ اہستہ اہستہ شہرازہ بکھرنا شروع ہوا۔ ڈبلیو کروک اپنی کتاب "An introduction to the population, religion & folklore of Northern India" ایشین ایجوکیشنل سروسز، الہ آباد، 1994ء، 1894ء، ص:I" میں لکھتے ہیں کہ نچلی ذات کے ہندو بھی مسلمانوں کے صوفیا اور بزرگوں کو مانتے تھے اور ان کی پیروی میں پیش پیش تھے ان سے دلی لگاؤ اور عقیدت رکھتے تھے۔ اپنی منتوں اور مرادوں کے لیے چڑھاوے چڑھاتے تھے جبکہ یہ ہندو عقیدے کے مطابق درست نہ تھا اور استعمار نے اسے ہندو دھرم کے بدترین دشمن اور باطل قرار دیا۔ ڈبلیو کروک کی بیان کی

گئی افسردہ کیفیت اصل میں ان کے درمیان حالت نزا کی کیفیت برپا کرنے کے مترادف تھی۔ صدیوں کی رفاقت، میل جول، ثقافتی اور لسانی اشتراکات کو آسانی کے ساتھ ملیامیٹ کرنے کی کوشش کی گئی اور مقامی آباد کاروں کی ثقافتی شناخت کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح کی کوششوں سے استعمار نے طاقت حاصل کی اور مضبوط ہوا۔ استعمار زدہ کے ثقافتی ادارے، تصورات، عقائد جو انہیں تقویت کا باعث بنتے تھے جن سے انہیں دلی وابستگی تھی ان کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا گیا اور بعد ازاں انہیں مسمار کر دیا گیا۔ اس طرح ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا گیا۔ ردا ستعماریت مقامی زبانوں کی بحالی، مقامی فنون کی تجدید اور مذہبی روایات کی بحالی کے لیے سرگرم ہوئی لیکن مقامی اور غیر ملکی تہذیبی و ثقافتی عناصر کی آمیزش کی کئی مقامات پر تعریف و توصیف کی گئی کیونکہ اس سے نئے ثقافتی تاثرات تخلیق ہوئے اور جس نے آنے والے وقتوں میں جدید شناخت حاصل کی۔ مابعد نو آبادیات ان علامتوں اور شناختوں کی تجدید کرتی ہے جو استعمار کے دور میں مروج کی گئیں ان کا اظہار مقامی تقریبات اور ان کے ملبوسات سے ظاہر ہوتا ہے۔ جدید دنیا میں ثقافت لاتعلق نہیں ہوتی وہ معاشرے میں مختلف ثقافتوں کے انجذاب کا باعث بنتی ہے۔ جس کے ملاپ سے نئی صورتحال سامنے آتی ہے اور جس سے ثقافتی تبادلے کو فروغ ملتا ہے اور یہ اختلاط فن، ادب، موسیقی اور دیگر ثقافتی ذرائع میں نظر آتا ہے۔ تہذیب و ثقافت کا ایک تناظر اس کی آمیزش بھی ہے۔ قومیں اپنے تہذیبی اور ثقافتی بشمول دانشورانہ املاک کے حقوق اور سیاحتی ورثے پر فخر کرتیں ہیں اور یہ ایک اہم پہلو ہے جس سے معاشی آزادی اور خود ارادیت وابستہ ہے۔ رد استعماریت میں تہذیبی اور تاریخی نقطہ نظر سے مختلف نسلی، سماجی اور مذہبی اثرات نمایاں ہوتے ہیں اور بین الاقوامی سطح تک اس کا نفوذ ممکن ہے۔

ردا ستعماریت کہ جدید تناظر میں ثقافتی، سماجی اور تہذیبی آمیزش کے اثرات جو کہ استعمار کی سازش کے نتیجے میں سامنے آئے سیاسی میدان میں اس تہذیبی اور ثقافتی بالادستی کی مزاحمت ہے۔ جس میں ایک ثقافت کا دوسری ثقافت پر تسلط تھا کیونکہ استعمار نے مقامی تہذیب و ثقافت کو اپنی جگہ سے تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ ردا ستعماریت سیاسی بالادستی کے اعتبار سے اس کے خلاف ایک مضبوط موقف کی حامل ہے جبکہ اس

کا ملاپ ایک منفرد قومی شناخت کی تشکیل میں مدد و معاون ہے جس میں مختلف مقامی، استعماری اور دیگر بیرونی اقوام کے عناصر بھی شامل تھے اور یہ آپس میں تعلقات کا ذریعہ بن سکتے تھے۔

سماجی تناظر میں مختلف تہذیبی آمیزش کا ملغوبہ معاشرتی سطح پر دوغلے پن کا باعث ہو سکتا ہے کیونکہ معاشرتی سطح پر افراد مختلف تہذیبی و ثقافتی عناصر کو اپنی روزمرہ زندگیوں میں شامل کیے ہوئے ہیں جس کے نتیجے میں ایک مزین تہذیب سامنے آتی ہے اور یہ مختلف روایات، زبانوں اور رسم و رواج کی آمیزش کی رنگارنگی ہے جو کہ استعمار اور رد استعمار کی عکاس ہے۔ اور جو بعد میں رد استعماریت کی تحریکوں میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی شمولیت کا باعث بنی۔ جس نے لوگوں میں متنوع خیالات کے احساس کو فروغ دیا اور استعمار مخالف بیانیوں کو تقویت دی۔ اس عمل نے دقیانوسی تصورات، استعماری ادوار کے تعصبات کے خاتمے میں مدد کی اور معاشرتی سطح پر تہذیبی آمیزش کے پہلوؤں کے بارے میں مزید آگاہی دی۔

تہذیبی آمیزش اکثر مذہبی رسومات سے عبارت ہے اور یہ مختلف مذہبی عقائد اور طریقوں کا امتزاج ہے جو کہ استعماری دور میں مسلط مذہبی عقائد کے خلاف مزاحمت تھی لیکن اس آمیزش کے زمرے میں استعماری اور مقامی رویہ بظاہر مثبت نظر آیا۔ رد استعماری تحریکوں نے مقامی تہذیب اور ثقافتی عناصر کی شناخت اور اسے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے مختلف طریقوں پر کام کیا اور یہ مذہبی اور ثقافتی طریقوں کو زندہ کرنے کا باعث بنا۔ اس میں روایتی رسومات، ملبوسات، تقاریب اور روحانی عقائد کو دوبارہ رائج کرنے کی کوشش کی گئی اس کے ساتھ یہ تہذیبی تخلیط بین المذاہب ہم آہنگی کا باعث بنی۔ رد استعماریت کے حوالے سے مختلف مذہبی عقائد اور طریقوں کا مطالعہ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش اور استعمار کے مسلط کردہ مذہبی قوانین پر رد عمل ہے لیکن بعض اوقات آپس کی گفتگو، مکالمہ مزاحمتی تناظر میں مشترکہ لائحہ عمل اپنانے کی طرف مائل کرتا ہے اور آپس میں افہام و تفہیم کا باعث بنتا ہے۔ رد استعماریت کے جدید تناظر میں یہ ثقافتی ارتباط کے گہرے سیاسی، سماجی اور مذہبی اثرات ہیں۔

ادب کی سماج سے جڑت ہے اور یہ رشتہ علامتی نوعیت کا ہے یہ ایک آئینہ ہے جو معاشرے کی اقدار، عقائد اور ثقافتی اصولوں کی عکاسی کرتا ہے اور انسانی تجربات کی باریکیوں اور پیچیدیوں کو اپنی گرفت میں لیتے

ہوئے حل پیش کرتا ہے۔ اس میں سماجی تصورات کو تشکیل دینے، نظریات پر اثر انداز ہونے اور سماجی مسائل کو حل کرنے، قائم کردہ روایتی اصولوں کو ابھارنے اور ان کے ذریعے تبدیلی کی راہ ہموار کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اس کے برعکس معاشرتی ترقی اور تبدیلیاں ادب کے موضوعات، اسلوب اور مواد کو تخلیقی عمل پر ابھار سکتی ہیں۔ جس سے ادب اور سماج کے درمیان ایک متحرک جوابی عمل ہوتا ہے اسی طرح ادب اور جمالیات کا آپس میں گہرا تعلق ہے ادب میں جمالیات ان فنکارانہ عناصر کو کہتے ہیں جو اس کی خوبصورتی، جذباتی تحرک اور حسیاتی میلان طبع میں حصہ ڈالتے ہیں۔ لوگوں کے لیے ایک جمالیاتی تجربہ تخلیق کرنے کے لیے مصنفین مختلف ادبی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں جیسے تخیل آفرینی، علامتی زبان، بیانیہ کی ساخت، ادب میں زبان، اسلوب اور شکل کے باہمی تعامل کا مقصد جذبات کو ابھارنا، خیالات کو بھڑکانا اور حواس کو مشغول کرنا ہے اس طرح کام کی جمالیاتی رغبت کو بڑھانا ہے۔ ادب میں جمالیاتی عناصر کا انتخاب اس کے مجموعی تاثرات کو بڑھاتا ہے جو کہ قاری کے تجربے کو بڑھاتے ہوئے اس دور کی ثقافتی اقدار کی عکاسی کرتے ہیں۔ استعمار نے اپنے بیانیے، تناظرات اور مختلف انواع موضوعات کی تشکیل کر کے ادب پر نمایاں طور پر اثر انداز ہوا ہے۔ ادب نے استعماری کوششوں کی حمایت اور تنقید دونوں صورتوں میں ایک آلے کے طور پر کام کیا ہے اس میں نو آبادیاتی زمینوں اور لوگوں کو استعمار کی عینک سے پیش کیا جاتا ہے جس سے دقیانوسی تصورات اور نو آبادیات کے جواز کو تقویت ملتی ہے اس کے ساتھ ہی اس نے مزاحمت کے لئے ایک پلیٹ فارم بھی مہیا کیا ہے جس میں کچھ کام استعمار کے نظریات کو چیلنج کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کچھ مقامی حقوق کی وکالت کرتے ہوئے دیکھائی دیتے ہیں اور کچھ نو آبادیاتی حکمرانی کی پیچیدگیوں اور ناانصافیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ اگر مجموعی طور پر جائزہ پیش کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ادب نے استعمار کی طاقت کی حرکیات کو برقرار رکھنے اور مقابلہ کرنے کی دونوں صورتوں میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔

نو آبادیاتی دور میں ادب زیادہ تر اس دور کی ثقافتی، سماجی اور سیاسی حرکیات سے متاثر تھا۔ یہ اس دور کی جدوجہد اور تنازعات کو بیان کرتا ہے جس میں مذہبی عقائد اور ثقافتوں کے اختلاط اور تصادم کے موضوعات کی عکاسی ہوتی ہے ۔ نو آبادیاتی ادب مختلف شکلوں میں موجود ہے جیسے جرائد، ڈائریوں، آپ بیتیوں،

خطبات، تذکروں، ناولوں اور شاعری کی ابتدائی شکلوں پر محیط ہے جو اکثر آباد کاروں اور مقامی لوگوں کے تجربات اور نقطہ نظر کا اظہار ہے۔ نو آبادیاتی دور میں خود نوشتوں نے ذاتی تجربات اور اس وقت کے سماجی سیاق و سباق کے درمیان ایک پل کا کام کیا وہ اکثر نو آبادیات کے ساتھ فرد کے مقابلوں، ان کی موافقت یا نئی ثقافتوں کے خلاف مزاحمت اور نو آبادیاتی فریم ورک کے اندر سماجی حرکیات پر ان کے نقطہ نظر کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ خود نوشت یا سوانحی کام اس دور کے سماجی ڈھانچے، طاقت کے عدم توازن اور ثقافتی تصادم کے بارے میں آگاہی مہیا کرتے ہیں جو نو آبادیات کی وجہ سے ہونے والی وسیع تر سماجی تبدیلیوں کے بارے میں گہری واقفیت دیتے ہیں ان کے ذریعے افراد نے نو آبادیاتی معاشرے کے اندر صحیح سمت اختیار کی اور اپنے منفرد تجربات کو دستاویزی شکل دے کر ادبی منظر نامے میں اپنا حصہ ڈالا۔ وہ اپنے دور کے اہم سیاسی، مذہبی، ثقافتی، معاشی اور معاشرتی واقعات سے اثر قبول کرتا ہے اور اس کی زندگی میں معاشرتی اقدار کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔ وہ اپنے عصر کا حساس نمائندہ ہوتا ہے۔ زمانے کی تمام جزیات کا ادراک رکھتے ہوئے ان کو بے لاگ لکھتا چلا جاتا ہے۔ اگر وہ ادیب، شاعر یا تخلیق کار ہے تو وہ اپنے عہد کے ادبی و سیاسی شخصیات کا ذکر اور ان کی سوچ اور فکر پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ مورخین کی تاریخ نویس کچھ اس طرح سے ہے کہ وہ واقعات کو سنین اور حقیقی واقعات کی روشنی میں ترتیب دیتے ہوئے تحریر کرتا چلا جاتا ہے لیکن تاریخ کا ایک ماخذ اور اسلوب ادبی تاریخ نویسی ہے۔ جس میں ادیب بحیثیت فرد کے تاریخ کا مشاہدہ کرتا ہے اور پھر اسے بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ یوں تاریخی واقعات فرد کی ذاتی زندگی کی چھلنی سے گزر کر اس وقت کی زندگی کا حقیقی بیان بن جاتے ہیں جبکہ روایتی تاریخ نویسی اس سے کوسوں دور ہے۔ یہی حال آپ بیتیوں کا ہے یعنی ہم آپ بیتیوں میں بیان کی گئی تاریخ کو کسی طرح سے روایتی مورخین کی بیان کردہ تاریخ سے زیادہ مستند سمجھتے ہیں اس لیے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادبی تاریخ نویسی، روایتی تاریخ نویسی کا حوالہ بن جاتی ہے۔ آپ بیتی کی صنف ادب، تاریخ و تذکرہ جیسی اصناف سے زیادہ دلچسپ، تحرک آمیز اور خوشگوار ہوتی ہے۔ اس عہد کی تاریخی واقعات بھی اس خود نوشت میں شامل ہو جاتے ہیں اور وہ ان ادبی شخصیتوں، تحریکوں کو بھی اپنا موضوع بناتا ہے جو اس دور میں وقوع پذیر ہو رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے بعد

کے آنے والے ابواب میں منتخب آپ بیتیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے استعماری قوتوں کی حیلہ کاری، ان کے میلانات طبع، ان کی حکمت عملیوں اور ان کی تعبیرات کو موضوع بحث بنایا جائے گا۔

ترقی پسند نقادوں نے بڑے پیمانے پر استعمار پر تنقید کی اس کی ناانصافیوں، استحصال اور مقامی ثقافتوں اور معاشروں پر منفی اثرات کو اجاگر کیا انہوں نے ثقافتی آمیزش، معاشی استحصال اور مقامی شناختوں کو دبانے جیسے مسائل پر توجہ مرکوز کی ہے۔ فرانز فینن، ایڈورڈ سعید، ی چنوا اچنیبی اور بہت سے دوسرے مصنفین نے ایسے کام لکھے ہیں جو استعماری ڈھانچے کی جانچ کو چیلنج کرتے ہیں اور طاقت کی حرکیات، نسل پرستی اور نو آبادیات کے دیرپا اثرات کو صراحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور یہ تحریریں رد استعمار کا باعث بنتی ہیں اور مقامی حقوق کو تسلیم کرنے کی وکالت بھی کرتی ہیں اور یہ عالمی رواداری کے ساتھ ایک منصفانہ اور جامع عالمی معاشرے کو فروغ دیتی ہیں۔

باب اول:

حوالہ جات

1. ایڈورڈ سعید , "Culture and Imperialism"، بینگوئن بکس، انگلینڈ۔1995ء، ص:38
2. ٹی بی میکالے، "Macaulay's Minute"، مشمولہ: میکالے اور برصغیر کا نظام تعلیم، سید شبیر بخاری: آئینہ ادب, لاہور 1986ء، ص:74
3. سر سید احمد خان، مقالات سر سید، جلد سیز دہم، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1963ء، ص:585 تا 586
4. احمد، سہیل، ردنو آبادیاتی تنقید، مشمولہ: تسطیر, راولپنڈی، 1998ء، ص:122
5. نیر، ناصر عباس، مابعد نو آبادیات اُردو ادب کے تناظر میں، کراچی، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2013ء، ص:4
6. انور سدید، ڈاکٹر، "اردو ادب کی تحریکیں"، کراچی، انجمن ترقی اردو (پاکستان), ص:239
7. سر ہمفری گلبرٹ، "ہمفرے کے اعترافات", انجمن نوجوانان پاکستان, لاہور, سن ن، ص:6
8. جان لاک وڈ کپلنگ، "Beast and man in India" البیرونی، لاہور، 1978ء، ص:13
9. نیر، ناصر عباس، متذکرہ بالا، ص:6
10. سر ہمفری گلبرٹ، متذکرہ بالا، ص:6
11. سی ایل انس، "The Cambridge Introduction to Post colonial Literature in English"، کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج، 2007ء، ص:2
12. سر ہمفری گلبرٹ، متذکرہ بالا، ص:90
13. ایڈورڈ سعید، "orientalism"، بینگوئن بکس، انگلینڈ، 1995ء، ص:38
14. فرانز فینن, "افتادگان خاک", فکشن ہاوس, لاہور, 2017ء، ص:31

15. ٹریولین، چارلس ایڈورڈ، "On the education of the people of India"، لانگ مین، ارمی براون، گرین اینڈ لانگ مینز، لندن، 1838ء، ص:45

باب دوم: منتخب اُردو آپ بیتیوں میں رد استعماری لسانی شعور کا مطالعہ

(سیاسی، سماجی اور مذہبی محرکات واثرات)

رد استعماری لسانی شعور ایک نظریاتی عمل ہے۔ جس کے ذریعے استعماری دور کے اثرات کو زبان وثقافت کے ذریعے سمجھا جاتا ہے اور پھر اس کے مطابق حکمت عملی تیار کرتے ہوئے اس سے مقابلے کے لیے کوششیں کی جاتی ہیں۔ دراصل اس کا اصل مقصد استعمار کے اثرات کو ختم کرنا، مقامی زبانوں، ثقافتوں اور شناختوں کو جلا بخشنا ہے تاکہ مقام شناختوں کی بحالی کے ساتھ مقامی اقدار کو ترقی دی جاسکے۔ رد استعماری لسانی شعور استعمار کے مسلط کردہ اثرات کے خاتمے پر زور دیتا ہے۔ تاکہ دوبارہ مقامی زبانوں کا چلن ہو سکے اور مقامی ثقافتوں کی ترویج ہو۔ یہ شعور مقامی ثقافت واقدار کو دوبارہ زندہ کرنے کے ساتھ ساتھ استعماری دور میں تخلیق کیے گئے ادب کا تجزیہ کرتے ہوئے مقامی نظام تعلیم کے لئے اصلاحات پر زور دیتا ہے۔ اس دور کے شعراء اور مصنفین اپنی تحریروں میں استعمار کے مظالم کو بے لاگ انداز سے تحریر کرتے ہیں اور مقامی زبان وثقافت کو بڑی خوبصورتی سے اجاگر کرتے ہیں۔ اس حوالے سے جن آپ بیتیوں کا انتخاب کیا گیا ہے وہ دور استعمار کی تمام تر چالاکیوں اور مکاریوں کو آشکار کرتی ہیں۔

کالا پانی المعروف تواریخ عجیب:

مولانا محمد جعفر تھانیسری کی آپ بیتی "تواریخ عجیب" جو کہ "کالا پانی" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ استعماری دور کی ایک اہم دستاویز ہے۔ وہ اس کے ابتدائیے میں اعتراف کرتے ہیں کہ یہ آپ بیتی ان کے بیس سالہ قید وبند کے حالات وواقعات پر مشتمل ہے۔ پورٹ بلیر جزائر انڈمان پر ضلع انڈمان کا سب سے بڑا شہر ہے اور جہاں بلدیاتی کونسل بھی ہے یہ جزائر انڈمان اور نیک وبار کا دارالحکومت بھی ہے۔ برطانوی استعمار کی بدنام زمانہ جیل "کالا پانی" یہیں واقع ہے۔ مولانا جعفر تھانیسری کی رہائی کی درخواست نامنظور ہوئی اور انہیں جیل بھیج دیا گیا۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہندستان واپسی پر خود نوشت لکھیں گے لہٰذا انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اس کا پہلا ایڈیشن اپریل 1879ء میں کالا پانی المعروف تواریخ عجیب کے عنوان سے محمدن اینگلو اورینٹل پریس لاہور سے شائع ہوئی۔

قید فرنگ:

مولانا حسرت موہانی کی آپ بیتی " قید فرنگ" کو بھی تاریخی اور ادبی مقام حاصل ہے۔ وہ مشہور شاعر، صحافی اور تحریک آزادی کے سرگرم رہنما ہونے کے ساتھ استعمار کی چالاکیوں کے چشم دید گواہ ہیں۔ ان کی زندگی محنت اور جفاکشی سے عبارت ہے۔ یہ آپ بیتی ان کی تحریک آزادی کے سیاسی، سماجی اور ادبی پہلوؤں کے ساتھ استعماری حالات کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ یہ استعماری دور کی ایک اہم شہادت ہے۔

جس نے برطانوی استعمار کے تمام دعووں کی قلعی کھول دی۔ جسے وہ " Theory of guardianship" کہتے تھے۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی میں برطانوی استعمار کے ظلم و ستم، قید و بند کی صحبتوں، سلگتے معاشرتی حالات اور اپنے حوصلے کو قلم بند کیا۔ ان کی شاعری، تحریریں اور ان کے صحافتی مضامین رد استعماری جہد وجہد کے عکاس ہیں۔ حسرت کی فکر نے اہلیان ہند کے لیے راہ مقرر کی اور ہندوستان کے استقلال کا نعرہ بلند کیا۔ قید فرنگ "پہلی بار 1929ء کو کانپور" سے "کتب خانہ اردوئے معلی" نے شائع کی۔

"بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل"

شورش کاشمیری کا اصل نام عبد الکریم اور ان کی آپ بیتی "بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل" اور "پس دیوار زنداں" کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ ایک مشہور صحافی، شاعر، ادیب اور ان کی تحریریں استعماری نظام کے خلاف بغاوت کی علامت ہیں۔ ان کی آپ بیتی ان کے زندگی کے مختلف پہلوؤں، مشاہدات، تجربات کے ساتھ اس دور کے سیاسی و سماجی منظر نامے کی منہ بولتی تصویر ہے۔ وہ اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے استعماری قوتوں کو للکارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ کم عمری سے ہی استعماریت، ظلم و جور، نا انصافیوں اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرتے رہے۔ انہوں نے استعماری نظام کے خلاف سخت رویہ اپنایا اور عوام کو بیدار کرنے کے لیے خوش کن آواز میں جوشیلی تقریریں کیں اور انہیں حریت اور آزادی کا درس دیا۔ انہوں نے آزادی خود مختاری، انسانی حقوق کی پاسداری کے موضوعات پر خوب لکھا اور اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کی ترغیب دی۔ انہوں نے اپنے جریدے "چٹان" میں استعماری قوتوں کے خلاف متعدد مضامین لکھے بلکہ وہ عملی طور پر بھی رد استعماری سرگرمیوں میں پیش پیش رہے۔ انہیں مارا گیا لہولہان کیا گیا اور انہیں بھی قید و بند کی صحبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ انہوں نے سیاسی تنظیمیں بنائی اور وہ سیاسی طور پر مختلف تحریکوں میں بھی سرگرم رکن رہے۔ جس کی وجہ سے ان کے مختلف سیاسی شخصیات سے گہرے مراسم رہے۔ بہت سارے تاریخی واقعات کے وہ چشم دید گواہ ہیں۔ ان کی زندگی کے کارنامے استعماریت کے خلاف جدوجہد آزادی کی ایک عمدہ مثال ہے جو ہمیشہ یاد رکھی جائے گی اور یہ آج بھی نوجوان نسل کے لیے مشعل راہ ہیں۔ شورش کشمیری کی ایک نظم " حریت کا علم " ظلم و استبداد کے خلاف کمربستہ ہونے اور آزادی کے لیے جدوجہد کرنے کا درس دیتی ہے۔

اے حریت کے دیوانے!
جاگ کہ اب وہ وقت آیا ہے
ظلمتوں کے اندھیروں میں
آزادی کا چراغ جلانا ہے

آغا شورش کشمیری کی یہ آپ بیتی مطبع چٹان پرنٹنگ پریس لاہور سے 1960ء میں جبکہ "پس دیوار زنداں" مکتبہ ناصر لاہور سے شائع ہوئیں۔

ناقابل فراموش:

سردار دیوان سنگھ مفتون کی آپ بیتی "ناقابل فراموش" کے نام سے مشہور ہے۔ وہ استعماری دور کے صحافی، مصنف اور مدیر تھے۔ انہیں ہندوستانی قوم سے انتہائی لگاؤ تھا اس لیے انہوں نے آزادی کی تحریک کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ جس کے لیے انہوں نے لوگوں میں سماجی اور سیاسی شعور بیدار کیا۔ جس کی وجہ سے انہیں برطانوی استعمار اور مقامی استعمار کی مخالفت ملی لیکن وہ بے باک اور نڈر صحافی تھے اپنے مشن پر کاربند ہوتے ہوئے انہوں نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بھرپور انداز سے عوامی آواز کو بلند کیا کیونکہ وہ روزنامہ "ریاست" کے ایڈیٹر تھے. انہوں نے اس پلیٹ فارم کو استعمال کرتے ہوئے عوامی مسائل ومشکلات کو اقتدار کے ایوانوں تک پہنچایا تاکہ مظلوم و مقہور عوام کی دادرسی ہو سکے۔ ان کی تحریریں اور مضامین آزادی کے متوالوں کے لیے حوصلے کا باعث بنیں۔ انہوں نے اپنے اخبار کے ذریعے عوام کے خلاف برطانوی استعمار کے رویے پر سخت تنقید کی۔ ان کی اس بے باکانہ صحافت کی وجہ سے اُنہیں کئی مرتبہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں لیکن ان کی جدوجہد ہندوستان کے صحافتی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے اور ان کی خدمات کو آج بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ بڑے تن وتوش کے آدمی تھے انہوں نے استعماری جبر و استبداد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور عوام کی آواز بن گئے۔ انہوں نے روزنامہ "ریاست" کے پلیٹ فارم سے "ناقابل فراموش" کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ 13 اپریل 1944ء کو شروع کیا۔ اسے عوام میں خوب پذیرائی حاصل ہوئی کیونکہ ان کے مضامین برملا گوئی اور بے باکی کی عملی تصویر بنے۔ یہ مضامین اتنے مقبول ہوئے کہ بعد میں اُنہیں "ناقابل فراموش" کے عنوان سے کتابی شکل میں پیش کیا گیا۔ مکتبہ جدید پریس نے جولائی 1954ء میں لاہور سے شائع کیا۔

کسی بھی معاشرے میں زبان کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اپنے روزانہ کے معاملات ہوں یا وقتاً فوقتاً پیش آنے والے حالات وحادثات ہوں۔ انسان فطری طور پر اپنی سہولت کے پیش نظر اپنی اور بدیشی زبانوں کا سہارا لے کر اپنے وقتی مسائل سے چھٹکارا حاصل کرتا ہے۔ اس طرح استعمار اور استعمار زدہ کے درمیان وقت کے ساتھ کئی زبانیں وقوع پذیر ہوتی ہیں اس قسم کی زبان کو انگریزی میں Pidgin زبان کہتے ہیں۔ یہ زبان گوا اور کالی کٹ کی بندر گاہوں پر بولی گئی ہے۔ یہ زبان گرامر کے لحاظ سے آسان رابطے کی زبان ہے۔ عام طور پر یہ میکنزم اس وقت تیار ہوتا ہے جب دو یا دو سے زیادہ گروہوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بننے کے لیے کوئی ایک عام زبان موجود نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے اس معذوری کو دور کرنے کے لیے یہ نظام تیار ہوتا ہے۔ یہ روزمرہ کا معمول ہے کہ تجارت کی غرض سے جب مختلف الزبان کمیونٹیز آپس میں ملتی ہیں تو انہیں ایک ایسے ذریعہ کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے درمیان رابطہ بن سکے اس زبان کو مکمل زبانیں نہیں سمجھا جاتا۔ ایک اور زبان جو مربوط و منظم طریقے سے لوگوں کے درمیان رابطہ کو ممکن بناتی ہے اسے "لنگوافرانکا"(Lingua Franca) یا فرینکش ٹنگ(Frankish Tongue) بھی کہتے ہیں اور اس زبان کو "بائیکولر زبان" بھی کہا جاتا ہے. پوری انسانی تاریخ میں اس نے زیادہ ترقی کی ہے. مذہبی، ثقافتی، سفارتی، انتظامی اور سائنس دانوں کی سہولت اور معلومات کے تبادلہ کے لیے یہ زبان مختلف قومیتوں کے علماء سے لی گئی ہے۔ یہ ایسی زبان ہے جو عالمی زبان کے طور پر کام کر سکتی ہے۔

استعماری ادوار میں بندر گاہوں اور بڑے بڑے تجارتی مراکز پر یہ زبان بولی جاتی رہی ہے۔ اس زبان میں استعماری حلقے کی زبان کے وافر الفاظ موجود ہوتے ہیں لیکن وہ مقامی آبادی جو غیر ملکی حکمران کے ساتھ گفتگو کے عمل میں ہوتی ہے ان کے ہاں الفاظ کم ہوتے ہیں لیکن یہ طے ہے کہ مقامی لوگوں کے پاس اس زبان کا معنوی اور مارفالوجیکل ڈھانچہ موجود ہوتا ہے۔ "کالا پانی" میں استعمال ہونے والی زبان میں بھی حاکم اور محکوم کے درمیان گفتگو اور ابلاغ ایک رشتے میں منسلک ہیں. اور وہ رشتہ ہے ظالم اور مظلوم، حاکم اور محکوم کا۔ یہاں

بھی ہم حاکم اور محکوم کی زبان کا فرق بیان کرنے کے لیے لسانی شعور کو زیر بحث لا رہے ہیں اس گھمبیر صورتحال میں الفاظ کا استعمال و ابلاغ یہ بتاتا ہے کہ لسانی شعور حاکم اور محکوم کے رشتہ میں نظر آ رہا ہے۔

برطانوی سرکار نے اپنی انانیت کو قائم رکھنے اور اپنے غیر ضروری احکامات کی بجا آوری کے لیے مقامی باشندوں سے ایسا سلوک روا رکھے ہوئے تھے کہ دن بدن ان کی بجا آوری مشکل سے مشکل ترین ہوتی گئی جس سے ان لوگوں کی زندگیاں اجیرن کر دی گئیں۔ اور سرکار نے پورے پنجاب کی سرحدوں سے اپنی فوج کو بلا کر ان سرحدی علاقوں میں تعینات کیا جہاں انہیں مدافعت کا خدشہ تھا اور آناً فاناً جنگ چھیڑ دی۔ استعمار زدہ اپنی بقاو سلامتی کے لیے متحد ہوئے اور انہوں نے اپنی مدد آپ کے تحت اپنی حفاظت کی غرض سے انگریز سرکار سے مڈ بھیڑ ہوئے۔ مقامی زعماء اسے اپنی آزادی، عزت و ناموس اور حصول شہادت کے غایت سے مزاحم ہوئے اور جم کر لڑے۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے لارڈ ایلجن اور وائسرائے جنرل چمبرلین کو اس کے انجام تک پہنچایا۔ اس سانحہ کے بعد ہندوستان اپنے گورنر سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ جس پر بعد میں انگریز سرکار اپنی اس زبردستی حملے پر شرمندہ دکھائی دی جس کے نتیجے میں اسے کافی مالی اور جانی نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔[1] مولانا محمد جعفر تھانیسری نے مذکورہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اگر ان الفاظ کے محرکات کا جائزہ لیا جائے تو اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ استعمار زدہ نے استعمار کے خلاف علم بغاوت بلند کیا کیونکہ استعمار نے مقامی باشندوں پر ظلم کی انتہا کر دی۔ استعمار نے ہمیشہ سے اپنی مکاری اور عیاری سے مختلف حیلے بہانوں سے استعمار زدہ کا استحصال کیا۔ کبھی اس نے حفاظت خود اختیاری کے تحت، کبھی عوامی مفاد اور بہبود کی وجہ سے اور کبھی قومی مفاد کے پیش نظر مختلف اقدامات اٹھائے جن کے ذریعے عوام الناس کی حق تلفی کی گئی۔

ادب میں لفظ اور معنی یعنی زبان اور متن یا کنٹینٹ کا باہمی تعلق سے ہی معنویت اور اس معنویت کا عملی زندگی میں استعمال یا اطلاق ممکن ہے۔ لفظ اور ان کے معنی ذیلی سطح پر سماجی، سیاسی یا مذہبی ساختیں ثابت ہوتے ہیں۔ معنویت ایک گہرا تصور ہے۔ جس کا تعلق انسانی وجود کے مختلف پہلوؤں سے ہے۔ جیسے روحانی اور اخلاقی پہلو۔ انسان اندرونی طور پر اپنے تجربات احساسات اور اپنے عقائد سے جڑا ہوتا ہے جو اسے زندگی کو سمجھنے

میں مدد کرتے ہیں۔ مولانا جعفر تھانسیری نے ولایتی افغان اور مخبری کا تذکرہ کیا ہے۔[2] یہ دونوں الفاظ منفی تاثر کے زمرے میں آتے ہیں۔ افغان پٹھان حمیت و غیرت کے علامت سمجھے جاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے رسم و رواج، اپنی قبائلی روایات کے پاسدار ہوتے ہیں۔ ان کا شمار اصلاح پسند، اصول پسند اور جفاکش اقوام میں کیا جاتا ہے۔ جبکہ یہ لفظ "ولایتی افغان" انگریزوں کا آلہ کار، ضمیر فروش اور غدار کے زمرے میں آیا ہے۔ جو انگریز سرکار کا وفادار ہوتے ہوئے معاوضہ کے عوض اسے مسلمانوں کے راز پہنچاتا ہے۔ حالانکہ معنویت انسان کی ذاتی ترقی خود شناسی میں معاون ہوتی ہے۔ وہ اسے محبت ہمدردی باہمی احترام کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔

برطانوی استعمار کے انتظامی آلہ کاروں کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ ہندوستانی زبان و ثقافت میں مخل ہو رہے ہیں لیکن ان کی یہ مداخلت جانبدارانہ اور خود ساختہ تھی۔ اور انہیں اس بات کا اعتراف تھا لیکن اپنے مقاصد کے حصول کے لیے انہوں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں چارلس ٹریلویلین لکھتے ہیں:

"We cannot tell how far and how long this remakable intervention of the Western Nations in Eastern affairs may lead us and I can know from my Indian experience that knowledge of the native language is an indispensable preliminary to understanding and taking an interest in native affairs, as well as to acquiring their goodwill and gaining influence over them„

"ہم نہیں کہہ سکتے کہ مغربی قوموں کی مشرقی معاملات میں یہ غیر معمولی مداخلت کب اور کہاں ہمیں پہنچائے گی اور میں ہندوستان کے اپنے تجربے سے یہ جانتا ہوں کہ مقامی زبان کا علم، مقامی نسلوں کو سمجھنے اور ان میں

دلچسپی لینے کے لیے ابتدا ناگزیر ہے، نیز ان کا خلوص جیتنے اور ان پر برتری
حاصل کرنے کے لیے"[3]

انگریزی زبان کی اہمیت و افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ اس کا شمار بین الاقوامی سطح پر کلیدی زبانوں میں ہوتا ہے۔ برطانوی استعمار نے اسے اپنے نو آبادیاتی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ انتظامی معاملات ہوں یا تعلیمی نظام، تجارتی مقاصد ہوں یا ثقافتی اثر رسوخ کا نفوذ، سیاسی تسلط ہو یا اپنی انانیت کی تسکین ہر جگہ انگریزی کا استعمال کیا گیا۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری لکھتے ہیں کہ اگر آپ جدید علوم سے آگاہی چاہتے ہیں یا زیادہ پیسہ کمانا چاہتے ہیں تو آپ کو انگریزی سیکھنی چاہیے۔ اگر آپ کو انگریزی نہیں آتی تو آپ جدید دور میں بھی پسماندہ ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگر مسلمان اپنے دین سے اچھی طرح آگاہ ہے اور وہ قرآنی تعلیمات کا ادراک رکھتے ہوئے امتداد زمانہ کی ریشہ دوانیوں کو سمجھ سکتا ہے تو وہ انگریزی سے بھرپور فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن اگر اس کے پاس دینی علم نہیں ہے تو انگریزی سے مغربی علوم کا ملحدانہ اثر ہو گا۔ اسے بے ادب اور ملحد بنا دے گی اور اس کا سنورنا مشکل ہے۔[4] استعماری دور میں استعمار نے اسے بطور آلہ استعمال کیا۔ اور اسے اپنے نو آبادیاتی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ تمام شعبہ جات میں اس کے چلن کو لازمی قرار دیا۔ اس لیے استعماری حربے سے مقامی زبانوں کو پسماندہ رکھا گیا۔ زبانوں کا سنگم پورٹ بلئیر کو کہا جاتا ہے کیونکہ ایک ایسی بندر گاہ ہے جہاں پر چالیس سے زیادہ قومیں آباد ہیں اور شاید روئے زمین پر کوئی دوسرا مقام ایسا نہیں ہو گا جہاں پر مختلف زبانوں کی قومیں اتنی بڑی تعداد میں آباد ہوں۔ جو ایک دوسرے کی زبان کو نہ جانتے ہوں اور نہ ہی سمجھ سکتے ہوں۔ یہ جگہ مختلف زبانوں کا عظیم آمیزہ ہے جس سے ان کے اندر لسانی شعور پیدا ہوا۔ اس کی ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جب یہ آپس میں بیٹھتے ہیں تو یہ اپنی اپنی زبان میں بات چیت کرتے ہیں حالانکہ یہاں کی سرکاری زبان انگریزی ہے جبکہ بازاری اور کچہریوں میں ہندوستانی زبان کا چلن ہے کیونکہ یہاں آکر وہ ہندوستانی زبان سیکھ لیتے ہیں اس زبان کے بغیر یہاں گزارا ممکن نہیں۔ یہاں کی ایک خوبصورت بات یہ بھی ہے کہ یہاں مختلف علاقوں، قوموں اور زبانوں کے لوگ آپس میں شادیاں بھی کرتے ہیں اور مختلف تہواروں میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک بھی ہوتے

ہیں۔ یہاں مختلف تہذیبوں کا مرقع نظر آتا ہے۔ ان کی نجی تقریبات میں مذہبی رسم ورواج، علاقائی ثقافت اور لسانی شعور کا خوب اظہار ہوتا ہے۔ یہاں پر لسانی، سیاسی، سماجی اور مذہبی محرکات کا عجیب امتزاج ہے۔[5]

زبان انسانی شخصیت کی شناخت اور اظہار کا ذریعہ ہے وہ اس کی مدد سے اپنی روایات اور تجربات کو قوت گویائی بخشتا ہے۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری اردو اور فارسی زبانیں جانتے تھے لیکن دوران قید انہوں نے سروپ نامی انگریزی بولنے والے سے ایک سال سخت محنت کے بعد انگریزی سیکھ لی۔ وہ اس قابل ہو گئے کہ وہ انگریزی بولنا، لکھنا، پڑھنا جان گئے اور وہ فارغ اوقات میں افسروں کو فارسی، اردو زبان سکھایا کرتے تھے۔ فارسی اور اردو کو انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے سمجھانے اور ان تراجم کی تصحیح کرتے ہوئے انہوں نے اس میں کافی مہارت حاصل کر لی۔ جس سے ان کی انگریزی کی استعداد کار میں کافی اضافہ ہو گیا۔ اس قابلیت سے انہوں نے ہزاروں روپیہ کمایا اور میجر پراتھرو جیسے کئی انگریز ان کے شاگرد ہوئے۔ انہوں نے پورٹ بلئیر کی آئینی کتاب مرتب کی جسے گورنمنٹ کی منظوری کے بعد شائع کیا گیا۔ وہ رد استعماری نظریہ کے حامی تھے انہوں نے دوران قید بھی مسلم امہ کے لیے اپنی خدمات جاری رکھیں۔ مختلف قسم کے قیدیوں کے لیے انگریزی میں درخواستیں لکھیں اور ان کے مقدمات کے جوابات لکھے جن سے بہت سارے قیدیوں کو فائدہ ہوا۔ اسی زبان سے انہوں نے دنیا و جہاں کے علوم تک دسترس حاصل کی اور اپنی قابلیت میں اضافہ کیا اور انہوں نے استعمار کو خوب پڑھا کیونکہ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب "MusalmansOur Indian" نے پورے ہندوستان میں تہلکہ مچایا ہوا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ انگریز سرکار اس سے مرغوب ہوتے ہوئے مسلمانوں کے مخالف ہوئے۔ انہوں نے سات روپے میں کلکتہ سے جلد طبع دوم منگوائی اور مطالعہ کیا۔ اور وہ لکھتے ہیں کہ اگر کوئی انگریز اس کتاب کو پڑھ لیں تو وہ ساری عمر کے لیے مسلمانوں کے جانی دشمن بن جائیں گے۔ اور وہ سب اسی صورتحال سے نبرد آزما تھے۔ [6] استعماریت نے انسانیت کی خوب تذلیل کی۔ ان کی مقامی زبان کو دبایا گیا اور ان سے ان کی شناخت چھین لی۔ خود اعتمادی اور خود مختاری سے محروم کر دیا گیا۔ لیکن لسانی شعور کی بدولت وہ تمام واقعات و محرکات سے آگاہ ہوئے

رد استعماری لسانی شعور سماجی سطح پر بہت ساری تبدیلیوں کا پیش خیمہ بنا۔ مقامی زبانوں میں تعلیم پانے والے طلباء پسماندہ رہے۔ انہیں سماجی سطح پر وہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی جو کہ بدیشی زبانوں کے طلباء کے ہاتھ آئی جس نے سماجی سطح پر ایک طبقاتی تفاوت پیدا کیا۔ بدیشی زبانوں کی بالادستی اور مقامی زبانوں کی پستی نے استعمار اور استعمار زدہ کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج پیدا کر دی۔ اس ابہام نے اختلافات کو جنم دیا اور رکاوٹیں بڑھتی چلی گئی اور یہ سماجی تقسیم نے معاملات زندگی کو مزید گمبھیر کر دیا۔ مقامی زبانیں اپنے پرکھوں کی امانتوں کی امین ہوا کرتی ہیں۔ اسلاف کی روایات، رسومات اور قدیم ثقافت کو زندہ رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ مقامی زبانوں کا پختہ ہونا ان کی قومی شناخت کو مزید قوی کر دیتا ہے اور یہ شعور باہمی اقدار کو تحفظ فراہم کرتا ہے جس کی مدد سے اپنی شناخت برقرار رکھ سکتا ہے۔ مقامی زبانوں کے تحفظ اور اس کی ثقافت کے اظہار کے لیے دنیا میں مختلف زبانوں کے لیے مختلف تحریکیں کام کر رہی ہیں۔ پاکستان میں اردو تحریک، بھارت میں ہندی تحریک، امریکہ میں "Native American Language Movement"، سکاٹش میں "Escorts Language Centre" فرانس اور سپین میں رومانی گروہ سے وابستہ زبان "کیٹلان" جبکہ نیوزی لینڈ کی "ماوری" ہے۔ یہ مقامی زبانوں کی تحریکیں ہیں جو اس کی شناخت اور تحفظ کے لیے محو سفر ہیں۔ رد استعماری جدوجہد میں مقامی زبانوں کی بحالی کے لیے میڈیا کا کردار بہت اہم رہا استعمار زدہ کی آگاہی، نصاب تعلیم میں شمولیت یا سرکاری طور پر پزیرائی سب کے لیے پیش پیش رہا۔ استعمار نے اپنی زبان کے ذریعے مقامی مذہبی تعلیمات پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ استعمار نے مذہبی تعلیمات میں تحریف کی۔ بدیسی زبان ہونے کے سبب استعمار زدہ کی رسائی محدود ہونے سے اس کی تبلیغات میں مشکلات پیش آئیں۔ رد استعماری کاوشوں سے مذہبی متون کے مقامی زبانوں میں تراجم کیے گئے جس کی وجہ سے استعمار زدہ کے درمیان زبانوں کی قدر بڑھی۔ جس سے لسانی مذہبی شعور بڑھا۔ اس سے پہلے بدیشی زبانوں میں مذہبی رسومات کی ادائیگی ہونے لگی جس سے بدیسی اثرات شامل ہوئے۔ لیکن جب مقامی زبانوں میں تراجم کی دستیابی سے پیدا کردہ مذہبی ابہام ختم ہوا جس سے نئی نسل میں مذہبی تعلیمات اور مقامی زبانوں کی اہمیت کا احساس پیدا ہوا۔ تعلیمی اداروں میں بدیسی زبان مروج تھی جس کی وجہ سے مذہبی تعلیمات کی تشریح اپنی مرضی سے کی گئی۔ مذہبی نصاب تعلیم

میں تبدیلیوں کی وجہ سے بدیسی ثقافت کا نفوذ ہوا۔ استعمار زدہ نے اپنی مذہبی شناخت کو برقرار رکھنے کے لیے مذہبی تعلیمات کو مقامی زبانوں میں ڈھالا جس سے تعلیمی نظام میں بہتری آتی گئی۔ بدیسی زبانوں میں تبلیغات کی وجہ سے مقامی سطح پر ان کی پذیرائی زیادہ ہونے لگی جبکہ مقامی مذہبی رہنماؤں کی قدر کم ہونا شروع ہو گئی تھی لیکن جب مذہبی مواد کو مقامی زبانوں میں ڈھالا گیا تو استعمار زدہ کے اندر اس کی حفاظت کا احساس پیدا ہوا اور انہوں نے مقامی روایات کو ان تعلیمات میں ڈالنے کی کوشش کی۔

زبان ہی وہ کلید ہے جس کی مدد سے کسی بھی معاشرے کی تہذیب و ثقافت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کی تہذیب و ثقافت سے اگاہی کے لیے مشرقی زبانوں کا سہارا لیا گیا۔ کیونکہ یہی وہ ذریعہ تھا جو اس کی معاشرت، تاریخی ورثہ اور سماجی نظام تک رسائی پا سکے۔ میکس مولر لکھتے ہیں:

> "It would have been next two impossible to discover any traces of relationship between the swarthy nations of India and their conquerors, whether Alexander or Clive, but for the testimony borne by language."

> "زبان ہی ہندوستان کی سیاہ فام اقوام اور ان کے پرانے, نئے فاتحین سکندر یا کلائیو کے درمیان رشتوں کے سراغ کی سب سے معتبر شہادت مہیا کرتی ہے"[7]

برطانوی استعمار نے یہ تمام کوششیں اس اعتقاد کے ساتھ کیں کہ وہ اس کی تہذیب و ثقافت کو کھوج لے گا تاکہ اس میں یورپی تہذیبی عناصر شامل کیے جا سکیں۔ اس نے یہ کام انتہائی تندہی سے کیا اور وہ اس میں کامیاب رہا۔ اس نے اس خطے کی تاریخ کی تشکیل نو یورپی نقطہ نظر سے کی اور اسے اپنے کارندوں کے ذریعے پھیلایا لیکن اسے ایک اور اندیشہ پیدا ہو گیا کہ یورپی تہذیبوں کے اثرات انتہائی تیزی سے ہندوستان میں وقوع پذیر ہو رہے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ان اثرات کو مقامی سطح پر اپنے ثقافت اور تمدن کے خلاف سمجھتے ہوئے یہ دوبارہ واپس اپنی اصلی ثقافت

اور شناخت کو نہ ڈھونڈنے لگیں۔ یا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں اپنی تہذیب و ثقافت، روایات یا اپنی تاریخ کو محفوظ کرنے کا خیال نہ آجائے اور وہ اسے محفوظ کرنے کی کوشش نہ کریں اس لیے اس چیز کا بھی خیال رکھا گیا کہ استعمار زدہ کے مستند متون نئی یورپین شناخت کو ضائع کرنے کا باعث نہ بنیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی ساری محنت ضائع نہ ہو جائے۔ اس خطرے کا حل یہ نکالا گیا ہے کہ برطانوی استعمار مشرقی تہذیب و ثقافت کے ساتھ زبان و علم کا بیڑا اٹھاتے ہوئے اسے بنائیں اور اس کی اشاعت کریں اس حوالے سے عیسائی مشنری ولیم کیری کی خدمات لی گئی اور ان کے سپرد کیا گیا اور انہوں نے اپنے اس مشن کو کماحقہ پورا کیا۔

نگوگی واتیونگو کینیا کے ادیب، مفکر اور "Decolonizing the Mind" کے مصنف تھے۔ فینن کے بعد بڑا ردنو آبادیاتی مفکر تھے۔ کینیا بھی برطانوی نو آبادیات رہ چکا ہے۔ رد استعمار پر ان کے نظریات بالکل واضح ہیں۔ وہ یورپی مرکزیت کو رد کرتے ہیں اور ثقافتی بالادستی پر یقین رکھتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ اصل میں مقامی ثقافت ہی حقیقی آزادی ہے۔ لسانی استعماری تصور جس میں انگریزی زبان کو تمام زبانوں پر فوقیت دی گئی وہ اس تصور کی بھی نفی کرتے ہیں۔ ان کی کتاب میں چار مضامین شامل ہیں نگوگی کا ردنوابادیاتی نظریہ واضح طور پر سامنے آیا۔ نگوگی ثقافتی آزادی کو حقیقی آزادی خیال کرتے ہیں اور وہ یورپی مرکزیت کے اس تصور کی بھی نفی کرتے ہیں جو ثقافتی بالادستی پر مشتمل ہو۔ انہوں نے لسانی استعماریت کو موضوع بنا کر زبان کے استعماری تصور کو بھی رد کیا اور جس کے مطابق انگریزی کو دیگر مقامی زبانوں پر برتری دی جاتی ہے۔[8]

باب دوم:

حوالہ جات

1. محمد جعفر تھانیسری، ڈاکٹر، "کالاپانی المعروف تواریخ عجیب"، محمدن اینگلو اورینٹل پریس، لاہور، 1879ء، ص:10
2. ایضاً، ص:10
3. ولیمز اینڈ نورگیٹ، "The Languages of the seat of war in East"، (پیش لفظ)، لندن، 1855ء، ص iv
4. محمد جعفر تھانیسری، ڈاکٹر، "کالاپانی المعروف تواریخ عجیب"، محمدن اینگلو اورینٹل پریس، لاہور، 1879ء، ص78
5. ایضاً، ص:92
6. ایضاً، ص:92
7. نیر، ناصر عباس، "مابعد نو آبادیات اردو کے تناظر"، اوکسفرڈ، پریس، لاہور، ص:143
8. ماہنامہ قومی زبان، کراچی، نومبر 2020ء، ص:92

باب سوم: منتخب اُردو آپ بیتیوں میں رد استعماری تشخص کا مطالعہ

(سیاسی، سماجی، مذہبی محرکات واثرات)

رد استعماری تشخص کا مطالعہ نو آبادیاتی ادوار میں پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کو سمجھنے میں مدد کرتا ہے۔ ان ادوار میں ثقافتی، سماجی اور نفسیاتی سطح پر مشکلات کا ادراک رکھتے ہوئے ان کا حل تجویز کرتا ہے۔ اس کا مقصد اس صورتحال کو سمجھنا اور استعمار زدہ کی مدد کرنا ہے تاکہ وہ اپنی شناخت اور وہ خود مختاری کو فروغ دے سکیں۔ استعمار نے اپنے ادوار میں جن طریقوں کو استعمال کرتے ہوئے مقامی ثقافتوں اور استعمار زدہ لوگوں کے حقوق کا استحصال کیا، اس عمل کو اور اس صورتحال کو سمجھتے ہوئے اس کی بحالی اور خود مختاری کے لئے کوششیں کرنا ہے۔ رد استعماری تشخص کے مطالعے میں ان ادوار کا تاریخی تجزیہ، سیاسی صورتحال، سماجی تناؤ اور مذہبی محرکات واثرات کا تجزیہ شامل ہے۔ رد استعماری تشخص کے علمبرداروں میں بہت ساری شخصیات کے نام لیے جاسکتے ہیں جنہوں نے استعماری قوتوں کے خلاف مختلف تحریکوں کی شکل میں اپنی جدوجہد کو جاری رکھا۔ برصغیر سے مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، قائد اعظم محمد علی جناح اور خان عبدالغفار خان شامل ہیں۔ ان میں سے بعض نے عدم تشدد کے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر استعمار کے خلاف تحاریک چلائیں۔ انہوں نے اپنے ادوار میں استعمار زدہ کے حقوق کی اواز کو بلند کیا۔

اسی جدوجہد کے سالار جنوبی افریقہ کے ہر دل عزیز لیڈر نیلسن منڈیلا ہیں۔ جنہوں نے ایک طویل جدوجہد کے بعد استعمار کی نسلی علیحدگی کے سرکاری پالیسی کو ختم کروایا۔ جسے اپارتھائیڈ-(Apartheid) کہا جاتا ہے اور یہ پالیسی 1948 سے 1994 تک نافذ رہی۔ یہ وہ ظالم نظام تھا جس نے افریقہ کے معاشرے کو اپنے چنگل میں جکڑا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے استعمار کو سیاسی اقتصادی اور سماجی سطح پر برتری حاصل رہی۔ اس پالیسی

نے پورے افریقی ممالک کو نسلی درجہ بندی میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ ان، کے رہائشی علاقے الگ تعلیمی ادارے الگ، ہسپتال الگ، جہاں پر انہیں زبردستی پسماندہ رکھا گیا۔ انہیں واجبی سے شہری حقوق دیے گئے تاکہ وہ استعمار کے مقابلے میں احساس کمتری میں مبتلا رہیں۔ انہیں سیاسی حقوق نہ ہونے کے برابر تھے اور انہیں ووٹ دینے کا حق بھی حاصل نہیں تھا۔ نسلی امتیاز کو برقرار رکھتے ہوئے انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ مخصوص علاقوں میں رہیں۔ کام کرنے اور سفر کرنے کے لیے انہیں مخصوص اجازت نامے جاری کیے جاتے تھے تاکہ وہ معاشی طور پر پسماندہ رہیں۔ انہیں ملازمتوں سے محروم رکھا گیا۔ نیلسن منڈیلا اور افریقی نیشنل کانگرس نے اس ظلم و بربریت کے خلاف طویل جدوجہد کی اور بین الاقوامی دباؤ اور مقامی مزاحمت کو برقرار رکھا۔ اخر کار انہوں نے اس طویل جدوجہد کا ثمر پایا اور استعمار سے آزادی حاصل کی۔ ہوچی منہ ویتنام کے رہنما تھے جنہوں نے فرانسیسی استعمار کے خلاف جدوجہد کی۔ کوامے نکرومہ غانا کے عظیم رد استعماری لیڈر تھے۔ جنہوں نے اپنی قوم کو برطانوی استعمار سے آزادی دلائی۔ غانا مغربی افریقہ کا اہم ملک اور پہلا ملک ہے جس نے سب سے پہلے استعمار سے آزادی حاصل کی۔ فرانز فینن فرانس کے ایک فکری رہنما، ماہر نفسیات اور انقلابی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ لکھتے ہیں: "ہم یورپ کے خلاف متحد ہو جائیں ہمارا انحصار اپنے بازو اور ذہن پر ہونا چاہیے۔"[1]

فرانز فینن نے استعمار اور رد استعمار کے حوالے سے اپنی کتب میں مختلف تجزیات پیش کیے ہیں جو کہ استعمار زدہ کی منزل کا تعین کرتے ہیں۔ اس طرح کی اور بھی بہت ساری شخصیات ہیں جنہوں نے استعمار کے رد عمل کو چیلنج کیا اور استعمار زدہ کی آزادی اور خود مختاری کے لیے اپنا حصہ ڈالا۔ رد استعماری تشخص کا مطالعہ ایک اہم شعبہ ہے جو نو آبادیاتی دور کے اثرات کو پرکھنے اور پھر استعمار زدہ کی معاونت کے لیے ہے۔ اس تجزیے سے حاصل ہونے والا مطالعہ معاشرتی انصاف، ثقافتی تحفظ اور مقامی لوگوں کے مشکلات میں کمی کا باعث بن سکتا ہے۔ فرانز فینن لکھتے ہیں: "استعمار کی حقیقی شکست پورا معاشرتی ڈھانچہ بدلنے میں ہے"[2]

ہیگل کے فلسفے سے متصل جدلیاتی کشمکش کا تصور فلسفیانہ ہے۔ اس سے معاشرتی ترقی اور تبدیلی کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے اور اس کا سیاست سے بہت گہرا تعلق ہے۔ استعمار نے اپنے سیاسی عزائم کی بجا آوری کے

لیے سرحدی علاقوں میں جنگ چھیڑ دی تھی تاکہ ان پر بھی اپنا تسلط قائم رکھا جائے اور انہیں اپنا مطیع و فرمانبردار بنایا جاسکے لیکن حالات دن بدن گھمبیر سے گھمبیر ہوتے چلے گئے کیونکہ ان کے حامیوں نے بھی ان کے لیے تن من دھن اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے باقی علاقوں میں بھی پکڑ دھکڑ اور ظلم وستم کا بازار گرم ہو گیا۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری نے وقت کی نزاکت کو جانتے ہوئے اور معاملات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے راہ فرار حاصل کی۔[3] لیکن استعمار اور استعمار زدہ کے درمیان موجود جدلیاتی کشمکش جاری رہی جس سے شخصی تشخص مجروح ہوا۔ سیاسی آزادی کو سلب کیا گیا۔ بلاوجہ وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے۔ سینکڑوں گھروں کی تلاشی لی گئی۔ بے شمار مرد و زن کو گرفتار کیا گیا۔ ظلم کی ایسی داستانیں رقم کی گئیں کہ جسے سن کر انسانی دماغ ماؤف ہو جاتا ہے۔ پردہ نشین خواتین کے ساتھ درشت رویہ رکھا گیا ہے۔ سپرنٹینڈنٹ پولیس پارسن صاحب نے گرفتار کیا اور حکم دیا کہ اسے پھانسی کی کوٹھڑی میں قید کر دیا جائے۔[4] استعمار کے حیلے بہانے، مذموم حکمت عملیاں اور سیاسی حربے اپنے عروج تک پہنچ گئے۔ پورے ہندوستانیوں کو ڈرایا دھمکایا گیا۔ مختلف قسم کے اشتہارات شائع کیے گئے۔ رد استعماری عناصر کے خلاف ایک بھرپور اور منظم نفسیاتی جنگ چھیڑ دی۔ مربوط پروپگنڈوں کے ذریعے لوگوں کو "کالا پانی" کی قید سے ڈرایا گیا۔ قیدیوں کو بے آب و دانہ محبوس رکھا گیا۔ دوران قید بیڑی، ہتھکڑی اور طوق پہنا کر اذیت دی گئی۔ ساگ کے موٹے ڈھنڈلوں اور بھالو ملی مٹی کی دو روٹیاں کھانے کو دی گئیں۔[5] تینوں کو الگ الگ کال کوٹھریوں میں بند کر دیا گیا۔ ظلم و تعدی کا بازار ایسا گرم ہوا کہ الحفیظ الامان۔

استعمار کے طرز حکمرانی کے لیے انگریزی کا لفظ "Despotism" استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ ایسی حکومت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو مطلق العنان ہو۔ جسے عوام اور اس کے حقوق کی کوئی پرواہ نہ ہو۔۔ جو انسانی آزادی اور اس کے بنیادی حقوق کی پاسدار نہ ہو۔ جو ریاستی دہشت گردی، ظلم وزیادتی اور بربریت پر مبنی ہو۔ جو کسی بھی قانون یا آئینی پابندی سے ماوراء ہو وہاں حکمران یا اہلکار اپنی مرضی سے فیصلے کرتا ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں تاریخ میں رقم ہیں۔ بلا وجہ لوگوں کو مختلف جرائم میں ملوث کرنا اور پھر ان کو گرفتار کر کے

ہزاروں روپیہ بٹورنا۔ جو روپیہ پیسہ دینے کے قابل نہ ہوں ان کو کال کوٹھری یا پھانسی کی دھمکی دے کر جھوٹا گواہ بنالینا۔ سپرنٹینڈنٹ پولیس پارسن صاحب نے بنگال میں خوب مال کمایا۔ کوئی مسلمان یا مولوی ان کے شر سے محفوظ نہیں رہا۔ اسی طرح سابق کمشنر پٹنہ مسٹر ٹیلر اور ایک پولیس ملازم ایشری پرشاد اسی جرم میں ملازمت سے برخاست کیے گئے۔ یہی پولیس ملازم ایشری پرشاد نہایت ادنی عہدے سے ڈپٹی کلیکٹر بن گیا اور اس نے دھونس اور دھاندلی سے سرکار سے بڑی جاگیر حاصل کیں۔ یہ مقامی استعمار ہے اس کی ساری سرگرمی ہی استعمار زدہ کو دبانا اور کچلنا ہے۔ انہیں استعمار کے پشت بیں کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے ایسے کارنامے انجام دیے کہ وہ آج بھی زبان زد عام ہیں۔ رائی کو پہاڑ اور رسی کو سانپ بنانا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں پر قیامت برپا کی جس کی وجہ سے سینکڑوں مسلمان اپنا گھر بار چھوڑ کر مختلف ممالک کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔[6] کیونکہ مقامی استعمار حق نمک کی ادائیگی میں مصروف عمل تھا اور داروگیر کا سلسلہ مسلسل چل رہا تھا اور انہوں نے خوب مال و اسباب اکٹھا کیا۔ اگر کوئی مٹھی گرم نہ کر سکا تو اسے سرکاری گواہ بنا کر کسی معصوم شخص کو دائم الحبس بھجوا دیا گیا۔ استعمار کے انصاف اور نظم و ضبط کا ڈنڈھورا خوب پیٹا گیا لیکن حقیقت احوال سے سب واقف تھے۔ مولانا جعفر تھانیسری لکھتے ہیں کہ میرے حقیقی بھائی محمد سعید کو میرے خلاف سرکار نے بطور گواہ تیار کیا۔ اسی طرح محمد شفیق کے حقیقی بھائی محمد رفیق کو مار پیٹ اور پھانسی کی دھمکی دے کر ان پر گواہ مقرر کیا۔ یہ نظر کشاء واقعات استعمار اور مقامی استعمار کی قانون شکنی کی قلعی کھولتے ہیں اور ساتھ ہی برطانوی استعمار کے لارڈ اینڈ آرڈر کی خلاف ورزی کے بارے میں آگاہ کرتے ہیں کہ وہ کس انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ قانون اور انصاف ان کے گھر کی لونڈی بن چکا تھا۔[7] مولانا محمد جعفر تھانیسری لکھتے ہیں کہ برطانوی بربریت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ظلم و جبر سے میرے ہاتھوں کے پروردہ بچے عباس کو میرے اوپر گواہ مقرر کیا گیا۔ اور وہ اس تمام کاروائی پر انتہائی مغموم ہوا۔

انگریز سرکار کا ہندوستان میں قانون اور اس پر عمل کے لیے قانونی اصولی بنیادوں سے انحراف کیا گیا۔ عوام الناس کو انصاف مہیا کرنے کے لیے قانون و انصاف سے روگردانی کی گئی۔ جب انصاف کے محافظ قانون و

انصاف کی دھجیاں بکھیریں تو ایک عام آدمی کدھر جائے۔ کھلے بندوں ججوں کے الفاظ باعث تشویش ہیں۔ عدالتوں میں مدعاعلیہان کی طرف سے ثبوتوں کے ساتھ مدلل جواب جمع کروایا گیا تو جج کے چہرے پر غصے کے تیور عیاں تھے۔ اور کہا معافی مانگو! تعصب کا یہ عالم تھا کہ قانون طاق پر رکھ دیا گیا ہے۔ فیصلہ سنایا کہ تمہیں پھانسی دی جاوے گی تمہاری کل جائیداد بحق سرکار ضبط ہو گی تمہاری لاش وارثوں کو نہ دی جائے گی بلکہ اسے انتہائی ذلت کے ساتھ گورستان جیل میں گاڑ دی جائے گی۔ [8] رد استعماری مذہبی تشخص کو پورے زور بازو سے کچلنے کی کوشش کی گئی۔ چیف کوٹ جوڈیشنل کمشنر کے سامنے ہمارے کیس کو پیش کیا گیا۔ وکیل مسٹر پلوڈن نے بھرپور انداز سے کیس کو پیش کیا اور بتایا کہ زیر دفعہ 121 کے تحت ان لوگوں کو ہرگز قید نہیں کیا جا سکتا۔ دلیل قانونی اور ضابطے کے مطابق تھی۔ اسے تسلیم کرنا پڑا لیکن مشورہ کرنے کے لیے چند روز کے لیے اجلاس ملتوی کیا گیا۔ کے بارے میں بعد میں "کالا پانی" کی سزا سنائی گئی۔ اس کی ایک مثال محمد شفیع کی ہے۔ جسے دلائل اور ثبوت کے بعد غصہ سے پھانسی اور 50 لاکھ کے جائیداد ضبطی کا حکم دیا گیا۔ پھر ایک برس بعد گواہی کا بہانہ کر کے اسے رہا کر دیا گیا۔ لیکن بحق سرکار ضبط کی گئی جائیداد کو واپس نہ کیا گیا۔ [9] انگریزی قانون کی دھجیاں اڑائی گئیں۔ جیل میں تشدد اور جسمانی سزاؤں کی انتہا کر دی گئی۔ سپرنٹینڈنٹ جیل ڈاکٹر گرے نے حکم دیا ہے کہ ان کے پاؤں میں آڑا ڈنڈا ڈال دیا جائے۔ یہ حکم تعصب کی ایک مثال تھا۔ اڑا ڈنڈا جو ایک فٹ سے زیادہ لمبا نہ تھا اور یہ ہم نے پوری جیل میں کسی قیدی کے پاؤں میں نہیں دیکھا۔ اس سے نہ صرف چلنا پھرنا بہت مشکل تھا بلکہ بیٹھنا اور لیٹنا بھی دشوار ہو گیا۔ انگریزوں نے انسانیت سوز سلوک کی انتہا کر دی۔ پرانے وقتوں میں جانوروں کی شناخت کے لیے ان کے جسم کو داغا جاتا تھا یعنی نشان زدہ کیا جاتا تھا تا کہ اس کی پہچان کی جا سکے۔ لیکن انگریزوں نے انسانی ذلت اور رسوائی کی انتہا کر دی جو بھی دائم الحبس کی سزا پاتا اس کی پیشانی پر اس کا نام، جرم اور دائم الحبس کندہ کر دیا جاتا ہے۔ [10] لیکن یہ حکم ہمارے جانے سے کچھ عرصہ پہلے موقوف کر دیا گیا۔

رد استعماری تشخص کے خاتمے اور ان کی تائید میں اٹھنے والی آوازوں کو دبانے کے لیے مختلف ہتھکنڈوں کا سہارا لیا گیا۔ اس جدوجہد میں رسائل و اخبارات کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انہوں نے اپنے محدود

وسائل سے ان کاوشوں کو جاری رکھا۔ حسرت موہانی کے رسالے "اردو معلی" کا شمار بھی اِنہی میں ہوتا ہے۔ اس کی بہت ساری مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ رسالہ اردو معلی جہاں اس نے اپنے قارئین کی ادبی ضرورت کو پورا کیا وہاں اس نے عوام الناس کو سیاست سے آگاہی کے لیے استعمار کی چالوں کو واشگاف کیا اور سماجی سطح پر رائے عامہ ہموار کرنے میں کامیاب رہا۔ اس میں تحریک آزادی اور برطانوی استعمار کے خلاف وقفے وقفے سے مختلف مضامین شائع ہوتے رہے۔ مولانا حسرت موہانی کی ہمت وجرات نے محکوم لوگوں میں جذبہ بیداری پیدا کیا۔ استعمار مولانا کی ان کاوشوں سے ناخوش تھا۔ مولانا اپنے رسالے کی بدولت لوگوں میں آزادی کے جذبے کو متحرک کرتے رہے۔ اس نے مولانا کی جدوجہد کو روکنے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے۔ مختلف سطحوں پر مولانا صاحب کو ڈرایا دھمکایا گیا اور ان کی جاسوسی کی گئی۔ اپنے طبعی خواص کی وجہ سے مولانا ان تمام ہتھکنڈوں سے آگاہ تھے۔ آخر کار برطانوی استعمار نے 23 جون 1908ء کو ایڈیٹر رسالہ اردوئے معلٰی پر بغاوت کا مقدمہ قائم کر دیا۔ مولانا حسرت موہانی نے بے باک انداز میں اپنی فکر اور آزادی کی جدوجہد کا دفاع کیا۔ آزادی رائے اور برطانوی استعمار کے ظلم و استبداد کا پول کھول دیا۔ حکومت مدعیت میں پولیس میں جھوٹی رپورٹ درج کی گئی۔ مولانا کو صفائی پیش کرنے کا موقع نہ دیا گیا۔ بغض وعناد کا یہ عالم تھا کہ خود ہی مولانا پر الزام لگایا، خود ہی جھوٹی رپورٹیں اکٹھی کیں اور بغاوت کا مقدمہ قائم کیا۔ وارنٹ گرفتاری جاری کر کے اُنہیں پابند سلاسل کیا۔[11] ڈھٹائی کا یہ عالم کہ خود ہی منصف بنے اور سزا دی۔ دراصل یہ برطانوی استعمار کا ایک حربہ تھا وہ آزادی کے متوالوں کو دبانے ڈرانے اور انہیں سبق سکھانے کے لیے کیا گیا۔ یورپین مجسٹریٹ علی گڑھ نے انتہائی قلیل مدت میں 4 اگست 1908ء کو مقدمے کا فیصلہ سناتے ہوئے دو سال قید بامشقت اور 500 روپے نقد جرمانے کی سزا سنائی. دراصل یہ مقدمہ مولانا کو راہ راست سے ہٹانے اور کتب خانہ اردوئے معلی کو برباد کرنے کا عندیہ تھا کیونکہ یہ سزا بڑے بڑے مجرموں کو بھی نہیں دی جاتی جو کہ مولانا صاحب کو دی گئی۔ برطانوی استعمار کی تہذیب و تمدن، علم دوستی کا پردہ اس وقت چاک ہوا جب انہوں نے جرمانے کے عوض انتہائی نادر اور نایاب کتب پر مبنی یہ ذخیرہ برباد کر دیا گیا اس کا اندازہ حکومت وقت کے رویے اور اس کے احکامات سے معلوم ہوتا ہے۔ برطانوی قانون میں اہل حرفہ کے اوزار پیشے کے مطابق بوقت نیلامی مستثنیٰ قرار دیے گئے۔ لیکن اہل علم و

دانش پر قانون کو مفقود کر دیا گیا۔ مولانا حسرت نے انتہائی محنت اور عرق ریزی سے نایاب قلمی نسخوں اور دواوین کو جمع کیا تھا جو کہ ان کے کتب خانہ کی زینت تھے۔ اور جن کی نقل بھی کسی دوسری جگہ سے نہیں مل سکتی۔ حکومتی کارندوں نے ٹھیلوں میں بھر بھر کر اس طرح لے گئے کہ جس طرح لکڑی یا بھس کو لے جاتے ہیں۔ ان کتابوں کی فہرست بنانا تو درکنار انہیں گنا بھی نہیں گیا۔ بے قدروں کے ہاتھوں 60 روپے میں فروخت کر دیا گیا۔ حالانکہ اگر اس کی مجموعی قیمت لگائی جائے تو وہ تین چار ہزار روپے سے زیادہ بنتی تھی۔ کیونکہ مقصود تباہی وبربادی تھا اس لئے یہ ظلم روا رکھا گیا۔[12]

مولانا حسرت موہانی ظلم وزیادتی اور علم دوستی کی ایک اور مثال تحریر کرتے ہیں کہ جب میں آلہ آباد جیل میں وارد ہوا تو انتہائی غلیظ اور بدبودار کپڑے پہننے کے لیے دیے گئے اور معائنے کے بعد میری عینک کو بھی داخل دفتر کر دیا گیا حالانکہ سپرنٹینڈنٹ جیل علی گڑھ نے معائنے کے بعد عینک لگائے رہنے کی اجازت دی تھی۔ دوران اسیری میرے پاس کچھ اخبار ورسائل، کتابوں اکٹھی ہو گئیں تھیں جن میں دیوان حافظ بھی تھا اور کچھ میرے کپڑے بھی تھے جنہیں پوٹلی بنا کر میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ جیلر صاحب نے مجھے غضب ناک قہر آلود نظروں سے دیکھا اور دفتر حاضر ہونے کا حکم دیا۔ ان کے حکم کے مطابق تمام اخبارات ورسائل اور کتابوں کو آگ لگا کر خاکستر کر دیا گیا۔ دفتر حاضری پر متنبہ کیا گیا کہ یہاں ٹھیک رہو گے تو ٹھیک ورنہ بیمار بنا کر ہسپتال بھیج دیے جاؤ گے اور وہاں پر تمہیں مار کر خاک کر دیا جائے گا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حکومتی اہلکار کا ایسا رویہ کسی دائرہ قانون میں آتا ہے۔ یقیناً نہیں۔ یہ رویے ماورائے قانون ہیں لیکن "عذر" پیش کرنے پر انتہائی تذلیل اور مار پیٹ کی جاتی ہے۔[13]

جس سماج میں اس طرح کے رویے رکھے جائیں وہاں پر زندگی گزارنا محال ہو جاتا ہے۔ مولانا حسرت موہانی لکھتے ہیں کہ ہم نے روانگی علی گڑھ جیل سے آلہ آباد جیل تک کا سفر بھوک پیاس سے کیا۔ دوسرے دن صبح کے وقت بھنے چنوں کے سوا کچھ نہ ملا۔ میرے والد محترم کو میری گرفتاری پر بہت رنج تھا۔ انہوں نے آلہ آباد جیل میں مجھے ملنے کے لیے درخواست کی۔ جو کہ منظور نہیں کی گئی۔ آخر کار انہیں واپس آنا پڑا اور میری

عدم موجودگی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اور مجھے اس سانحہ ارتحال کی خبر تک نہ ہوئی۔ جب میں جیل سے رہائی کے بعد واپس آیا تو میرے عزیز و اقارب نے مجھے بتایا کہ جب انہیں ملاقات کی اجازت نہ دی گئی تو اس کے بعد ان کی طبیعت دن بدن بگڑتی چلی گئی۔ وہ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے اور راہی اجل ہوئے۔[14] مولانا حسرت کی گرفتاری نے مستضعفین اور مظلومین کے دلوں میں حوصلہ پیدا کیا اور یہ حوصلہ دن بدن بڑھتا چلا گیا۔ بچوں، نوجوانوں اور بوڑھوں کے ساتھ خواتین نے بھی اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ اس ظلم و بربریت کے خلاف مولانا کی بیوی کی طرف سے بھی حوصلہ افزائی کی گئی ان کے الفاظ کچھ یوں ہیں:-

"تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو. میرا یا گھر کا مطلق خیال
نہ کرنا. خبردار! تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار ہو"[15]

جس قوم کی بہو بیٹیوں کے جذبے اتنے عالی ہوں وہ تحریک کیوں کر ماند پڑ سکتی ہے۔ مسٹر تلک کی تحریریں روح کو تازہ اور ہمت کو بلند کر دیتی تھیں ان کی گرفتاری اور جسٹس داور کے فیصلے نے انصاف کا ترازو جھکا دیا ہے۔ مولانا حسرت کو اس کا صدمہ پہنچا اور انہوں نے کبیدہ خاطر ہو کر یہ رباعی پڑھی۔

"اطاعت ہے فرنگیوں کی جس کا دستور

کیا خاک انہیں دادگری کا ہو شعور

انصاف کے دشمن کا داد رہے لقب

برعکس نہند نام زنگی کافور"[16]

مولانا حسرت نے ان رباعیہ اشعار میں گہرا طنز کیا ہے ان کا خیال ہے کہ جو فرنگیوں کی پیروی کرتے ہیں وہ لوگ عدل انصاف کے شعور سے فاطر ہیں۔ وہ استعمار کی دوہری شخصیت کے حوالے سے بات کر رہے ہیں۔ استعمار اپنے آپ کو مہذب، منصف، اعلی اقدار اور انصاف کا حامل سمجھتا ہے جبکہ حقیقت میں وہ انصاف کا

دشمن ہے۔ وہ حقیقت اور کردار میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں جیسے سیاہ اور سفید۔ اخری مصر فارسی زبان کا ایک مشہور محاورہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کا نام اس کے برعکس رکھ دیے جائیں۔ جیسے کسی گنوار کا نام "علم دین" رکھ دیا جائے یا کسی بدمعاش، عاصی کا نام "زاہد" رکھ دیا جائے۔ اسی طرح زنگی کا مطلب کالا رنگ اور کافور کا مطلب سفید رنگ کا ہے۔ یعنی یہ محاورہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہوں۔ انہی اشعار کی مصداق، برطانوی استعمار کے اہلکاروں نے ظلم وزیادتی اور غیر منصفانہ عملداری سے معاشرتی بے چینی کو جنم دیا۔ یہی رویہ۔ غیر قانونی سلوک آہستہ آہستہ معاشرتی خلفشار کا باعث بنتا چلا گیا۔ ادنی ملازمین جیل سے لے کر اعلی افسر تک سبھی کا ناجائز، غیر قانونی برتاؤ دیکھ کر انسانیت ششدر رہ جاتی ہے۔ جیل قوانین کے مطابق قیدیوں سے کوئی کام نہیں لیا جا سکتا۔ لیکن یہ گھاس کٹواتے، جھاڑو پھرواتے، پانی بھرواتے حتی کہ غلاموں جیسے کام کرواتے اگر انکار کیا جائے تو سخت مار پیٹ کرتے، گالم گلوچ کرتے ہیں، غیر انسانی سزاؤں سے اس کی تذلیل کی جاتی ہے۔ وہ یہ خیال کرتے کہ اگر اسے سزا ہو یا نہ ہو کم از کم حوالات میں رہ کر ہم اسے زندگی بھر کا سبق دے دیں گے۔ ایک نوجوان حوالاتی نے بتایا کہ میں ڈیڑھ مہینے سے حوالات میں بند ہوں میری کہیں شنوائی نہیں ہے۔ پولیس والے مقدمات ملتوی کرواتے رہتے ہیں اور دوران مقدمہ مجھے بار بار کہا جاتا ہے کہ بچہ اب تم چھوٹ بھی جاؤ گے تو سزا سے زیادہ تو ہم نے تمہیں سزا دی ہے۔[17] رد استعماری حلیفوں کے ساتھ ایسا غیر اخلاقی و قانونی رویہ کہ انسانیت کانپ اٹھے لیکن انہوں نے اپنے ملک کی خاطر، حب الوطنی کے جذبے سے ان مشکلات کو جھیلا۔ شاعر، ادیب، صحافی اور معاشرے کے انتہائی پڑھے لکھے طبقے کے ساتھ اس طرح کا رویہ ناقابل فہم تھا۔ وہ کون سی مجبوری تھی جو انہیں غیر مہذبانہ حرکات کی طرف لے آئی۔ مولانا حسرت جب آلہ آباد جیل میں آئے تو انہیں سر پر رکھنے کے لئے ایک ٹوپی، پہننے کے لئے کرتا اور لنگوٹ جبکہ زمین پر بچھانے کے لئے ٹاٹ اور اوپر اوڑھنے کے لئے کمبل پیش کیا گیا اور دو برتن چھوٹا بڑا رفع حاجت کے لئے دیا گیا۔ لنگوٹ ایسا کہ ستر ڈھانپنے کے لیے مناسب نہ تھا۔ لیکن با عمل مجبوری عبادات جاری رہیں۔ جیل میں عموما قیدی کی استعداد کے مطابق مشقت کروائی جاتی ہے۔ تعلیم یافتہ قیدیوں سے گورنمنٹ برانچ پریس یا جیل پریس کی خدمت لی جاتی ہے۔ لیکن مولانا حسرت کے معاملے میں برطانوی استعمار تمام ضابطے اور قوانین

بھول گیا۔ جیل کی سخت ترین مشقت چکی پیسنا ہے۔ مولانا کو امروز سے ہی اس مشقت سے واسطہ پڑا۔ چکی کی مشقت عام قیدیوں سے ایک یا دو ماہ سے زیادہ نہیں کروائی جاتی۔ مولانا کو روزانہ ایک من آٹا پیسنے کی مشقت کرنا پڑی جبکہ عام قیدی 15 سے 20 کلو آٹا پیستا تھا۔ لیکن انہوں نے خندہ پیشانی سے اسے قبول کیا۔[18] اس حوالے سے مولانا نے قید فرنگی کے دوران غزل لکھی اس کا مطلع زبان زد عام ہے:-

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مصیبت بھی

اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی[19]

صاحب علم لوگوں کے ساتھ جاہلانہ، غیر مساویانہ اور غیر اخلاقی رویہ مہذب قوموں کا شعار نہیں ہے۔ یہ لوگ انتہائی زیرک اور حساس طبیعت ہوتے ہیں۔ ان کی قدر دانی معاشروں کے لیے بہتری کے اسباب مہیا کرتی ہے۔ یہ معاشرے کے لیے فعال اور کارامد ہوتے ہیں۔ سرکاری اہلکاروں کی مدد سے ان کی پکڑ دھکڑ اور پھر جیل میں غیر قانونی و غیر انسانی سلوک باعث تشویش ناک ہوتا ہے لیکن استعمار نے ان تمام حربوں سے معاشرتی سطح پر اپنے آپ کو ننگا کر دیا۔ اس نے داد رسی اور انصاف پسندی کا افسانوی ڈھونگ رچایا۔ حالات سلجھنے کی بجائے الجھتے رہے۔ کیونکہ دوہرے معیارات کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ انسپکٹر جنرل کے دورہ جیل کو جھنڈ یلی کہتے ہیں۔ اور یہ دورہ محض ایک ڈھونگ ہوتا ہے۔ یہ ایک رسمی کارروائی ہے جسے مہذب، انسانیت پسند اور منصف پسندی کے زمرے میں لیا جاتا ہے۔ ادنی ملازم سے لے کر انسپیکٹر جنرل تک سب کے سب بے رحم اور بے پرواہی کا شکار ہیں حالانکہ اس کارروائی میں اس کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ بلکہ یہ ڈھونگ رچانے کے لیے ظلم و بربریت کی انتہا کر دی جاتی ہے۔ انسپیکٹر جنرل کے دورے سے ڈیڑھ دو ماہ پہلے مختلف پریڈ کے ذریعے جیل کے قواعد کی تیاری کروائی جاتی ہے جو کسی قیامت سے کم نہیں۔ نائب جیلر ہاتھ میں ہنٹر لیے بے رحمی سے دھاڑتا اور مارتا ہے۔ دورے سے ایک روز قبل اپنے دارڈرون کے ذریعے منادی کراتے ہیں کہ اگر کوئی عذر پیش کرنا چاہتا ہے تو پہلے ہم سے کر لیں۔ " آ بیل مجھے مار " کے مترادف ہے۔ یہ اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے کے

مترداف ہے۔ اس سفاکانہ رویے کے سامنے کوئی قیدی چوں نہیں کرتے. معائنے کے دوسرے دن رجسٹر پر یہ عبارت لکھ دی جاتی ہے:- "سب قیدی خوش ہیں کسی کو کچھ شکایت نہیں ہے۔ انتظام بہت اچھا ہے"[20]

برطانوی استعمار کے غرور و تکبر کا اندازہ اس مثال سے لگایا جا سکتا ہے۔ صوبہ جات متحدہ کونسل میں اردوے معلیٰ کے مقدمہ میں مشہور بھارتی وکیل اور سیاستدان بابو گنگا پرشاد ورما پیش ہوئے۔ انہوں نے اپنی قانونی مہارت کا استعمال کرتے ہوئے مولانا حسرت کا بھرپور دفاع کیا اور ان کے حق میں مضبوط دلائل پیش کیے۔ انہوں نے حکومت وقت سے سوال کیا کہ اردوئے معلی کے یہ مضامین گورنمنٹ کی نظر سے گزرے ہیں؟ کیا ان کی تحقیق کی جائے گی؟ انسپیکٹر جنرل جیل خانہ جات مسٹر سی بی ویٹ(C.B.Vate) نے انتہائی تفخر سے جواب دیا کہ گورنمنٹ کے نزدیک ان مضامین کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ان کے متعلق نہ کوئی تحقیقات کی گئی ہیں اور نہ ہی آئندہ کی جائیں گی۔ انسپیکٹر جنرل کا تحمکانہ لہجہ تمام کارگزاری کی قلعی کھول دیتا ہے۔ ایک معمولی قیدی معمولی اہلکار سے عذر پیش نہیں کر سکتا تو افسران بالا کی کیا بات ہے۔[21]

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کا پورا نام ولیم ولسن ہنٹر اور ان کا تعلق سکاٹ لینڈ سے تھا جو کہ اب برطانیہ کا حصہ بن چکا ہے۔ ان کی شہرہ آفاق کتاب "our Indian musalmans" کلکتہ سے 1871ء کو شائع ہوئی۔ دراصل یہ کتاب وہ رپورٹ ہے جو کہ ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے انگریز سرکار کا ملازم ہونے کی حیثیت سے برطانوی عہدے داروں کی آگاہی کے لیے لکھی۔ اس رپورٹ نے انگریزوں کے دلوں پر صمیم قلب کی مہر ثبت کی کیونکہ اس کا جاودانہ اثر بعد کے حالات و واقعات سے ظاہر ہے۔[22] ڈاکٹر ہنٹر کا مطلب مسلمانوں کی حالت زار اور ان کے مسائل پر روشنی ڈالنا تھا۔ ان کی تعلیمی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کو بہتر کرنے اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے مناسب اقدامات کا بندوست کرنا تھا۔ یہ حکومتی نقطہ نظر تھا جس کا پرچار بڑی شد و مد سے کیا گیا حالانکہ حالات اس سے کہیں مختلف تھے۔ڈاکٹر ہنٹر کی اس رپورٹ نے معاشرتی ابتری میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ نظریاتی کش مکش میں اضافہ ہوا۔ استعماری کارندوں نے تعصب کی عینک پہن لی۔ حکومتی عملداری میں کیے گئے اقدامات سے بخوبی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کیونکہ ڈاکٹر ہنٹر کی رپورٹ استعمار کے نظریاتی بنیاد بنی۔ اس

رپورٹ کے بعد وہابیوں کو نشانہ بنانے کے لیے مختلف اقدامات اٹھائے گئے۔ ان پر نظر رکھی جانے لگی۔ علمی اور مذہبی سطح پر وہابیوں نے اپنے لٹریچر میں اس کا کھل کر اظہار کیا۔ اپنے مذہبی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے سب سے زیادہ رد استعمار کے طور پر سامنے آنے والی قوم میں شمار ہونے لگا۔ وہابیوں کی بنیاد شرعی ہیں وہ استعمار کے بالواسطہ مخالف اور ہندوستان کی آزادی کے خواہاں ہیں۔ یہ ایک نظریاتی جنگ تھی جو ہنٹر کی رپورٹ میں سامنے آئی حالانکہ سرکاری عملداری کے دوران وہابیوں نے انگریز سرکار کا ساتھ دیا اور فسادات میں انگریزوں کے بیوی بچوں کو باغیوں سے بچایا۔ اپنے گھروں میں پناہ دی لیکن اس رپورٹ نے دو قوموں کے درمیان تعصب اور نفرت پیدا کر رکھی تھی۔[23] ان کے بارے میں ڈاکٹر ہنٹر لکھتے ہیں:-

> "اس جماعت نے بہت سا ادب پیدا کر دیا ہے جو انگریز حکومت" کے زوال کی پیش گوئیوں سے پر اور ضرورت جہاد کے لیے وقف ہے۔ ان کتابوں کے محض نام ہی سے ان کے تمام کمال باغیانہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ میں ذیل میں 14 کتابوں کی فہرست دیتا ہوں بعض تو ان میں سے حد سے زیادہ اشتعال انگیز ہیں۔"[24]

پوری دنیا سیاسی کشمکش کا شکار تھی اور اکثر ممالک سیاسی، سماجی اور اقتصادی مشکلات میں گھرے ہوئے تھے اور آپس کی گروہی تقسیم جاری تھی۔ یورپی استعمار اپنی طاقت کے نشے میں مدہوش تھا اور اپنی وسعت ووسائل کے لیے مزید چارہ جوئی کے لیے مہمات کا انتخاب کر رہا تھا کہ اچانک گاوریلو پرنسپ جس کا تعلق سربیا کی قوم پرست اور آزادی کے لیے سرگرم خفیہ تنظیم "بلیک ہینڈ" سے تھا۔ 28 جون 1914ء کو آسٹریا ہنگری کے ولی عہد اور ان کی اہلیہ کو سراجیوو میں قتل کر دیا۔ ان کا آپس کا اتحادی نظام انہیں جنگ میں شامل کرنے کا باعث بنا اور 28 جولائی 1914ء کو پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا۔ یہ واقعہ یورپ میں کشیدگی اور جنگی وجوہات میں سے ایک وجہ بنا اور یہ جنگ لاکھوں سپاہیوں کے لیے لقمہ اجل اور کروڑوں کے لیے معذوری کا سبب بنی اور آخر کار 11 نومبر 1918ء تک جاری رہی۔ اس کا شمار انسانی تاریخ میں خونریز جنگوں میں کیا جاتا ہے۔ اس جنگ کی وجہ سے برصغیر کے لوگوں میں سیاسی شعور بیدار ہوا۔ برطانوی استعمار کی معاشی پالیسیوں کی وجہ سے معاشی بدحالی پھیلتی چلی گئی جس نے سیاسی ابتری اور امن عامہ کی مخدوش

صورتحال کو جنم دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے برطانوی استعمار کا رویہ استعمار زدہ کے ساتھ انتہائی معاندانہ ہو گیا۔ برطانوی استعمار نے رولٹ ایکٹ 1919ء نافذ کر دیا۔ اس کا نام چیئرمین کمیٹی سر سڈنی رولٹ کے نام پر رکھا گیا۔ ہر قسم کی آزادی اظہار پر پابندی عائد کر دی گئی۔ بغیر مقدمہ چلائے طویل مدت تک قید، لوگوں کی نقل و حمل، اجتماعات اور ہر قسم کی سیاسی سرگرمیوں پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی۔ رولٹ ایکٹ کے نفاذ سے معاشرتی بے چینی میں مزید اضافہ ہوا۔ 13 اپریل 1919ء کو بیساکھی کے دن جلیاں والا باغ امرتسر میں ایک پرامن اجتماع ہو رہا تھا۔ برطانوی افسر جنرل ڈائر نے بغیر متنبہ کیے فائرنگ کا حکم دے دیا اور واحد خارجی گیٹ بند کر دیا گیا۔ جس سے لاشوں اور زخمیوں کے انبار لگ گئے۔ یہ واقعہ برطانوی استعمار کے مظالم کی ایک اہم مثال ہے۔ اس واقعے نے رد استعماری قوتوں میں روح پھونک دی۔ اور ان میں جان آ گئی۔ کانگرس اور دیگر سیاسی تحریکوں نے زور پکڑا۔ عوامی غم و غصہ بڑھتا چلا گیا۔ بین الاقوامی سطح پر اس واقعہ کی شدید مذمت کی گئی۔ اس واقعہ نے تحریک آزادی کو ایک نئی جہت دی۔ جس سے برطانوی استعمار کی مخالفت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ امرتسر میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ اس قانون کے تحت فوج کو خصوصی اختیارات دیے گئے جس کی وجہ سے شہری آزادیوں پر قدغن لگا دی گئی اور جس نے عوام کو برانگیختہ کر دیا۔ سعادت حسن منٹو کا افسانہ "تماشا" 1931ء میں جلیانوالہ باغ کے تناظر میں لکھا گیا۔ انہوں نے عوامی خوف و دہشت کے ساتھ جلسے میں شرکت کو عمدگی سے بیان کیا ہے۔ پہلی جنگ عظیم نے سلطنت عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ مسلمانوں کو اس کا بڑا قلق تھا۔ 1919ء میں جوہر برادران نے تحریک خلافت شروع کی گئی۔ تمام مذہبی اختلافات سے بالاتر ہو کر خلافت تحریک نے گاندھی جی کے ساتھ مل کر عدم تعاون تحریک کا آغاز کر دیا۔ اس تحریک نے استعمار کے احکامات، ان کی نوکریوں اور ان کی مصنوعات کا بائیکاٹ کر دیا۔ جس سے عدم تعاون کے ہنگامے پھوٹ پڑے اور سیاسی حالات ابتر سے ابتر ہوتے چلے گئے۔[25]

استعمار نے اپنی فرقہ وارانہ پولیسیوں کی وجہ سے 1927ء اور 1928ء کو ہندو مسلم فسادات کروائے۔ جس کی وجہ سے برطانوی استعمار کے خلاف انتہائی غم و غصہ کا اظہار آزادی کی تحریک سے شروع ہوا اور وہ دن بدن زور پکڑتا گیا۔ ہندو اور مسلم دونوں اپنی قوموں کے حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے

تھے۔ استعمار نے اپنی پالیسی "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کے تحت دونوں مذاہب کے درمیان تفرقہ پیدا کر دیا۔ جس کی وجہ سے فرقہ وارانہ سیاست میں اضافہ ہوا حالانکہ عرصہ سے مہاسبھا اور مسلم لیگ دونوں مل کر کام کر رہی تھیں۔ کلکتہ، دہلی اور لاہور میں مذہبی جلوسوں، مذہبی رسومات، مذہبی مقامات کی بے حرمتی جیسے واقعات رونما ہوئے جس نے آپس میں تناؤ پیدا کیا۔ بڑی تعداد میں لوگ ان فسادات کی بھینٹ چڑھ گئے۔ بہت سارے بے گھر ہو گئے اور انہیں مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ قومی تحریکوں پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ استعمار نے اس مسئلے کو حل کرنے کی بجائے اپنی پالیسیوں سے مزید الجھا دیا۔ جس سے سماجی بلکہ سیاسی میدان میں بھی گہرے اثرات مرتب ہوئے- 31 اکتوبر 1929ء میں غازی علم دین شہید کا واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ کے آغا شورش کشمیری چشم دید گواہ ہیں۔ ایک ہندو پبلشر راجپال نے استعمار کے اشارے پر 1920ء کی دہائی میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین میں ایک کتاب لکھی۔ جو شدید تنازع کا باعث بنی جس نے معاشرتی ابتری میں مزید اضافہ کر دیا۔ غازی علم دین شہید نے راجپال کو قتل کر کے اپنے آپ کو اقرار جرم کے ساتھ حوالہ پولیس کر دیا۔ مقدمہ چلتا رہا سیشن کورٹ نے موت کی سزا دی۔ جو ہائی کورٹ تک بحال رہی۔ اس وقت وہ میانوالی جیل میں قید تھے۔ آخر کار انہیں جیل میں تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ سرکار نے اعلان کیا کہ اس کی میت کو اسلامی رسومات کے مطابق میانوالی میں ہی دفن کر دیا جائے گا۔ جس پر اہلیان لاہور طیش میں آ گئے۔ انہوں نے حکومت کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اس ہیجانی کیفیت میں سرکار نے ان کی بات کو مان لیا اور میت کو لاہور روانہ کر دیا۔ اور ان کی میت کو ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں انتہائی ادب و احترام کے ساتھ میانی شاہ قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ مولانا ظفر علی خان نے ان کی قبر میں لیٹ کر اس کی وسعت کا اندازہ لگایا۔ اس واقعہ نے مسلمانوں کے اندر مزید تقویت پیدا کر دی۔[26]

برطانوی حکومت نے 1928ء کو سر جان سائمن کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کیا۔ جس کا مقصد ہندوستان میں آئینی اصلاحات پر غور کرنا تھا۔ اس کمیشن کی ستم ظریفی یہ تھی کہ اس میں کوئی بھی ہندوستانی نمائندہ شامل نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے ہندوستان کی تمام جماعتیں سراپا احتجاج بن گئی اور انہوں

نے اس کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔ اس کا نعرہ تھا کہ سائمن واپس جاؤ۔ سائمن کمیشن نے برصغیر کے مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ جن میں دہلی، بمبئی، کلکتہ، مدراس اور لاہور تھے۔ اس نے مختلف لوگوں سے ملاقاتیں کیں، عوامی اجلاس کیے، لوگوں کو ملے، ان کے خیالات اور مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی۔ کافی غور وخوض کے بعد 1935ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ منظور کیا گیا۔ سائمن کمیشن جب لاہور پہنچا تو زبردست مظاہرہ کیا گیا۔ حکومتی انتظامات پولیس سپرنٹینڈنٹ جیمز اے اسکاٹ کی قیادت میں انتہائی سخت تھے۔ پولیس نے اسٹیشن اور اس کے اردگرد کی سڑکوں کو گھیر رکھا تھا لیکن اس کے باوجود ہزاروں انسانوں کا جلوس لالہ لاجپت رائے، چوہدری افضل حق، مولانا ظفر علی خان، عطاءاللہ شاہ بخاری، ڈاکٹر ستیہ پال کی قیادت میں اسٹیشن کے سامنے سراپا احتجاج تھا۔ پولیس گردی کی گئی خوب ڈنڈے برسائے گئے لالا لجپت رائے کی چھاتی پر چوٹیں ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ رات کو موری دروازہ پر زبردست جلسہ ہوا۔ لالا لجپت رائے نے نوجوانوں کا خون گرم کر دیا۔ انہوں نے کہا:

> " عزیزو! میرے بڑھاپے کی لاج رکھنا، تمہاری جوانی کا فرض ہے، جو لاٹھیاں آج میرے سینے پہ لگی ہیں وہ برطانوی اقتدار کے تابوت میں آخری میخ ثابت ہوں۔"[27]

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے بھی اس جلسہ سے خطاب کیا اور لوگوں کو سحر زدہ کر دیا۔ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ برطانوی استعمار کا سورج غروب ہونے والا ہے اور وہ جلد ہی یہاں سے جانے والا ہے۔ اس جلسہ کے چند دن بعد لالہ لاجپت رائے شدید زخموں کی وجہ سے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے لالہ لاجپت رائے کے آخری الفاظ کی تحریک میں پولیس سپرٹینڈنٹ جیمز اے اسکاٹ کو قتل کرنے کی منصوبہ بندی کی۔ 1928ء کو غلط فہمی کی بنیاد پر اسسٹنٹ سپرنٹینڈنٹ پولیس جان سانڈرس کو قتل کر دیا گیا اور مرکزی اسمبلی پر بم پھینکا۔ بھگت سنگھ دلیری اور بہادری کا استعارہ کہلایا۔ لوگوں نے اسے ہیرو قرار دیا۔ لوگوں کے دلوں میں استعمار کا خوف نکل چکا تھا اور وہ استعماری ہتکنڈوں کے خلاف سراپا احتجاج تھے۔ کچھ عرصہ بعد بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔[28] گاندھی جی اور لارڈ ارون سمجھوتے کے بعد

گاندھی جی اس کوشش میں تھے کہ بھگت سنگھ، سکھدیو اور راجگرو کی سزائیں معاف ہو جائیں۔ لارڈ ارون راضی ہو گئے کہ اسے مطالبے کی شکل نہ دیں کچھ عرصہ بعد ہم پھانسی کی سزا کو عمر قید میں تبدیل کر دیں گے لیکن یہ بات صیغہ راز میں رہے۔ گاندھی جی نے یہ بات ورکنگ کمیٹی میں بیان کر دی اور ڈاکٹر ستیہ پال جذباتی مقرر تھے انہوں نے لاہور میں موری دروازہ کے باہر جلسہ عام میں نوجوانوں کے شور مچا کر بھگت سنگھ کی رہائی کا مطالبہ کر دیا۔ ڈاکٹر ستیہ پال نے جذبات میں آ کر یہ بات بیان کر دی۔ پنجاب پولیس حیران ہو گئی اور سروسز چیف نے لارڈ ارون کو استعفیٰ بھیج دیا کہ اگر ان کو رہائی دی گئی اور میں ملازمت چھوڑ دوں گا۔ لارڈ ارون پریشان ہو گئے اور انگریز سرکار نے ایک دو دن کے اندر خلاف قاعدہ شام کے وقت ان کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا اور ان کی لاشوں کے ٹکڑے کر کے فیروز پور کے قریب دریائے ستلج کے کنارے پیٹرول ڈال کر تینوں کو جلا دیا۔ یہ خبر آگ کی طرف پھیل گئی۔ جلی ہوئی ہڈیوں کو ڈھونڈ کر لاہور لایا گیا اور بہت بڑا جلوس نکلا اور منٹو پارک میں بہت بڑا جلسہ عام ہوا۔ جس میں مولانا ظفر علی خان نے خطاب کیا۔[29]

استعمار کی حیلہ گری اپنے عروج پر تھی اور رد استعماری طاقتیں باہم شیر و شکر ہو رہی تھیں۔ 31 دسمبر 1929ء کو آل انڈیا کانگرس کا اجلاس راوی کے کنارے لاہور میں رکھا گیا۔ لاہور کو انتہائی خوبصورتی سے سجایا گیا۔ جواہر لال نہرو شرکت کے لیے لاہور پہنچے اور والہانہ انداز سے ان کا استقبال کیا گیا جب وہ ذمیندار اخبار کے دفتر کے قریب پہنچے تو مولانا ظفر علی خان نے انہیں روک کر مصافہ کیا۔ جلوس انتہائی پر جوش تھا۔ مولانا اختر علی خان نے مشہور نظم "جگنو" سنائی۔ یہ وہ نظم ہے جس میں مولانا ظفر علی خان نے برطانوی استعمار کے خاتمے کی پیشگوئی کی اور ہندوستانیوں کے لیے آزادی کا مژدہ سنایا گیا ہے۔ مولانا نے عوامی جذبات کو بہت خوبصورت انداز میں اپنی اس نظم میں سمایا ہے۔ جگنو ایک استعارہ ہے۔ امید کا، کرن کا اور آزادی کا۔ یہ پر جوش اور پر امید جذبات عوامی امنگوں کے ترجمان ہیں۔ استعماری اوچھے ہتھکنڈوں اور مصائب کے پہاڑوں کے سامنے رد استعماری قوتیں مشکلات کے باوجود روشنیاں پھیلائیں گے اور اندھیروں کو مٹائیں گے۔ یہ نظم ایک نئے دور کا آغاز تھی۔ جس نے عوام الناس میں حوصلہ پیدا کیا اور آزادی کی کوششوں کو تقویت بخشی۔ جواہر لال نہرو نے کانگرس کے اجلاس کی صدارت کی۔ یہ اجلاس آزادی ہندوستان میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس اجلاس میں

"پوری سوراج" پڑھا گیا۔ برطانوی استعمار سے پوری آزادی کا مطالبہ منظور کیا گیا۔ اس قرارداد میں واضح طور پر بیان کیا گیا کہ ہندوستانی عوام برطانوی استعمار سے مکمل آزادی چاہتے ہیں۔ گاندھی جی کو گرفتار کر لیا گیا جس کی وجہ سے پورے ملک میں ہڑتال کر دی گئی سکول اور شہر بند ہو گئے۔ آزادی کے متوالوں کا جذبہ دیدنی تھا۔ "مہاتما کی جے" کے نعروں سے شہر شہر قریہ قریہ گونج اٹھا۔ ہڑتال اور جلوس روکنے کے لیے لاٹھی چارج کیا گیا۔ مار دھاڑ کے ساتھ پکڑ دھکڑ کی گئی لیکن عوام استعمار کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن چکی تھی.[30]

جب استعمار کی پولیس گردی بڑھتی گئی اور معاشرتی خلفشار میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ استعماری ہتھکنڈوں سے تسلسل کے ساتھ ظلم و ستم کے بازار گرم کیے جانے لگے اور انسانی حقوق کو رگیدا گیا۔ جہاں انسانیت کی تذلیل کی جاتی رہی ہو وہاں ہر ذی شعور انسان عزت اور غیرت کا پاسباں بن جاتا ہے۔ اس وقت کا ماحول متقاضی تھا کہ تحریک آزادی میں اپنا حصہ ڈالا جائے اور برطانوی استعمار کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کھڑی کی جائے کیونکہ پولیس کی روز بروز کی تشدد آمیز کارروائیاں معاشرتی سطح پر تمام طبقات کو متحد کر رہی تھی۔ جب اوم پرکاش پر پولیس نے تشدد کیا اور عبدالکریم نے اسے پولیس سے بچایا اور ساتھ خود بھی مضروب ہوا تو اوم پرکاش کے دل میں عبدالکریم کے لیے ہمدردی کا جذبہ ابھرا کیونکہ ایک ہندو کے لیے مسلمان کا ساتھ دینا کسی اچنبے سے کم نہ تھا۔ رد استعماری جذبہ مذہبی حدود و قیود سے ماورا اور اپنے مقاصد کا امین ہوتا ہے اور اس کے پیش نظر صرف اپنا مقصد ہوتا ہے وہ ظالم قوتوں کی پروا نہیں کرتا اور انہیں بے نقاب کرتا ہے تاکہ ان سے چھٹکارا پایا جا سکے۔ جب برطانوی استعمار نے معصوم طالب علموں پر اپنے ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیے تو آخر کار نوجوان طالب علموں نے رد عمل ظاہر کرنا شروع کر دیا مختلف ریلیوں میں جاتے، جلوسوں میں شرکت کرتے، جلسوں کی رونق بنتے ہیں اور گاہے گاہے اپنے اپنے پسندیدہ لیڈروں کی تقاریر سے محظوظ ہوتے۔ گو ان کی عمریں کم تھیں لیکن ذہنی بالیدگی قدرے زیادہ تھی۔ اوم پرکاش اور عبدالکریم نے مل کر گلی کی نکر پر بیٹھ کر فیصلہ کیا کہ لڑکوں کی بھی ایک جماعت ہونی چاہیے اور انہوں نے مل کر "بال بھارت سبھا" کے نام سے ایک جماعت بنانے کا ارادہ کر لیا۔ شام کو چار لڑکے اور آ گئے اور انہوں نے موری دروازہ کے باہر سبزہ زار میں بیٹھ کر "بال بھارت سبھا" کی بنیاد رکھی۔ ابتدا میں اس

جماعت کے کل چھ ممبران تھے جن میں تین مسلمان اور تین ہندو تھے۔ اوم پرکاش کو صدر بنا دیا گیا اور عبدالکریم کو سیکرٹری بنادیا۔ دونوں نویں جماعت کے طالب علم تھے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا[31]

موری دروازہ کے باہر بابا کندن شاہ کے مزار کے ساتھ سبزہ زار میں کیمپ لگایا گیا دو چار دنوں میں سینکڑوں نوجوانوں نے نام لکھوایا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہیں ممبروں کی تعداد ہزاروں میں چلی گئی لیکن اس کے ممبران 18 برس سے اوپر نہ تھی دیکھتے ہی دیکھتے اس میں لڑکیاں بھی شامل ہوتی چلی گئیں اناج اور روپیہ پیسہ ہر روز جمع ہونے لگے اور لنگر کا انتظام کر لیا گیا۔ رد استعماری کیمپ میں نوجوانوں کی چہل پہل، تقریریں اور نعرے حکومتی ایوانوں تک جا پہنچا۔ رات کے اندھیرے میں چھاپہ مارا گیا اور کچھ رضاکاروں کو گرفتار کر کے لے گئے اور کیمپ کو اکھاڑ دیا گیا۔ اگلے روز آپس میں فیصلے کے بعد انہوں نے دوبارہ کیمپ لگایا۔ لڑکوں کا جوش دیدنی تھی اور زبردست جلوس نکالا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہندو لڑکیوں میں بھی جوش دیکھنے میں آیا وہ کھانے پینے کی چیزیں لے آئیں اور انہوں نے الگ سے لڑکیوں کے لیے بھی خیمے لگا دئے اور لڑکوں کے شانہ بشانہ حکومت کے خلاف بڑے بڑے اشتہارات چسپاں کر دئے۔ آہستہ آہستہ لوگوں میں رد استعماری شعور بڑھتا گیا جس سے ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔

قانون کو بالائے طاق رکھتے ہوئے شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار لالہ نتھو رام سٹی مجسٹریٹ نے کیمپ پر چھاپا مارا اور بہت سارے رضاکاروں کو گرفتار کیا ہے ان کا گلا گھونٹا، انہیں نہر میں پھینکا گیا اور غوطے دیے گئے۔ بعض لڑکوں کے چہروں پر دانتوں سے کاٹا اور یہ سب کچھ اسی کی سرکردگی میں ہوتا رہا۔ جن لڑکوں کو پیٹا گیا ان میں ایک آٹھویں جماعت کا طالب علم راجپال بھی تھا۔ وہ ایک خوبرو نوجوان تھا جس کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا گیا جس کی وجہ سے وہ زخموں کے تاب نہ لا کر مر گیا اور شاہ عالمی دروازہ کے باہر تالاب میں اس کے جسد خاکی کو پھینک دیا جائے۔ کیونکہ یہ طالب علم رات کو کیمپ میں تھا والدین کو ایک تشویش ہوئی

اور وہ اس کی تلاش میں سر گرداں رہے۔ لاش پھول کر پانی کے اوپر آگئی اور کہرام برپا ہوا۔ پھول سا چہرہ نیلا ہو چکا تھا۔ تمام شہر میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اس کی ارتھی کا جلوس انقلاب زندہ باد، برطانوی راج مردہ باد کے نعروں سے گونجتا ہوا اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہا۔ پولیس اوم پرکاش کہ تلاش میں تھی۔ آخر اسے بھی گرفتار کر لیا گیا اور اس کے ساتھ بھی کوتوالی میں وہی سلوک کیا گیا جو راجپال سے کیا تھا۔ اوم پرکاش نے اپنی پوری بپتا بیان کی جسے سن کر سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ جسم پر کپکپی اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ واردات غیر انسانی، انتہائی دل خراش اور لرزہ خیز تھی۔ یوں یہ 16 برس کا خوبصورت نوجوان اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ حکومتی معاملات اسی طرح چلتے رہے اور ان کا بال بھی بیکا نہ ہو سکا۔ ان کے موقف میں کمی نہیں۔ اسی طرح "بال بھارت سبھا" کے دوسرے عہدے داران کو مختلف حیلوں سے مضروب کیا گیا۔ ان کے والدین کو ڈرایا دھمکایا گیا اور ان کو بے عزت کیا گیا۔ کچھ کو ان کے والدین سے خوب پٹوایا گیا اور کچھ کو مخبر بنالیا۔ ظلم و ستم بڑھتا گیا

ردا ستعماری تحریک میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ہندو لڑکیاں بھی لڑکوں کے شانہ بشانہ بہادری سے آواز بلند کرتی رہیں اور قید ہوتی رہیں۔ استعمار کے ظلم و ستم سے صنفی امتیاز بھی ختم ہو گیا کیونکہ ردا ستعماری جذبہ صنفی امتیاز سے بالاتر ہوتا ہے۔ انہوں نے بڑی بے باکی سے استعمار کو للکارا۔ انقلاب زندہ باد کے نعرے لگائے جاتے، جھنڈے لہرائے جاتے اور پھر لاٹھی چارج ہوتا، سر پھٹتے، گرفتار ہوتے اور وہ خوش دلی سے قید و بند کی صعوبتوں کو برداشت کرتیں ایسے لگتا تھا جیسے ہندوستان جاگ چکا ہے۔ لاڈو رانی زنشی کی بیٹیوں نے پولیس کو زچ کر دیا۔ بڑی بیٹی جنگ کماری زنشی نے گورنمنٹ کالج کے سامنے پولیس کے لاٹھی چارج میں ڈاٹ کر لاٹھیاں کھائیں اور اس کا سر پھٹ کے جب طلباء نے دیکھا تو وہ حملہ آور ہوئے اور طیش میں آکر انہوں نے گورنمنٹ کالج کے ٹاور پر چڑھ کر یونین جیک پھاڑ ڈالا۔ سپرنٹینڈ پولیس مسٹر ہارڈنگ کی قیادت میں کالج میں داخل ہو گئی لیکن کالج کے پرنسپل مسٹر ایچ ایل او گیرٹ نے انہیں واپس بھیج دیا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ پولیس کا تعلیمی ادارے کے اندر آنا ادارے اور تعلیم کی اہانت ہے۔ دوسرا خاندان جس کی بیٹیوں نے اس تحریک کو مزید چار چاند لگائے ان میں دیش بھگت کی چار بیٹیاں سدیش، آدرش، ستیہ اور

سوراج تھیں۔ سودیش نے گورنمنٹ کالج پر ترنگا لہرانا چاہا پولیس نے لاٹھی چارج کر دیا اس کا سر پھٹ گیا اور سر سے خون نکل کر چہرے پر لکیروں کی مانند ٹپکتا رہا لیکن اس جری خاتون نے جھنڈا ہاتھ سے نہ جانے دیا اور تواتر سے انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتی رہی۔ جس سے لوگوں کے اندر جوش ولولہ بیدار ہوتا چلا گیا بعد میں زنانہ پولیس نے آکر انہیں گرفتار کر لیا۔ اسی طرح کارکنان گرفتار ہوتے چلے گئے اور یہ قافلہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہا۔ 5 مارچ 1931ء کو گاندھی جی اور وائسرائے لارڈ ارون سے معاہدہ ہو گیا ہے۔ یہ معاہدہ بھارتی قوم پرستوں اور برطانوی حکومت کے درمیان طویل مذاکرات کے بعد طے پایا۔ اس کے تحت سول نافرمانی تحریک، اسیروں کی رہائی، آئینی اصلاحات اور نمک پر سے پابندی ختم کرنے کا عندیا دیا گیا۔ جس کی وجہ سے اسیر رہنما، کارکن اور رضاکار رہا ہونے لگے۔ قریہ قریہ، گاؤں گاؤں ان کا زبردست خیر مقدم کیا گیا ہر روز استقبالیہ جلوس نکلنے لگے۔ ہر روز تقریریں ہوتیں۔ لوگ اپنا عقیدت بھرا کلام سناتے اور ان کے عزت افزائی کرتے۔[32]

مقامی استعمار ایک سیاسی و سماجی نظریہ ہے۔ جس کے ذریعے خواص عام طبقہ کے ساتھ ناروا سلوک روا رکھتے ہیں۔ اس میں سیاسی، اقتصادی، علاقائی، لسانی، نسلی، ثقافتی اور مذہبی بنیادوں پر غالب گروہ یا غالب اکثریت یا مقامی حکمران یا مرکزی حکومت مقامی سطح پر استحصال کرتی ہے۔ ان کا یہ استعماری رویہ اندرونی یا بیرونی سطح پر خواص یا مفادات کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔ اور یہ رویہ معاشرتی ناہمواری کا باعث بنتا ہے۔ مقامی حکومتوں کا بلاوجہ، غیر ضروری اور اضافی ٹیکس عوام سے وصول کرنا۔ زبردستی قبضہ یا مالی فوائد حاصل کرنا یا اقتصادی فوائد سے کسی کو محروم رکھنا۔ چھوٹے طبقات سے معمولی رویہ رکھتے ہوئے انہیں کمتر اور ذلیل سمجھنا۔ ان کی روایات، ثقافت کو حقیر سمجھ کر دبانا۔ ان کے رہن سہن اور تہذیب کو گھٹیا سمجھنا۔ سماجی امتیاز برتتے ہوئے ان سے امتیازی سلوک کرنا۔ انہیں بہت سارے سولیات سے محروم رکھنا۔ انہیں سیاسی نمائندگی سے محروم رکھنا یا اپنی شکست کے ڈر سے انہیں ووٹ کے حق سے محروم رکھنا اور ان کے مسائل کو نظر انداز کرنا۔ یہ تمام معاملات کسی بھی معاشرے میں افراط و تفریط کا باعث بنتے ہوئے معاشرتی خلفشار کا سبب بنتے ہیں۔ دنیا میں تقریباً ہر معاشرے میں ان کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ کبھی ہم انہیں ہمدردی کے

جذبے سے نپٹتے ہیں اور کبھی نفرت کا جذبہ غالب آجاتا ہے۔ امریکہ میں افریقی نژاد امریکیوں کے ساتھ نسلی امتیاز اور ناانصافی آج بھی روا ہے۔ گو کہ غلامی کا تصور اپنی شکل تبدیل کر چکا ہے۔ بھارت میں نچلی ذات کے ہندوؤں "دلت"، "شودر" کے ساتھ امتیازی سلوک صدیوں سے رکھا جارہا ہے۔ اسی طرح پنجاب میں کم ذات کمیوں، ماچھیوں، مصلیوں اور مراثیوں کے ساتھ کچھ اسی قسم کا رویہ ہے۔ انہیں آج بھی مختلف شعبوں میں کمتر تصور کیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی زبان، ثقافت اور ان کے رسم و رواج کو نقصان پہنچا۔ وہ آج بھی سیاسی و اقتصادی سطح پر کمزور ہیں اور ان قبائل کے وسائل پر حکومتی یا مضبوط گرو قابض ہو جاتے ہیں یا ان کی زمینیں چھین لی جاتی ہیں۔ اس استحصالی کیفیات سے معاشی عدم استحکام، ثقافتی نقصان اور سماجی تنازعات کو جا ملتی ہے۔ ان محکوم اور محروم گروہوں کی بہبود کے لیے قانون سازی کے علاوہ معاشرتی شعور ضروری ہے۔ اسی طرح کا برتاؤ خطہ کشمیر کے ساتھ کیا گیا۔ اس جنت نظیر علاقے میں مقامی آبادی کے ساتھ جہنم جیسا برتاؤ کیا گیا۔ کشمیر کا قضیہ کچھ یوں ہوا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ ہندوستان میں شمال مغربی ریاست کے مضبوط حکمران تھے اور لاہور اس کا دارالحکومت تھا۔ نوآبادیاتی دور میں استعمار نے پوری کوشش کی کہ وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو شکست دیں لیکن انہیں کامیابی نہ مل سکی وہ ہر ممکن کوشش کے باوجود ناکام ہوئے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ جب فوت ہو گیا تو پنجاب کی حکومت آہستہ آہستہ کمزور ہوتی چلی گئی۔

برطانوی استعمار کو موقع ملا تو انہوں نے سکھوں کی حکومت کو شکست دی۔ اس دور میں گلاب سنگھ سکھ حکومت میں جموں کا راجہ تھا۔ اس نے برطانوی حکومت کے ساتھ " معاہدہ امرتسر" کیا اور 16 مارچ 1846ء کو برطانوی استعمار نے 75 لاکھ نانک شاہی روپے کے عوض جموں و کشمیر ریاست کی حکمرانی راجہ گلاب سنگھ کے حوالے کر دی۔ اس ریاست میں کشمیر، جموں، لداخ اور بلتستان کی ریاستیں شامل تھی۔ اس معاہدے کے مطابق راجہ گلاب سنگھ کو ان علاقوں میں مکمل تصرف حاصل ہو گیا اور راجہ کو برطانوی استعمار کا تعاون بھی حاصل تھا۔ راجہ گلاب سنگھ کے خاندان نے حکومت کی اور یہ حکومت 1947ء برصغیر کی تقسیم تک رہی۔ اس وقت کے حکمران مہاراجہ ہری سنگھ نے عوامی مرضی کے خلاف بھارت کے ساتھ الحاق کر دیا۔ اور اس طرح ریاست کا نظم و نسق ڈوگرہ خاندان کے ہاتھ آگیا۔ بعد ازاں جنگ کے نتیجے میں

کشمیر کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ جب ڈوگرہ خاندان اس خطے پر براجمان ہوا تو انہوں نے مقامی بشندوں کے ساتھ غیر انسانی رویہ اپنایا۔ وہ ان کے رحم و کرم پر تھے۔ کشمیر کی 95 فیصد ابادی کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ ان کے خلاف آواز اٹھا سکے۔ مسلمانوں کا گھیرا تنگ ہوتا چلا گیا۔ ہزاروں خاندانوں نے پنجاب اور ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں ہجرت کی۔ ان خاندانوں میں برصغیر کے بڑے بڑے سیاستدان، ادیب، پہلوان، ادیب، شعرا اور فنون لطیفہ سے وابستہ بے شمار لوگ شامل تھے۔ ان لوگوں کا مذہب کی وجہ سے کشمیر میں رہنا مشکل ہو گیا۔ موسم سرما میں ایک بڑی تعداد میں کشمیری ہندوستان کا رخ کرتے اور روزگار کے سلسلہ میں وہاں محنت و مزدوری کرتے، باربرداری کا کام کر کے مشکل سے گزر اوقات کرتے۔ کشمیر میں مذہبی پابندیاں عائد کی گئیں۔ کوئی ہندو مسلمان نہیں ہو سکتا تھا۔ گائے کے ذبیحہ پر پابندی عائد کر دی گئی اور اس کی سزا عمر قید ٹھہری۔ ان سے بیگار لی جاتی، برہمنوں کو خدائی حقوق حاصل تھے، راجپوت سر پر سوار، عام ہندو اپنے آپ کو افضل سمجھتے اور ڈوگرے اپنے آپ کو خداؤں کی اولاد تصور کرتے۔ اس صورتحال میں مسلمان کیا کرتے سوائے اس کے کہ وہ اس ظلم و بربریت کے خلاف متحد ہو کر آواز بلند کریں لیکن مقامی حالات انتہائی مخدوش تھے باہر کے مسلمانوں کی امداد کے بغیر کوئی بھی قدم اٹھانا ناممکن تھا۔ شیخ عبداللہ نوجوان تھے اور انہیں کشمیر کے بعض ممتاز بزرگ رہنماؤں کا ساتھ تھا۔ ڈوگرہ فوج نے بربریت کی انتہا کر دی۔ جب اس نے 13 جولائی 1931 کو کشمیر کی جامع مسجد میں فائرنگ کر کے 22 کشمیری مسلمانوں کو شہید کیا اور بہت سارے زخمی ہوئے۔ ظلم و بربریت کا کھیل جاری رہا اور پنجاب میں کہرام برپا ہو گیا وہاں کے مسلمان بے اقرار ہو گئے۔

پنجاب ہندوستان کی سیاست کا گڑھ بن چکا تھا اور اسے برطانوی استعمار کی کان کہا جاتا تھا۔ پنجاب پر قبضہ پورے ہندوستان پر قبضہ شمار ہوتا تھا۔ یہ ہر لحاظ سے ایک اہم صوبہ تھا۔ دن بدن اس کی سیاسی فضا مکدر ہونا شروع ہوئی۔ کشمیر کی اس صورتحال میں اب کسی جماعت کا بننا بدیہی بات تھی۔ لہذا 1932ء کو سری نگر کے مقام پر "جموں کشمیر مسلم کانفرنس" کے نام سے ایک تنظیم معرض وجود میں آئی۔ جس کا اولین مقصد مہاراجہ ہری سنگھ کے مظالم کو بند کروانا اور مسلمانوں کے حقوق کی بحالی کے لیے دباؤ ڈالنا تھا۔ 1938-39ء

میں شیخ عبداللہ نے اس کا نام بدل کر "جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس" رکھ دیا۔ اور کشمیر کا بھارت کے ساتھ الحاق کے موقع پر شیخ عبداللہ نے بھارت کی حمایت کی اور یوں بھارت کے ساتھ الحاق ہو گیا ہے۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد جو قادیانی جماعت کے امام تھے۔ انہوں نے "آل انڈیا کشمیر کمیٹی" کے نام سے ایک جماعت بنائی۔ پہلے وہ خود اس کمیٹی کے صدر بنے لیکن بعد میں حالات کو بھانپتے ہوئے علامہ اقبال کو اس کا صدر نامزد کروایا۔ علامہ اقبال صدر بننے کے بعد بے بس تھے کیونکہ تمام انتظامی امور مرزا کے پاس تھے۔ مرزا جو کچھ کر رہے تھے علامہ اقبال اس صورتحال سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے ان کی حقیقت کو جان کر اس جماعت سے استعفی دے دیا۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد کا کردار مشکوک تھا کیونکہ انہیں برطانوی استعمار کی پشت پناہی حاصل تھی اور وہ سب کچھ ان کے استعماری مقاصد کے لیے کر رہے تھے۔ مرزائیوں نے کبھی بھی مسلمانوں کا مشکل وقت میں ساتھ نہیں دیا۔ بلکہ اندرونی اور بیرونی سطح پر انگریزوں کے جاسوس رہے۔ وہ سی ائی ڈی کے اہلکار اور وظیفہ خوار رہے۔ ہمیشہ مسلمانوں کی پیٹھ پیچھے چھرا گھونپا۔ 1857ء کی جنگ آزادی، افریقہ اور بیرونی ممالک میں مسلمانوں پر کئی مشکل ادوار آئے لیکن یہ استعمار کی خاستگاری میں متمکن رہے۔ بلکہ یہاں تک کہ استعمار کی خواہش پر انہوں نے تنسیخ جہاد کے لئے "ربانی سند" مہیا کی تاکہ مسلمانوں کی تحریک آزادی کی کوششوں کو نقصان پہنچے۔ پہلی جنگ عظیم میں وہ برطانوی استعمار کے شطرنج کا مہرہ بنے رہے۔ عربوں اور ترکوں کی جاسوسی کی اور انہیں معلومات بہم پہنچائیں۔ اگر ان تمام حالات واقعات اور محرکات کا احاطہ کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "فتنہ قادیانیت" استعمار کا پیدا کردہ ہے اور ان کا دعوی "نبوت و خلافت" بھی دراصل انگریزوں کی اختراع تھا۔ انہوں نے اپنے "نبی" کی آڑ میں برطانوی استعمار کے مقاصد پورے کیے اور ان کی بھرپور پشت بانی کی کیونکہ وہ استعمار سے طاقت حاصل کر کے اپنے مذموم مقاصد اور عزائم کو ثمر بار کرنا چاہتے تھے۔ ان کی پوری تاریخ عیاری و مکاری سے عبارت ہے۔ خطہ کشمیر کے متعلق ان کا مضطرب ہونا کسی اچنبے سے کم نہ تھا۔ کشمیر کو وہ اپنی سرگرمیوں کا محور بنانا چاہتے تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یہ غریب و بے کس اور ضعیف العقیدہ لوگ ان کے لیے ترنوالہ ثابت ہونگے۔ انہوں نے مرزا غلام احمد کے دعویٰ "مسیح ناصری" کا خوب پرچار کیا اور یہ بارآور کروانے کی

کوشیش کی کہ وہ سرزمین کشمیر میں مدفون ہیں۔ اپنی خلافت کا مرکز بنانے کے لیے انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اپنے مریدوں کے ذریعے نواع واقسام کی بشارتیں گھڑی گئیں اور لوگوں کو سنائی گئیں۔ اس طرح لوگوں کو مختلف طریقوں سے ورغلایا گیا۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد نے اپنے الہاماتی نظریات کی بدولت مرزایت کو تقویت دی۔ دراصل وہ کشمیر کی ریاست کو اپنی خلافت کا مرکز بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے مریدوں کے ذریعے عوام الناس کو یہ باور کروایا کہ "حضرت مسیح موعود" نے کہا ہے کہ کشمیر میری ہی امت کے لوگ فتح کریں گے۔

برطانوی استعمار نے مذہبی سطح پر مسلمانوں کو تقسیم کرنے کی کوشش کی اور وہ کسی حد تک کامیاب رہا کیونکہ برطانوی استعمار کی شہ پر مرزائی اتنا طاقتور تھے کہ انہوں نے اپنے نمائندے حکومت کے اعلی عہدوں پر تعینات کیے ہوئے تھے۔ جن میں سے ایک چوہدری ظفر اللہ خان تھے۔۔ چوہدری ظفر اللہ خان نے 1930-32 میں گول میز کانفرنسوں میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ وہ قانون دان، سیاستدان، سفارت کار اور پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ رہے۔ اقوام متحدہ میں پاکستان کے نمائندگی کی۔ بین الاقوامی عدالت انصاف کے جج رہے۔ ان کی خدمات ہندوستان، پاکستان اور بین الاقوامی سطح پر سراہا گیا۔ انہوں نے بین الاقوامی سطح پر خوب تقریریں کیں اور داد سمیٹی لیکن ان کی زندگی میں برکت نہیں رہی۔ کشمیریوں کی حالت زار، برطانوی استعمار کا مہاراجہ گلاب سنگھ کے ساتھ سودا کرنا اور پھر اس ڈوگرہ راج کا مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ توڑنا۔ انسانیت کی تذلیل کے برابر تھا۔ اس صورتحال کے پیش نظر "مجلس احرار الاسلام" تحریک کشمیر میں مدخل ہوئی۔ جس سے کشمیری عوام کو شعور ملا اور "فتنہ قادیانیت" کے تابوت میں کیل ٹھونک دی گئی۔ "مجلس احرار الاسلام" 29 دسمبر 1929ء کو لاہور میں بنی کیونکہ لاہور اس وقت سیاسی، مذہبی، ثقافتی اور سماجی تحریکوں کا مرکز تھا۔ مجلس نے بھی لاہور ہی سے اپنی سیاسی، مذہبی اور فلاحی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ انہوں نے برطانوی استعمار کو للکارا اور ان کے خلاف بھرپور جدوجہد کی۔ اس نے مسلمانوں کے حقوق، تحفظ اور فلاح کے لیے کام کیا۔ اس کے بانیان میں ممتاز مسلم رہنما تھے۔ اہم بانی ممبران میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی،

چوھدری افضل حق اور مولانا عطا اللہ شاہ بخاری شامل ہیں۔ بانی رہنماؤں نے اپنی تقریر اور تحریر، سیاست، مذہب اور فلاحی کاموں کے ذریعے جماعت کو مضبوط کیا اور عوام الناس کو جماعتی مقاصد سے آگاہ کیا۔ پہلے پہل یہ جماعت پنجاب تک محدود تھی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے پورے ہندوستان میں تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔

مجلس احرار الاسلام نے بھرپور طریقے سے کشمیریوں کو سہارا دیا اور ان کو ہر طرح کی کمک پہنچائی لیکن پنجاب کے سرکاری "بزرجمہر" نے کشمیر حکومت کا ساتھ دیا۔ "بزرجمہر" ایک فارسی اصطلاح اور تلمیح ہے۔ اس کا مطلب دانا اور عقلمند لوگوں کے ہیں۔ ایران کے ایک انتہائی سمجھدار اور ذہین وزیر اعظم کا نام ہے جو ساسانی بادشاہ خسرو نوشیرواں کا وزیر اعظم تھا۔ اگر سرکاری اہلکار عدل و انصاف سے کام لیتے ہوئے کشمیری عوام کا ساتھ دیتے اور شخصی مفادات کی قربانی دیتے تو نتائج کچھ مختلف ہوتے لیکن یہ برطانوی استعمار کے نمائندے تھے۔ یہاں کے مسلمانوں نے خواص کا ساتھ دیا اور خواص نے برطانوی استعمار کا ساتھ دیا اور جب " مجلس احرار الاسلام "نے ان لوگوں کے چہروں سے نقاب اٹھائے تو برطانوی استعمار کی مداخلت شروع ہوئی۔ جب اس کو نشانہ بنایا تو برطانوی سرکار کا دم بھرنے والوں نے " مجلس احرار الاسلام" پر بہتان بازی شروع کر دی۔ مسلمانوں کی غالب اکثریت نے مجلس کا ساتھ دیا۔ یہ تحریک سیاسی تھی لیکن اس کا طریقہ کار اور اس کے خد و خال مذہبی تھے۔ اس تحریک نے "ہندو نیشنلزم" کا پردہ چاک کر دیا۔ مہاتما گاندھی جیسے رہنما نے مجلس احرار کی تحریک کو فرقہ وارانہ قرار دے کر اس کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ برطانوی استعمار اور ریاستی جبر کے خلاف یہ ایک مضبوط مورچہ تھا۔ یہ تحریک دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتی چلی گئی۔ شہری اور دیہاتی سطح پر اس کی بھرپور پذیرائی ہونے لگی۔ اس کی دن بدن بڑھتی ہوئی سیاسی، سماجی اور مذہبی سرگرمیوں سے برطانوی استعمار خائف تھا کیونکہ اس کی طاقت میں تیزی سے اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا۔ احرار نے اپنی حکمت عملی تبدیل کی۔ شراب، بدیشی کپڑا اور بدیشی مصنوعات کا مکمل بائیکاٹ کیا۔ استعمار نواز مسلمانوں نے اس کا خوب پروپگنڈا کیا کہ احرار اور گاندھی جی دونوں آپس میں ایک ہیں حالانکہ ہندو مجلس احرار کے وجود کو ہندوؤں کے لئے "مذہبی خطرہ" سمجھتے تھے جبکہ برطانوی استعمار اسے " آزادی

کی تحریک" کے طور پر لے رہے تھے۔ برطانوی استعمار کے اشارے پر پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ جاری رہی۔ مجلس احرار کے زعماء انتہا درجے کے خطیب اور اس کے کارکن استقامت کی تصویر تھے۔ احمد یار رزمی نے اس کی مثال پیش کرتے ہوئے انارکلی بازار میں جس استقامت کے ساتھ اپنی گرفتاری پیش کی اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس گرفتاری سے پولیس بھی کانپ گئی۔ پولیس نے سب کے سامنے اسے زدوکوب کیا لیکن وہ مرد مجاہد مردانگی سے ڈٹا رہا اور لاٹھیاں کھاتا رہا، مضروب ہوا، خون میں نہلا گیا لیکن عدم تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ اخباری میڈیا نے ہندوؤں کا ساتھ دیتے ہوئے اسے فرقہ وارانہ کہہ کر مزید حالات خراب کر دیے۔

مقامی استعمار کیونکہ ہندووں اور سکھوں کے مفاد میں تھا۔ انہوں نے مہاراجہ ہری سنگھ کا ساتھ دیا۔ اس واقعہ نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ ہندوؤں نے مہاراجہ ہری سنگھ کی حمایت میں انارکلی میں جلوس نکالا اور اس جلوس کے درمیان جھگڑا ہو گیا اور اس جھگڑے کے نتیجے میں نور محمد نام کا ایک نوجوان جو چمڑے کی دکان پر ملازم تھا جو زخموں کی تاب نہ لا کر شہید ہو گیا۔ نامعلوم قاتل نور محمد کے سینے میں خنجر گھونپ کر فرار ہو گیا اور اس کا پتہ نہ چل سکا۔ جس سے فرقہ وارانہ آگ بھڑک اٹھی۔ لیکن "مجلس احرار الاسلام" کے قائدین نے کمال ہوش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس بھڑکتی ہوئی آگ پر قابو پایا۔ مولانا حبیب الرحمن نے جلسہ عام میں خطاب کرتے ہوئے لوگوں کو بتایا کہ برطانوی استعمار چاہتا ہے کہ تحریک کشمیر ہندو مسلم فرقہ واریت ہنگاموں میں گم ہو جائے لیکن ہم ان ناپاک ارادوں کو خاک میں ملا دیں گے۔ ہم اسے کامیاب نہیں ہونے دیں گے ان کے یہ الفاظ لوگوں کے دلوں پر اثر کر گئے۔ اس وقت " زمیندار اخبار " " مجلس احرار الاسلام "کا ساتھی اور اس کا ترجمان رہا جس کی وجہ سے اس کے بے شمار شمارے ضبط کر لیے گئے اور منصور سٹیم پریس ضبط کر لیا گیا اور مسلمانوں میں معمولی نوعیت کی ریشہ دوانیاں پیدا کر دی گئیں جس کی وجہ سے احرار کے عام کارکنوں کو "زمیندار" سے دور رہنے کا مشورہ دیا گیا لیکن مولانا ظفر علی خان اس کا تذکرہ نہ کرتے اور آخر کار یہی چھوٹی چھوٹی رنجشیں احرار اور مولانا کے درمیان جدائی کا باعث بنیں۔ 1935ء میں تحریک شہید گنج لاہور سے شروع ہوئی۔ تحریک کشمیر کی وجہ

سے حالات ہندوؤں کے ساتھ پہلے ہی کشیدہ تھے اور اب سکھوں کے ساتھ بھی بگڑتے گئے۔ برطانوی استعمار اپنی حیلہ کاری میں کامیاب رہا۔ اس کا مقصد شہید گنج مسجد کے قضیے کو حل کرنا تھا۔ یہ مغل دور میں تعمیر کی گئی ایک تاریخی مسجد تھی لیکن سکھوں کے دور حکومت میں اسے گردوارہ بنا دیا گیا اور برطانوی استعماری دور میں گوردوارہ ایکٹ کے تحت اس کے مالکانہ حقوق سکھوں کے حوالے کر دیے گئے۔ استعماری چال کامیاب ہوئی۔ مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان کشیدگی مزید بڑھ گئی۔ حکومت وقت نے مداخلت کی اور یہ مقدمہ عدالت میں چلا گیا۔ عدالت نے فیصلہ دیا کہ اس کے مالکانہ حقوق سکھوں کے نام پر ہیں لہذا یہ سکھوں کی ملکیت ہو گی۔ یہ تحریک مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان مذہبی اور سماجی تنازع کا باعث بنی۔ شہید گنج کے عنوان سے موچی دروازہ لاہور میں ایک عظیم و شان جلسہ ہوا۔ جس کی صدارت علامہ محمد اقبال نے کی۔ اس جلسہ میں اہم خطاب عطا اللہ شاہ بخاری کا تھا انہوں نے بہت ہی مربوط انداز سے عمدہ خطاب کیا اور لوگوں کو اس خلفشار سے بچنے کی تلقین کی۔ لوگوں نے علامہ اقبال کو سننے کے لیے شور مچایا تو علامہ اقبال نے فارسی کا ایک شعر پڑھا۔ جس کا مفہوم کچھ اس طرح سے ہے۔ کیا تو لا الہ کہتا ہے اگر کہتا ہے تو روح میں ڈوب کر کہہ یعنی عقیدہ توحید کا اقرار کرتے ہوئے اسے پورے دل و جان کے ساتھ بیان کر تا کہ تو عشق و مستی میں کھو جائے۔ لا الہ ایک ضرب ہے اور کاری ضرب ہے یعنی یہ ایک موثر اور طاقتور عمل ہے جو روحانی طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ علامہ کے صرف ایک شعر پڑھنے سے فضا اللہ اکبر کے نعروں سے معطر ہو گئی جو فارسی جانتا تھا وہ بھی مزہ لے رہا تھا اور جو نئی جانتا تھا وہ اس کے جادو سے وجدانی کیفیت میں چلا گیا۔

33

برطانوی استعمار نے امن عامہ کی بحالی، معاشرتی بے چینی اور اقتصادی ابتری کو دور کرنے کے لیے اپنی پوری کوششیں کی لیکن حالات دن بدن بگڑتے چلے گئے۔ حکومت مخالف نظریات جان پکڑتے گئے۔ آزادی کی جدوجہد میں مزید تیزی آتی جا رہی تھی۔ جلسے جلوسوں اور ریلیاں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سول نافرمانی تحریک نے رنگ دکھانے شروع کر دیے جس سے انتظامی مشکلات میں اضافہ ہو گیا اور اقتصادی دباؤ بڑھتا چلا گیا اور حکومتی بے بسی نظر آنے لگی۔ برطانوی استعمار نے سنجیدگی کے ساتھ سوچنا

شروع کر دیا اور ان کے حکمت عملی مذاکرات ٹھہری۔ گاندھی جی نے کانگریس کے اہم رہنماؤں کے ساتھ مشاورت کی گئی۔ بلاخر اس مشاورت کے نتیجے میں ایک معاہدہ ہوا۔ یہ معاہدہ وائسرائے ہاؤس دہلی میں ہوا۔ اور اس پر 5 مارچ 1931ء کو گاندھی جی اور وائسرائے لارڈ ارون نے دستخط کیے گئے۔ اور یہ معاہدہ تحریک آزادی میں اہمیت کا حامل بنا۔ اس معاہدے نے استعماری ایجنڈے میں نرمی پیدا کی اور اس معاہدے کی رو سے ان اقدامات پر عمل شروع ہوا۔ 1۔ تحریک آزادی میں گرفتار کیے گئے قیدیوں کی رہائی عمل میں آئی۔ 2۔ سمندری نمک پر پابندی کا خاتمہ ہوا۔ 3۔ نافرمانی تحریک کا خاتمہ۔ 4۔ معاشرتی حالات کو بہتر کرنے کے لیے آئینی اصلاحات پر غور و غوص پر اتفاق کیا گیا۔ جس سے آہستہ آہستہ حالات معمول پر آنے لگے اور ساتھ ہی تحریک کشمیر اپنے انجام کو پہنچی۔ لارڈ ارون کے بعد فری مین تھامس مارکوئس لارڈ ولنگڈن وائسرائے اور گورنر جنرل بنے۔ وہ ایک منجھے ہوئے برطانوی سیاستدان اور برطانوی نو آبادیاتی دور میں مختلف خدمات انجام دیتے رہے۔ جب وہ مقرر ہو کر ہندوستان آئے تو اس وقت کانگرس اور دوسری پارٹیوں کی سرگرمیاں بڑی شد و مد سے جاری تھیں۔ تحریک آزادی زور پکڑ رہی تھی۔ لارڈ ولنگڈن کی حکمت عملیاں سخت گیر اور دباؤ والی تھیں۔ وہ برطانوی اقتدار کے حامی تھے اور سیاست دان ہونے کے ناطے ان کی نظر مقامی سیاست پر گہری تھی اور روز بروز آزادی کی تحریکیں اپنے آپ کو مضبوط کرتی چلی جا رہیں تھیں اور جس سے لارڈ ولنگڈن کو تشویش ہوئی۔ انہوں نے گاندھی ارون معاہدے کی پرواہ نہیں کی اور ہزاروں کارکنان کو گرفتار کر لیا۔ جب گاندھی جی گول میز کانفرنس کے بعد بندرگاہ اترے تو انہیں بھی گرفتار کر لیا گیا۔ باقی لیڈران تو پہلے سے ہی گرفتار کر لیے گئے تھے۔ لارڈ ولنگڈن نے برطانوی اقتدار کی حفاظت کے لیے ہر ممکن اقدامات اٹھائے۔ اس لیے دوسری اور تیسری گول میز کانفرنسوں میں کوئی خاطر خواہ پیشرفت نہ ہو سکی۔ وقتی طور پر سیاسی سرگرمیاں ماند پڑیں لیکن جوں جوں ظلم بڑھتا گیا آزادی کی تحریکوں میں شدت آتی گئی اور برطانوی استعمار مزید سے مزید سخت اقدامات کرتا چلا گیا۔ جس سے سیاسی ابتری کے ساتھ معاشی بحران بھی گھمبیر ہوتا چلا گیا۔[34]

برطانوی استعماری دور میں سماجی اور مذہبی سطح پر بہت سارے تنازعات کے پس منظر میں استعمار زدہ کی مذہبی، سماجی اور سیاسی شناخت کو مجروح کرنے کے لیے مختلف قسم کے ہتھکنڈے استعمال کیے گئے "مسجد شہید گنج" اس کی ایک اہم مثال جو برطانوی اقتدار کے دوران فرقہ واریت سیاست کی علامت بن گئی۔ یہ ایک تاریخی مسجد تھی جو مغلیہ دور میں اٹھارویں صدی کے اوائل میں تعمیر کی گئی۔ لیکن اس مسجد کی تعمیر کے کچھ عرصہ بعد 1762ء میں سکھوں نے اس مسجد اور اس سے ملحق میر منو کے مقبرے کو شہید کر کے وہاں ایک شاندار گردوارہ تعمیر کیا۔ اس وقت پنجاب کے مختلف حصوں پر سکھوں کی مسلح مختلف جماعتوں کی حکمرانی تھی اور وہ اپنی طاقت کے نشے میں مخمور تھے۔ مقامی استعمار کا یہ پہلا حربہ تھا جو اس نے استعمار زدہ پر آزمایا۔ سکھ پنجاب میں پہلے ہی طاقتور تھے لیکن مختلف جماعتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ 1799ء میں رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کیا اور 1801ء کو پنجاب میں اپنی حکمرانی کا اعلان کیا۔ یوں سکھوں کی حکمرانی مضبوط تر ہو گئی اور یہ حکمرانی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات 1839ء تک رہی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد انگریزوں کی ریشہ دوانیوں نے زور پکڑا اور برطانوی استعمار نے سکھوں کو شکست دے کر 1850ء میں پنجاب پر اپنا مکمل تسلط قائم کر لیا لیکن مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان کشیدگی زوروں پر رہی۔ جب برطانوی استعمار پنجاب پر قابض ہوا تو مسلمانوں نے مسجد کی واہ گزاری کے لیے مختلف درخواستیں دائر کیں اور یہ معاملہ طول پکڑتا رہا اور آخر کار 1935ء میں برطانوی عدالت نے مسلمانوں کی ملکیت کو مسترد کر دیا۔ اس فیصلے کے بعد مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور یہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئی اور بڑے پیمانوں پر احتجاج ہوتے رہے۔ برطانوی استعمار نے ان دونوں گروہوں کے درمیان اس تنازع کو مزید ہوا دی اور یہ تنازعہ مزید شدت اختیار کرتا چلا گیا۔ جولائی 1935ء میں ایک ہنگامہ ہوا۔ نماز جمعہ پر اعلان کیا گیا کہ مسجد شہید گنج گرائی جا رہی ہے۔ بس اعلان کا سننا تھا کہ مسلمان نماز جمعہ کے بعد باجماعت مسجد شہید گنج کی طرف روانہ ہو گئے۔ مسلمان اور مسلح سکھ دونوں آمنے سامنے صف آرا ہونے والے تھے کہ سٹی مجسٹریٹ لاہور نریندر سنگھ نے انہیں منتشر کرنے کے لیے نہتے مسلمانوں پر لاٹھی چارج کا حکم دے دیا۔ جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ مسلمان مزید طیش میں آ گئے۔ لیکن اچانک اطلاع پر مولانا ظفر علی، اختر علی

خان، سید حبیب، ملک لال خان اور دیگر بہت سارے مسلمان زعماء وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے ہاتھوں کی زنجیر بنا کر مسلمانوں کو روکنا چاہا اور ساتھ ہی انہوں نے سکھوں کے سامنے بھی ہاتھ جوڑے۔ لیکن سکھ ٹلنے والے نہیں تھے کیونکہ لاہور کے بہت سے افسران سکھ برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا ظفر علی خان نے مسلمانوں کو پرجوش خطاب کیا اور انہیں بتایا کہ ہم سرکار سے بات کر رہے ہیں اور انشاءاللہ صبح تک معاملات بہتر ہو جائیں گے۔ مولانا کی یقین دہانی پر معاملہ کچھ ٹھنڈا ہوا۔ سکھوں کا بیان کچھ یوں تھا کہ اورنگزیب عالمگیر کے گورنر معین الملک نے اس جگہ پر سکھوں کا قتل عام کیا تھا اور یہ ہمارے شہیدوں کی یادگار ہیں اسی لیے ہم اسے "گردوارہ شہید گنج" کہتے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے سکھوں کا یہ دعوی غلط تھا۔ جب کہ بعد میں سکھوں نے "گردوارہ تحریک" چلائی اور بے شمار قربانیوں دیں۔ جس کی وجہ سے حالات کی نزاکت کے پیش نظر نواب مظفر خان نے سکھوں کا حق تسلیم کیا اور انہی کے دستخطوں سے شہید گنج سکھوں کے نام ہوئی۔ نواب مظفر خان مغلیہ دور میں لاہور کے گورنر تھے۔[35]

برطانوی دور حکومت 1925ء میں گردوارہ ایکٹ بنا تو اسے فہرست میں شامل کر کے اس کے قانونی حقوق سکھوں کو تفویض کیے گئے۔ سکھوں کو ملکیتی حقوق ملنے کے بعد برطانوی قانون میں مسلمانوں کا یہ دعوی انتہائی کمزور تھا۔ 1937ء کے صوبہ جاتی انتخابات قریب آ رہے تھے۔ برطانوی استعمار اپنی شاطرانہ سیاسی چالیں چل رہا تھا۔ اس کے علاوہ باقی جماعتیں بھی اپنا پورا اثر رسوخ استعمال کر رہی تھیں۔ سکھوں کے مختلف گروہوں میں شہید گنج کی وجہ سے کھینچا تانی تھی۔ ہر کوئی اس کا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ تاکہ نزدیکی انتخابات میں اس کے گروپ کو زیادہ نمائندگی حاصل ہو۔ پنجاب برطانوی استعمار کا مضبوط بازو تھا اس لیے اس کی کوشش تھی کہ یہاں پر اس کی حلیف حکومت ہو۔ اسے کسی صورت اپنے مخالف حکومت پسند نہیں تھی۔ ہندو اکثریتی صوبوں میں بھی یہی صورتحال تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ایسی حکومت وجود میں آئے جو ان کی منشا و مرضی کے مطابق ہو۔ ان معاملات کو حل کرنے کے لیے برطانوی استعمار نے ہندو، مسلمان اور سکھوں کو پہلے سے ہی دست گریبان کیا ہوا تھا مزید برآں انہوں نے شہری اور دیہی تقسیم کی۔ برطانوی استعماری مقاصد کے حصول کے لیے صوبہ پنجاب انتہائی اہمیت اختیار کر گیا۔ کیونکہ یہ صوبہ

سیاست، معیشت، آگاہی، شعور، انقلاب، تہذیب، تعلیم، ثقافت، حرفت، بہادری، جفاکشی، سیاست دان حتی کہ ہر میدان میں پیش پیش تھا۔ اس لیے استعمار کی منصوبہ سازی بھی اس کے لئے تھی 1923ء میں یونینسٹ پارٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ پنجاب کے حالات فرقہ واریت، سیاسی جماعتوں کا ایک دوسرے سے دست و گریبان ہونا اور مختلف تحریکوں کی بدولت کافی مخدوش تھے۔ برطانوی استعمار اپنے کارندوں کے ذریعے یہ بات باور کروانے میں کامیاب رہا کہ ان تمام طبقات کے مفادات اور حقوق کا تحفظ اس کی ذمہ داری ہے لہذا یونینسٹ پارٹی نے مشترکہ مفادات کے لیے مشترک جدوجہد کو شعار بنایا۔ اس کے اہم رہنماؤں میں فضل حسین اور چوٹورام قابل ذکر ہیں انہوں نے برطانوی حکومت کے تعاون سے پنجاب میں زرعی اور دیہی ترقی میں اہم پیشرفت کی۔ اور یہ پارٹی صوبہ جاتی انتخابات میں برطانوی استعمار کی پشت بان رہی۔ اس لئے شہید گنج قضیے کو طوالت دی گئی۔ اپنے من پسند لیڈروں کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ اپنے ایجنٹوں کے ذریعے ان کی تقاریر باقاعدہ تقطیع ہوتی رہیں۔ ان کی تقاریر نے لوگوں میں ایک ہیجانی کیفیت برپا کی۔ اور ایسے جوشیلے مقرر پیدا کیے جنہوں نے مخالف فریق کے علاوہ حکومتی اہلکاروں کو بھی اپنا نشانہ بنایا اور گاہے گاہے گرفتار ہوتے چلے گئے اور رہائی پاتے گئے۔ بے شمار نوجوانوں نے اسی جذبے اور مذہبی محبت میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ مولانا ظفر علی خان کے ساتھ کانگرس، خلافت کمیٹی اور دوسرے مسلمان زعماء ان کی قیادت میں اکٹھے ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی آپس کی سیاسی چشمک برقرار رہی کیونکہ ان میں سے بیشتر سرکاری اہلکار ان کے آلہ کار تھے۔ جن کی طنابیں ان کے ہاتھ میں تھی اور وہ کٹپتلی کی طرح متحرک رہے۔ مسجد شہید گنج کا حصول دیوانے کی بڑھ نکلا۔ اخباروں کے ذریعے اعلان کیا گیا کہ ظہر کی نماز شاہی مسجد میں ادا کی جائے گی اور مسجد شہید گنج کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار کیا جائے گا۔ جس کی بابت مسلمانوں کا جم غفیر شاہی مسجد کی طرف رواں دواں ہوا۔ "مجلس احرار الاسلام" نے اس تحریک میں شامل ہونے سے انکار کر دیا اور کہلوا بھیجا کہ ہم مسلمانوں کے خون ناحق کی ذمہ داری لینے سے قاصر ہیں۔ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے انتظامیہ نے دفعہ 144 نافذ کر دی اور بڑے بڑے مسلمان سیاسی رہنماؤں کو نظر بند کر دیا گیا اور مسجد کے اطراف میں پولیس کی بھاری نفری تعینات کر دی گئی۔[36] "انجمن فرزندان توحید"

کے جنرل سیکرٹری حافظ معراج دین جنہیں کسی صدر اور مقرر کی تلاش تھی وہ شورش کشمیری کے پاس آئے اور کہا: "بھائی اٹھو! خدمت کا وقت ہے, صرف تین ماہ قید ہے اور وہ بھی اسلام کے لیے "[37]

استعمار کی ستیزہ روی جاری رہی اور کارکنان کے ساتھ لیڈران بھی قید کر لیے گئے اور یہ جم غفیر انتہائی مضطرب تھا۔ اس کیفیت کو دیکھتے ہوئے اچانک شورش کشمیری نے آمادگی کا اظہار کیا اور جلسہ میں شامل ہو گئے۔ ان سے پہلے بہت سارے مقررین نے پر مغز تقریریں کیں اور سکھوں کو خوب سنائیں۔ لیکن شورش کاشمیری کا ذہن ادبی ہونے کے ساتھ رداستعماری بھی تھا۔ انہوں نے یہ سارا ملبہ گورنر سر ہربرڈ ایمرسن پر ڈال دیا اور جوش خطابت میں یہاں تک کہہ گئے کہ انشاءاللہ مسجد شہید گنج میں اذان کی آواز بلند ہو گی اور دہلی کے لال قلعہ پر اسلامی پرچم لہرائے گا اور مسجد شہید گنج کے در و دیوار ہمارے خون کے منتظر ہیں۔ شاہی مسجد کے اس جم غفیر کا جذبہ قابل دید تھا۔ نعرہ تکبیر اللہ اکبر کی فلک شگافتہ صدائیں بار بار بلند ہوتی رہیں۔ شورش کاشمیری حالات کی نزاکت کو بھانپ گئے اور جان بچا کر بڑی مشکل سے شاہی مسجد سے نکلے اور چھپتے چھپاتے اپنے ایک دوست کے ہاں پناہ لی۔ پولیس نے انہیں پکڑنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی اور کئی جگہوں پر چھاپے مارے۔ شاہی مسجد کے تمام مقررین کو پہلے ہی گرفتار کیا جا چکا تھا۔ دوسرے دن پولیس انتہائی چوکس تھی۔ شورش کشمیری کا اب مسجد میں جانا خطرے سے خالی نہ تھا لیکن قدرت خداوندی سے شاہی مسجد میں داخل ہو گئے۔ اجتماع پہلے سے بھی دوگنا تھا۔ جب انہوں نے شورش کشمیری کو دیکھا تو نعرہ تکبیر بلند کرتے چلے گئے۔ آج ان کی یہ دوسری تقریر تھی جس میں انہوں نے برطانوی استعمار کو اپنا ہدف تنقید بناتے ہوئے کہا: "حکومت کو راستے سے ہٹ جانا چاہیے ہم سکھوں سے خود فیصلہ کر لیں گے کہ مسجد پر کس کا حق ہے "[38]

سادہ لوح مسلمان فرط جذبات سے اپنے پر قابو نہ رکھ سکے انہوں نے فلک شگاف نعروں سے زمین و آسمان ایک کر دیا اور شورش کشمیری کے ہاتھ چومنے لگے۔ عقیدت مندوں کی طرح سادہ کپڑوں میں ملبوس سی آئی ڈی والوں نے بھرے مجمع میں نعرے لگاتے ہوئے حلقہ بنایا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ جب دروازے کے قریب پہنچے تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ لوگ انہیں چھڑانے کے لیے آگے بڑھے تو پولیس

کی بھاری نفری نے شدید لاٹھی چارج کیا۔ اس کے مقابلے میں عوام نے ان پر اینٹوں کی بارش کر دی۔ خوب دنگا و فساد ہوا۔ آخر کار انہیں بورسٹل جیل لاہور منتقل کر دیا گیا۔[39]

استعماری ہتھکنڈوں نے پولیس اور عوام کے درمیان زبردست تناؤ پیدا کر دیا۔ امین الدین صحرائی نے نماز جمعہ کے بعد ہزاروں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے استعماری چالوں کو بے نقاب کیا اور گورنر کی دھمکی کو لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہوئے جیب سے سرکاری نوٹس نکال کر عوام کے سامنے پرزے پرزے کر دیا اور اعلان کیا کہ ہم سب شہید گنج کی طرف جائیں گے۔ اب ہمارا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔ اب صرف "مسجد یا موت" چاہیے۔ انتہائی برانگیختہ جلوس مسجد سے نکل کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوا تو پولیس نے پانی والے تالاب کے پاس روک لیا اور یہاں خوب جھڑپیں ہوئیں۔ بے شمار نوجوان زخمی ہوئے اور سینکڑوں نوجوانوں کو گرفتار کر کے سینٹرل جیل پہنچا دیا گیا لیکن وہ اپنے مشن سے ذرا برابر بھی پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہ تھے۔ پولیس تھک چکی تھی اور جس کا کارکنان نے فائدہ اٹھایا اور دہلی دروازے تک پہنچ گئے۔ پورا شہر کرفیو کی لپیٹ میں تھا۔ کوئی بڑی سڑک ایسی نہ تھی جو پولیس کے قبضے میں نہ ہو۔ دہلی باغ میں فوج نے کیمپ لگا رکھے تھے ان میں سکھ، مسلمان اور گورا سپاہی اور انگریز افسر انتہائی مستعدی کے ساتھ کھڑے تھے کیونکہ سکھ فوجیوں کی وجہ سے مسلمان فوجیوں کے کچھ تحفظات تھے اس لیے بلوچ اور سکھ رجمنٹ کے درمیان تصادم ہوتے ہوتے رہ گیا۔ انگریز افسروں نے جلد ہی اس پر قابو پا لیا۔ شہر میں جوش دیدنی تھی اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ غریب مسلمان ماؤں کے غیرت مند بیٹے رسم اسماعیل ادا کرنے کے لیے تیار تھے۔ گولیوں کی سنسناہٹ ماحول میں خوف اور ہیبت کی علامت بنی ہوئی تھی لیکن ان نوجوانوں کے ماتھے جذبہ شہادت کے شوق میں خوشی و مسرت سے روشن تھے۔ استعماری قوتوں کے سامنے رد استعماری الاؤ روشن کیے بیٹھے تھے۔ دہلی دروازے کے سامنے میدان حشر بنا ہوا تھا۔ نوجوان کفن باندھے اللہ اکبر کی صدائیں بلند کرتے کھڑے تھے۔ ایک ایک نوجوان آگے بڑھتا تو مقامی استعماری ایجنٹ ڈپٹی کمشنر ایس پر تاب حکم دیتا تو نشانہ باندھے گورے اس پر گولی چلا دیتے اور وہ کلمہ شہادت پڑھتا ہوا جان جان آفریں کے سپرد کر دیتا۔ چشم زدن سے ایک خوبصورت نوجوان جو کہ اپنے ماں باپ کی اکلوتا بیٹا تھا۔ نیلی

قمیض پہنے استعمار کے سامنے بٹن کھول کر سینہ سپر ہوا اور اسے للکارا اس کے منہ سے اللہ اکبر یا رسول اللہ یا علی مدد کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ گورے نے اشارہ پاتے ہی اس کی ٹانگوں پر فائر کیا۔ وہ لڑکھڑایا اور پھر اٹھا اب گولی اس کی ران پر لگی لیکن وہ اس کے جذبے کو ٹھنڈا نہ کر سکے اس نے اپنے سینے پر مکا مارتے ہوئے استعمار کو مخاطب کیا کہ یہاں گولی چلاؤ اور اس کے منہ سے یا علی یا علی کے صدا بلند ہو رہی تھی۔ آخر کار ایک گولی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی اور وہ کلمہ شہادت پڑھتا ہوا اپنی منزل کی طرف رواں ہوا۔[40] یہ منظر اتنا وحشت ناک تھا کہ سرکاری اہلکار بھی انگشتِ بدانداں ہو گئے لیکن انگریز نہتے مسلمانوں پر گولی چلا رہا تھا۔ اسے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ کیونکہ مسلمان فوجیوں نے اپنے انگریز افسروں سے کہہ دیا تھا کہ اگر سکھ مسلمانوں پر گولی چلائیں گے تو وہ ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دیں گے۔ اس ستم ظریفی پر مسلمان فوجیوں کی انکھیں پر نم ہو گئیں۔ اس طرح کے بے شمار خونچکاں واقعات رونما ہوئے کہ جسے دیکھ کر انسانیت بھی دم توڑ جاتی ہے۔ اسلام زندہ باد، شہید نوجوان زندہ باد، شہید گنج زندہ باد، برطانیہ مردہ باد، ڈاؤن ڈاؤن یونین جیک کی صدائیں مسلسل آتی رہیں۔ اس وقت لاہور کے کوتوال مرزا محمد باقر تھے ان کی انکھیں بھی پر نم تھی انہوں نے کہا

> "عزیزو! بہت سی زندگیاں ضائع ہو چکی ہیں، حرام خور لیڈر گھروں میں گھسے ہوئے ہیں یا گورنر کی چوکھٹ پر سجدہ کر رہے ہیں، تم بچے ہو اپنے آپ کو ضائع نہ کرو"[41]

رد استعماری مزاحمت جاری تھی لیکن ایثار کا یہ تاریخی مظاہرہ نوجوانوں کو امر کر گیا قربانی و استقامت کی عمدہ مثال قائم کی۔ بغیر کسی لیڈر کے یہ نوجوان اپنے مقصد کے حصول کے لیے ڈٹے رہے اب ان کا مقصد شہادت تھا۔ کفن پہن کر یکی دروازہ اور دہلی دروازہ پر کھڑے رہے۔ گولیاں چلتی رہیں، لاشے اٹھتے رہے، جلوس نکلتے رہے اور نوجوان بڑے جوش و جذبہ سے اپنے شہیدوں کو سپردِ خاک کرتے رہے۔ حالات سنگین سے سنگین تر ہوتے چلے گئے۔ اس صورتحال کو دیکھ کر گورنر بھی مضطرب ہوا اور کوتوالی پہنچ گیا۔ حکومت اندر سے کھوکھلی ہو چکی تھی اور ان میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ اس خون خرابے کو مزید جاری رکھ سکے۔

گورنر نے مسلمان لیڈروں میں سے اپنے پشت بینوں کو اکٹھا کیا اور انہیں پیغام دے کر لوگوں میں بھیجا۔ کہ انہیں سمجھا بجھا کر واپس کر دیا جائے۔ انہوں نے مولانا ظفر علی خان کا فرضی بیان غم زدہ لہجے میں تقریری انداز سے پڑھ کر سنایا اور لوگوں کو بتایا کہ اس محاذ کو ختم کر دو۔ آپ کی جانیں انتہائی قیمتی ہیں اور اب صورتحال بہتر ہو رہی ہے۔ لوگوں نے اس فریب میں آکر استعمار کے خلاف مورچہ ختم کر دیا۔ روزنامہ "انقلاب" اور "احسان" کے علاوہ تمام مسلمان اخباروں کو بند کر دیا گیا۔ حالانکہ "احسان" عوامی تحریک کا حمایتی تھا۔[42] جب مسلمانوں نے یکی دروازہ اور دہلی دروازے کا محاذ ختم کیا تو انگریز سرکار نے سکھ کا سانس لیا۔ گورنر ایمرسن نے وزار کا ایک اجلاس بلوا کر اپنا غصہ نکالا اور ملک فیروز خان نون کو خوب جلی کٹی سنائیں۔ ہفتے عشرے میں گرفتار نوجوانوں کو رہا کرنا شروع کر دیے ما سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے حکومتی اہلکاروں کے خلاف تقریریں کیں۔ ان کے خلاف مقدمات میں جھوٹے گواہ پیش کیے گئے۔ مجسٹریٹ ٹیل نے شورش کشمیری کو دو سال قید اور 300 روپے جرمانے کا حکم سنایا۔ یہ ان کی قید کا پہلا حکم نامہ تھا اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو ایک ایک سال قید اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو جرمانے کی سزا دی۔ اس سزا سے ہٹ کر غیر ضابطہ سزاؤں کی بھرمار کی گئی لیکن انہوں نے استقامت دیکھائی حالانکہ صعوبتوں اور بد سلوکیوں کا یہ دور ناقابل برداشت تھا۔ یہ قیدی کو انسان نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کیا جاتا، ان سے اس قسم کی مشقت لی جاتی کہ جس میں انہیں اپنی عزت نفس کا احساس ہی نہ رہے اور وہ خود اپنے آپ کو حقیر اور ذلیل سمجھیں۔ قضیہ شہید گنج پر رنرز ڈیفنس کمیٹی (Runner'Defense Committee) نے ہماری رہائی کے لیے اپیلیں دائر کر رکھی تھیں۔ یہ کمیٹی رد استعماری کوششوں کا دفاع کرنے کے لیے بنائی گئی تھی اس کمیٹی نے قانونی ماہرین، سماجی کارکنان، وکلا اور مخیر حضرات کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا گیا تاکہ برطانوی استعمار کے ظلم اور اس کی دھمکیوں کا حل نکالا جاسکے اور اس کے خلاف کوئی قدم اٹھاتے ہوئے مدد کی جاسکے۔ مسٹر الفریڈ رابرٹ کارنیلیس سیشن جج لاہور تھے۔ انہوں نے سزائیں تین تین ماہ کر دیں اور جرمانہ ختم کر دیا۔ جج کارنیلیس تبدیل ہو گیا اور ان کی جگ کشمیری پنڈت مسٹر اونکار ناتھ زتشی تبدیل ہو کر

آ گئے۔ انہوں نے دوسرے مقدمے میں بری کر دیا اور تمام شہید گنج قیدی تین چار روز میں رہا کر دیئے گئے۔[43]

برطانوی استعمار کی چال کامیاب رہیں انہوں نے دہلی دروازے کا محاذ ختم کرواکر اپنا ہدف حاصل کر لیا تھا اوراس ہدف کے حصول کے لئے مقامی استعمار اور استعمار زدہ کو استعمال کیا گیا۔ اسے دوہری شخصیت(Double Consciousness)کانام دیا جاتا ہے۔ یہ ایک شعوری اصطلاح ہے جو کسی بھی فرد کو اپنی ذات میں دو مختلف طریقوں سے رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ ان نفسیاتی اشخاص کے بارے میں تشخیص ہے جو سماجی سطح پر کسی دباؤ کے تحت اپنی شخصیت کو متوازن کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ تصور امریکی مفکر ڈبلیو ای بی نے پیش کیا۔ استعمار نے اس تصور سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ان میں سے ایک تصور یہ تھا" تقسیم کرو اور حکومت کرو" جس کے تحت پہلے استعمار زدہ کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا گیا اور پھر ان کے اندر مختلف قسم کے تنازعات پیدا کیے تا کہ وہ ان سے الجھ کر سرگرداں رہیں۔ شہید گنج کا المیہ طول پکڑتا چلا گیا کیونکہ اس کے ساتھ بہت سارے استعماری کاسئہ لیسوں کی سیاست وابستہ تھی۔ سیاسی اور مذہبی کارکنان کو وقفے وقفے سے مشکل سے مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑتا۔ وہ مشیت ایزدی سمجھتے ہوئے تمام مشکلات کو اپنے لیے اعزاز سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ حتی کہ جانوں کا نذرانہ بھی سینہ تان کر دیا۔ یہ ان کی عقیدت کی انتہا تھی۔ لیکن ان کے ساتھ مقامی استعمار جو کھیل کھیل رہا تھا وہ بھی کسی آزمائش سے کم نہ تھا۔ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے آزادی پسند، سادہ اور مظلوم لوگوں کی باگ دوڑ ان مقامی استعماری لیڈروں کے ہاتھوں میں ہے۔ جو برطانوی استعمار کے اگر آلہ کار نہیں ہیں تو زلہ خوار سہی اگر وہ بھی نہیں ہیں تو افادی سیاستدان دکھائی دیتے ہیں۔ شہید گنج کا المیہ بھی کچھ اسی طرح کا تھا۔ بڑے بڑے سیاست دانوں کو نظر بند کر دیا گیا۔ اس معاملے میں جب تمام تنظیمیں ٹھنڈی پڑ گئیں تو استعمار نے نیا کارنامہ انجام دیا۔ شہید گنج کے حصول کے لیے راولپنڈی میں ایک نئی تنظیم " مجلس اتحاد ملت" بناڈالی اور اس مجلس کے میر کارواں پیر جماعت علی شاہ علی پوری بن گئے۔ یہ وہی پیر صاحب ہیں کہ جن کے تعویز پہلی جنگ عظیم میں برطانوی فوج کے مسلمان سپاہیوں میں تقسیم کروائے گئے تا کہ ترک گولیاں ان پر اثر نہ کر سکیں۔ پہلی جنگ عظیم کی فتح پر پنجاب کے

علماء و مشائخ نے سر مائیکل ایڈوائر کو سپاس نامہ پیش کرتے ہوئے مبارکباد دی تو اس سپاس نامہ پر جماعت علی شاہ صاحب علی پوری کے دستخط بھی موجود تھے۔ اور یہ سب ان سیاسی بونوں کی مرہون منت تھا جو اپنے آپ کو ہر قالب میں ڈالنے کا فن جانتے تھے۔ بہر حال پیر صاحب شہید گنج تحریک کا روح رواں بن گئے اور امیر ملت کہلائے۔

امیر ملت پیر جماعت علی شاہ صاحب مقامی استعمار کی منصوبہ سازی پر لاہور کی طرف عازم سفر ہوئے تو ان کا لاہور میں بھرپور استقبال کیا گیا اور اتنا بڑا استقبالیہ جلوس لاہور کی تاریخ میں پہلے دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ پیر صاحب نے فرط جذبات میں اعلان کیا کہ اگر مسجد شہید گنج مسلمانوں کے حوالے نہ کی گئی تو میں شاہی مسجد کے مینار پر چڑھ کر چھلانگ لگا دوں گا۔ پیر صاحب کا یہ اعلان کرنا تھا کہ پورا اجتماع جھوم اٹھا۔ پیر صاحب کی اتنی پذیرائی ہوئی کہ اس کے مثال ملنا مشکل تھی۔ لیکن سادہ لوح عوام اس لمحے کے منتظر رہے جو اس ابتلاء و آزمائش کے دور میں کبھی بھی نہ آنے والا تھا۔ پیر صاحب نے حکومتی کاسہ لیسوں کے کہنے پر ایسا کیا لیکن جب وہ حقیقت احوال سے باخبر ہوئے تو انہیں اس کی نزاکت کا علم ہوا۔ بالاخر یہ عذر پیش کیا گیا۔ کیونکہ شاہی مسجد کا امام وہابی ہے اس لیے پیر صاحب آج تک کسی وہابی مسجد میں نہیں گئے۔ وہ اپنے وعدے کی پاسداری کے لیے معذور ہیں۔ کچھ عرصہ بعد پیر صاحب اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اگر اس واقعے کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیر صاحب انتہائی سادہ انسان تھے اور وہ سیاست کی بھول بھلائیوں سے ناواقف تھے۔ انہیں عوامی اجتماعات اور تحریکوں کے مزاج کا بھی علم نہ تھا۔ وہ مسجد کے لیے درد دل رکھتے تھے اور وہ اس قضیہ کو سلجھانے کے لیے نیک نیتی سے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ وہ ان اسیر ان کو رہا کروانا چاہتے تھے کہ متحد ہو کر کوئی ایسا حل نکالا جائے کہ شہیدوں کا لہو رائیگاں نہ جائے۔ لیکن بے بس ٹھہرے۔ انہوں نے جو کچھ کیا وہ اپنے مریدین جو بظاہر مقلد بنے ہوئے تھے ان سے مشورے کرتے رہے۔ کیونکہ ان کی ارادت میں بڑے بڑے لوگ شامل تھے۔ لیکن جب انہیں حالات کا اندازہ ہوا تو وہ سمجھتے تھے کہ یہ ان کے بس کی بات نہیں۔ پیر صاحب کے ارد گرد جن خواص کا حلقہ تھا وہ سب برطانوی استعمار کے آلہ کار تھے وہ پل پل کی خبر پہنچاتے اور وہاں سے ہدایات لے کر اس پر عمل پیرا ہوتے۔ یہ تمام لوگ استعمار کے

سیاسی مہرے تھے انہیں استعمال کرنے کے لیے یہ پلیٹ فارم تجویز کیا گیا۔ کچھ لوگ مختلف جماعتوں سے سیاسی چشمک کی وجہ سے اس میں شامل ہوئے اور کچھ نے شمولیت اس لیے اختیار کی کہ وہ استعمار کی خوشنودی حاصل کر پائیں گے۔ یہ سارا 1937ء کے صوبہ جاتی انتخابات کے لیے راہ ہموار کی جارہی تھی۔ پیر صاحب کے سامنے اگر کوئی سوال کرنا چاہتا تھا تو اسے بولنے نہیں دیا جاتا انہیں یہ کہہ کر چپ کروادیا جاتا تھا کہ یہ پیر صاحب کی طبیعت کے لیے نامناسب ہے یا آداب کے منافی ہے۔ دراصل پیر صاحب کے قریبی ساتھی اپنے اپنے مفادات کے لیے اپنے مورچوں پر براجمان تھے اور ان کا مطمع نظر بھی یہی تھا کہ حالات جوں کہ توں رہیں اور وہ اپنا الو سیدھا کرتے رہیں۔ لیکن وہ لوگ جو شہید گنج سے مخلص تھے وہ پیر صاحب کے سامنے بھی ہلکی ہلکی آواز بلند کرتے رہے اور اپنے مقصد پر ڈٹے رہے یہاں تک کہ پیر صاحب حج پہ چلے گئے۔[44]

دوہرے شعور کا تصور بھی سماجی سطح پر جاگزیں رہا۔ ایک فرد خود کو اپنے مفادات کی نظر سے دیکھتے ہوئے اپنی ذاتی شناخت یا تسکین کے لیے عمل کرتا ہے اور کبھی اپنے نقطہ نظر یا اپنی حیثیت کو بہتر اور موزوں خیال کرتے ہوئے بار بار نظر ثانی کرتا ہے یا اس کی تبدیلی کے لیے تگ و دو کرتا ہے۔ مسلمان جو برطانوی استعمار کے ملازم تھے۔ انہوں نے حق نمک اپنے عہدے سے بھی بڑھ کر ادا کیا۔ انہوں نے اپنی ملازمت ذاتی فائدے یا ذاتی عناد کے لیے کی۔ بڑے بڑے ادیبوں اور سیاست دانوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ مقامی استعماری اہلکاروں کی خوشامد اور بے جا تابعداری میں گزار۔ اس کی مثال کچھ یوں ہے کہ شہید گنج المیہ کے دوران مسلمانوں نے یکی دروازہ اور دہلی دروازہ پر جو محاذ قائم کیا تھا جس پر نوجوانان اسلام پر گولی چلائی گئی اور بہت ساروں نے شہادت کا رتبہ پایا اور کچھ استعماری اہلکاروں نے مسلمان رہنماؤں کے ذریعے ان جگہوں پر قائم حکومت کے خلاف مورچہ بندی ختم کروائی۔ اس واقعے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگا یا جاسکتا ہے کہ صوبے کا گورنر ایک ڈپٹی کمشنر کے لیے عصرانہ کا بندوست کرتا ہے۔ یہ بڑی اچنبے کی بات تھی۔ اس عصرانہ میں مسلمان بھی شامل تھے اور اس کے علاوہ دوسرے مسلمان عہدے داران اور اکابرین بھی موجود تھے۔ جس میں اس ڈپٹی کمشنر کی تعریف کی گئی اور ستم ظریفی یہ کہ مسلمان زعمانے بھی اس کی

تعریف کی۔ وہ سیاسی، ادبی یا دانشور طبقہ جو اجتماعیت کو چھوڑ کر ذاتی نفع و نقصان کی طرف آیا تو اسے وقتی فائدہ تو پہنچا لیکن سماجی سطح پر اپنی ذات اور حیثیت کو داؤ پر لگا دیا۔ شہید گنج کے قضیے میں اس طرح کی بہت بڑی بڑی شخصیات دیکھنے میں آتی ہیں۔ انہوں نے استعمار کی دلاویزی بھی کی اور مسلمانوں کے لیے دوڑ دھوپ بھی یعنی دونوں محاذوں پر قائم رہے۔ اس کے علاوہ ان رہنماؤں کی آپس میں بھی سیاسی چشمک تھی جس کے باعث وہ عوامی سطح پر اس کا اظہار بھی کر دیتے تھے اور انتظامی سطح پر اپنے تعلق والے اہلکاروں سے مدد لے کر اپنا قد اونچا کرنے کی کوشش کرتے تھے

تحریک کی ڈور مقامی استعمار کے ہاتھ میں تھی جب چاہا ڈھیلی کر دی اور جب چاہا تحریک کا دوبارہ سے تن تنا بجا دیا اس لیے تحریک کا یہ عالم تھا کہ کبھی وہ انتہائی متحرک ہوتی اور اس کا جوش و جذبہ انتہائی شاندار ہوتا۔ اور کبھی سنسناہٹ سنائی دیتی۔ آخر کار اہلکاروں نے اپنی ترقی کے لیے شہید گنج کے واقعے کو پھر سے زندہ کر دیا۔ شاہی مسجد میں تقاریر کا سلسلہ دوبارہ سے شروع ہو گیا۔ قید اور رہائی کی آنکھ مچولی جاری رہی۔ لیکن یہ حالات و واقعات اپنا اظہار کرتے رہے اور ان میں ملوث شخصیات تاریخ کے دھارے پر عیاں ہوتی رہیں۔ سماجی سطح پر ہر طبقہ ہائے فکر نے اپنا اپنا حصہ ڈالا۔ ادنیٰ سے ادنیٰ کارکن نے کوشش کی کہ مسلمانوں کو حالات کی سنگینی سے بچایا جا سکے۔ ہر کسی نے دامے، درھمے، سخنے مدد کی۔ ان سے جو کچھ ہو سکا انہوں نے کیا۔ اس کی یہ مثال آنکھیں کھول دینے کے مترادف ہے۔ حکومتی اہلکار ایک نوجوان کو گرفتار کرنے کے لیے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ بڑے بڑے متقیوں اور زاہدوں نے اسے پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس نوجوان نے شاہی مسجد سے ملحقہ گھر میں پناہ لی۔ وہ ایک طوائف کا گھر تھا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ تم نے تو بڑی دلیری دکھائی کہ سرکاری مفرور کو جگہ دی اس کے جواب میں اس نے کہا کہ میں گنہگار ہوں اور میرے نامہ اعمال میں کوئی نیکی بھی تو ہونی چاہیے۔ یہی وہ جذبہ تھا جو اس تحریک نے لوگوں میں پیدا کیا۔ اس کا دوسرا رخ کچھ یوں ہے کہ شاہی مسجد کہ جلسہ میں ایک کارکن نے سی آئی ڈی والوں کا نام لے کر ان کی ظلم و ستم کی داستانوں کو بیان کیا۔ ان کے غیر قانونی و غیر اخلاقی اور غیر انسانی اقدامات کو برا بھلا کہا اور وہ یہاں تک کہہ گئے کہ یہ لوگ امام حسینؑ سے بھی محبت کرتے ہیں اور یزید پر لعنت بھی بھیجتے ہیں لیکن ان کے حالات ایسے

ہیں کہ یہ اپنے ہی بھائیوں کی جاسوسی بھی کرتے ہیں اور انہیں بلاوجہ پابند سلاسل بھی کرتے ہیں، اذیتیں بھی دیتے ہیں اور ان پر گوروں سے گولیاں بھی چلواتے ہیں کیا یہ ان کا کردار قابل تعزیر نہیں ہے، کیا یہ خدا کو منہ نہیں دکھائیں گے۔ اس تقریر میں یہ تجویز بھی دی گئی کہ اب تقریباً چار پانچ سو لوگ مسجد میں ہی رہیں گے اور اس کا طریقہ کار یہ طے پایا کہ ہر شخص ہفتے میں ایک دن مسجد میں رہے گا۔ اس سے پولیس پریشان ہوئی اور وہ ایک نئے محاذ کو برداشت نہیں کر سکتی تھی یہ استعمار زدہ کا ردِ استعماری رویہ تھا کہ اپنے حقوق کے لئے قید بند کی تکلیفیں سہی۔ مسجد میں رہنے والوں کے لئے لنگر کا انتظام کیا گیا اور لوگ جوق در جوق اپنے فرائض منصبی سمجھتے ہوئے اس میں شرکت کرنے لگے۔ لنگر کا انتظام و انصرام دو بزرگ نیک و صالحین نے سنبھال لیا۔ ایک روز رات کی چائے میں نشہ آور چیز ملا کر پلا دی گئی جس سے تمام لوگ گہری نیند میں چلے گئے اور پولیس کی بھاری نفری اس کارکن کو گرفتار کر کے لاہور چھاونی تھانے لے گئی اور اسے الٹا لٹکا کر خوب پٹوایا اور انواع و اقسام کی خوب گالیاں دی۔ مقدمہ قتل سمیت کئی دفعات لگائی گئیں اور اسے جیل بھیج دیا۔ شہید گنج ہی کے سلسلے میں ایک مقدمہ مسٹر ایسر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں چل رہا تھا۔ گواہ صفائی نے بتایا کہ اگر عدالت اسے حفاظت کا یقین دلائے تو وہ تمام واقعات کو من و عن بیان کر سکتے ہیں کہ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مسجد شہید گنج حکومت نے منہدم کروائی اور اس میں بعض سرکاری افسران ملوث ہیں۔ جب حکومت سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے منفی جواب دیا۔ اور یہ کہانی زبان زد عام تھی کہ شہید گنج کو منہدم کرنے میں گورنر کا ہاتھ ہے کیونکہ وہ پنجاب کے سیاسی حالات کو خراب کرنا چاہتا تھا۔ قائداعظم نے گورنر کی شکایت گورنر جنرل سے کی۔ گورنر جنرل نے قائداعظم سے کہا کہ وہ اپنی لیاقت کے مطابق اس معاملے کو سلجھائیں۔ حکومت ان سے ہر طرح کا تعاون کرے گی اس لیے قائداعظم لاہور تشریف لائے انہوں نے اس پوری صورتحال کا جائزہ لیا اور وہ گورنر سے بھی ملے۔ جس کے نتیجے میں تمام سیاسی قیدیوں کی رہائی کا فیصلہ کیا گیا اور انہیں رہا کرنے کا حکم دیا گیا اور تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ لیکن کچھ قیدیوں کے حوالے سے حکومتی اہلکاروں نے پس و پیش کی لیکن قائداعظم کے کہنے پر انہیں بھی رہا کرنا پڑا۔ قائداعظم مقامی استعمار کے سامنے ڈٹ گئے اور آخر کار تمام کارکنان کو رہا کروایا لیکن اس تمام

صورتحال سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ۔ اس ردا ستعماری جدوجہد کرنے والے کارکنان کو پابند سلاسل کروانے والے اپنے ہی مسلمان منتظمین ورہنما تھے جو مقامی استعمار کے مخبر اور آلہ کار تھے۔[45]

مولانا ظفر علی خان رہائی کے بعد جب واپس آئے تو انہوں نے اخبارات "زمیندار" اور "سیاست" جن کو حکومت کے احکامات کے تحت بند کر دیا گیا تھا۔ مولانا کی کوششوں سے ان کا دوبارہ سے اجراء کیا گیا۔ مولانا رد استعماری قوتوں کا استعارہ ہیں۔ مولانا کو برطانوی استعمار کے خلاف گراں قدر خدمات پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا انہوں نے اپنی صحافت، شاعری اور سیاسی زندگی سے تحریک آزادی کو زندہ رکھا۔ روزنامہ "زمیندار" نے استعمار کے خلاف ایک مضبوط و موثر پلیٹ فارم مہیا کیا۔ اس کے علاوہ مولانا صاحب نے تمام نظر بند رہنماؤں کو اکٹھا کیا اور زمیندار کے دفتر میں ایک اجلاس ہوا جس کی صدرارت مولانا ظفر علی خان نے کی۔ جس میں "مجلس اتحاد ملت" کی تنظیم نو کی گئی۔ جس میں مولانا ظفر علی خان کو صدر منتخب کیا گیا اور جنرل سیکرٹری کے لیے ملک لال خان کا انتخاب ہوا کیونکہ مولانا سید حبیب کے نام سے متفق نہ ہوئے۔ جس کی وجہ سے شاہ صاحب ناراض ہو کر دفتر زمیندار اخبار سے اٹھ کر چلے گئے اور دوبارہ کبھی نہ آئے بلکہ انہوں نے مولانا کے خلاف بڑی شدومد سے لکھنا شروع کر دیا لیکن مولانا نے اس پہ توجہ نہ دی۔ اس کے بعد مولانا نے ایک ورکنگ کمیٹی بنائی۔ جس میں انہوں نے اپنے حلیف رہنماؤں کو نامزد کیا۔ شہید گنج قضیے پر قائداعظم ایک مشترکہ کمیٹی بنا گئے تھے جس میں سکھ، ہندوؤں اور مسلمانوں کی نمائندگی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ اس کا حل صلح و آشتی سے ہو لیکن ستم ظریفی یہ ہوئی کہ کوئی بھی فریق اپنے دعوی سے دستبردار نہ ہوا جس کی وجہ سے اس کمیٹی کے اجلاس کا انعقاد نہ ہو سکا کیونکہ ہر فریق اپنے اپنے شعوری خول میں مجبور تھا ۔ وہ اپنی اور مذہبی شناخت کو متوازن کرنے میں لگا رہا لیکن اجتماعیت کی طرف نہ آیا۔ یہی وہ دوغلا شعور ہے جو اس کی ذات کو منقسم کیے ہوئے تھا۔ صوبہ جاتی انتخابات کا دور دورہ تھا اور ہر کوئی اپنے لیے حلقہ انتخاب کا متلاشی تھا اور اس کی خواہش تھی کہ حلقے میں اس کی پوزیشن بہتر ہو۔ استعمار نے مذہبی شناخت کو گم کیا اور تنازع کو فروغ دیا تاکہ استعمارزدہ باہمی دست و گریبان رہیں۔ انہیں شہید گنج سے کوئی سروکار نہ تھا۔ تمام رہنماؤں میں نہ اخلاص تھا نہ ذہنی اتحاد اور وہ نہ ہی ایک دوسرے سے صاف تھے بلکہ دوسری جماعتوں کے

ساتھ ان کی کیفیت بھی کچھ اسی طرح کی تھی۔ مسلمانوں کی ایک جماعت کے نوجوانوں نے "مجلس اتحاد ملت" کے جلسوں کو درہم برہم کیا لیکن معاملات کنٹرول میں رہے۔ شورش کشمیری نے اس پلیٹ فارم سے واضح انداز میں عوام الناس کو بتایا کہ جتنا سکھوں کا قصور ہے اس سے کہیں زیادہ حکومتی اہلکاروں کا جرم ہے۔ اور اس کے ساتھ ان مسلمانوں کا بھی قصور ہے جنہوں نے حکومت کی خوشنودی اور اپنے مفادات کے لیے مسلمانوں کی جاسوسی کی۔ شورش کا یہ رد استعماری رویہ احکام بالا کو برا لگا۔ تو انہوں نے ان کے خلاف منصوبہ سازی شروع کر دی اور آخر کار وہ کامیاب ہو گئے۔ قصہ کچھ یوں ہوا کہ لاہور میں جلال الدین نامی ایک شخص نے "نیرنگ" نام سے ایک روزنامہ جاری کیا۔ جو پیشے کے اعتبار سے درزی تھا۔ بظاہر وہ "احرار" کا حمایتی نظر آتا جبکہ وہ اپنے روزنامہ میں مولانا ظفر علی خان کے خلاف لکھتا رہتا۔ ایک دن اس نے شورش کاشمیری کے خلاف "نظم مرصع" شائع کر دی۔ رات کو پیسہ اخبار چوک میں جلسہ تھا۔ شورش نے "نیرنگ" کا ذکر کرتے ہوئے جلال الدین پر ہلکا پھلکا تبصرہ کر دیا۔ سی آئی ڈی کے افسر نے غلط رپورٹنگ کی اور جلال الدین کے ذریعے پیسہ اخبار تھانے میں ان کے خلاف رپٹ درج کروادی کہ ان کے تقریر کی وجہ سے میری جان کو خطرہ ہے۔ ان کو حوالات میں بند کر دیا گیا اور بعد میں ان کا ریمانڈ لے کر لاہور سینٹرل جیل بھجوا دیے گئے۔ مقدمہ چلتا رہا اور پیشیاں ہوتی رہیں۔ اسی اثنا میں سی آئی ڈی افسروں سے صلح جوئی اور دھمکی کے پیغامات تواتر سے وصول ہوتے رہے۔ شورش اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور آخر کار جج نے موقع پا کر شورش سے اصل حقیقت پوچھی۔ حقیقت معلوم ہونے پر جج نے دو ہزار روپے زر زمانت داخل کرنے پر رہائی دے دی۔ جس سے پولیس کی امیدیں ماند پڑ گئیں۔[46]

استعمار نے قید و بند کا سلسلہ جاری رکھا جبکہ رد استعماری قوتیں اپنے اپنے ایجنڈے پر قائم و دائم رہیں تو اس طرح جلسے جلوسوں کا سلسلہ جاری رہا۔ مولانا ظفر علی خان پنجاب سے باہر کہ مسلمانوں کو قائل کرنے کے لیے دورے پر نکلے۔ لاہور میں کانفرنس کے انعقاد کی منصوبہ سازی کی گئی لیکن بہت سارے مقامی استعمار کے دوستوں نے بادل ناخواستہ کانفرنس کرنے کے لئے رضامندی ظاہر کرنا پڑی۔ لیکن پھر فنڈز کا مسئلہ پیدا ہوا جسے بعد میں حل کر لیا گیا۔ مولانا حسرت موہانی نے اپنی مصروفیت کی وجہ سے صدارت سے

معذوری ظاہر کی۔ اس کے بعد مولانا شوکت علی خان سے درخواست کی گئی تو انہوں نے آمادگی ظاہر کر دی۔ کانفرنس شروع ہونے سے دو روز قبل سی آئی ڈی نے اپنی کاروائیاں شروع کر دیں۔ ایک روز اچانک راستہ میں وہی سی آئی ڈی انسپیکٹر آغا عبدالرشید سے شورش کاشمیری کی ملاقات ہوئی۔ جس کی غلط رپورٹنگ سے ان پر مقدمہ بنا تھا۔ اس نے انہیں کسی ہوٹل میں چائے کی دعوت دی لیکن انہوں نے فوری انکار کر دیا کیونکہ وہ پہلے ہی برطانوی استعمار سے سخت نالاں تھے وہ اسے بلاوجہ کی مداخلت پر محمول کرتے تھے وہ اپنے حقوق اور آزادی کو مقدم سمجھتے تھے لیکن انسپیکٹر نے شورش کاشمیری کو اعتماد میں لینے کے لیے کچھ ایسی باتیں کیں کہ انہیں بادل نخواستہ راضی ہونا پڑا۔ سی آئی ڈی انسپکٹر عبدلرشید نے کچھ رہنماوں کا نام لے کر بتایا کہ میرے ان کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں وہ میرے ساتھ چائے پیتے رہتے ہیں۔ میں مسلمان ہوں اور تمہیں خطرے سے نکالنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم لوگ اپنی زندگیاں ضائع کرو کیونکہ جن لوگوں کو تم اعلی کردار اور فرشتہ سمجھتے ہو وہ دوہری شخصیت کے مالک ہیں۔ لیکن تم لوگ نہیں جانتے۔ شورش کاشمیری ان کے ساتھ ہوٹل میں چلے گئے وہاں اس نے کہا:

> "میں تمہیں نوجوان ساتھیوں میں سب سے زیادہ مخلص سمجھتا ہوں، میرا ضمیر چاہتا ہے کہ تمہیں خطرے سے روکوں اور اصل حالات بتاؤں، تمہارے خلاف سی آئی ڈی کے دفتر میں شکایتوں کا ایک انبار پڑا ہے، خود تمہارے لیڈر کہہ رہے ہیں کہ نوجوان نہیں مانتے، انہیں سمجھانا مشکل ہو گیا ہے، یقین کرو اگر تم نے ضد جاری رکھی تو سب سے زیادہ نقصان تمہیں ہو گا، ایک طویل عرصے کے لیے جیل چلے جاؤ گے اور فائدہ یا نتیجہ کچھ نہ ہو گا۔"[47]

انسپیکٹر کی بات کاٹتے ہوئے شورش کاشمیری نے دبنگ الفاظ میں کہا کہ کیا آپ مجھے ڈرانا چاہتے ہیں؟ انسپیکٹر نے اپنا بیگ کھولا اور بہت سارے کاغذ نکال کر کہا:

"یہ ہیں وہ قراردادیں جو ہمارے سپرٹینڈنٹ مرزا معراج دین نے تیار کی ہیں، یہی کانفرنس میں پیش ہوں گی۔ اردو ترجمہ کے فلاں لفظ پر حکومت کو اعتراض ہے وہ اس لفظ کی جگہ دوسرا لفظ چاہتی ہے"[48]

واقعی اس تحریر پر الفاظ نشان زد کیے ہوئے تھے۔ میں حیرانی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن اس نے پھر کہا:

"اس سودا بازی میں فلاں لیڈر نے کانفرنس کے لیے دو ہزار روپے لیے ہیں، میں یہ ترمیمی مسودہ لے کر اسی کے پاس جا رہا ہوں, کیونکہ حکومت اردو اخباروں میں ترجمہ کے الفاظ اپنی منشا کے مطابق رکھنا چاہتی ہے۔"[49]

یہ باتیں انتہائی حیران کن تھیں اور قابل غور بھی۔ انسپیکٹر نے رخصت ہونے سے پہلے کہا:

"ڈاکٹر عالم اس قرارداد کو پیش کر رہے ہیں خدا کے لیے میرا ذکر نہ کرنا، میں نے تمہیں مخلص سمجھ کر بتا دیا ہے, ان لیڈروں سے بچو, سب بے ایمان ہیں, کسی کے سامنے شہید گنج کے مسئلے کا حل نہیں. ان کے سامنے صرف الیکشن ہے"[50]

پر جوش ماحول میں رد استعماری رویے پنپ رہے تھے اور آزادی کے گیت گائے جا رہے تھے کیونکہ استعمار زدہ بے جا اذیتوں سے تنگ آ چکا تھا۔ کانفرنس کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ موچی دروازہ کے باغ کو خوبصورتی سے سجایا گیا اور لاہور کے دیوار و در مختلف رنگوں سے انتہائی خوش کن دکھائی دے رہے تھے۔ انتہائی منظم اور بہت بڑا جلوس نکالا گیا جس پر مولانا شوکت علی خان نے کہا کہ تحریک خلافت کے بعد اتنا عظیم و شان جلوس میں نے نہیں دیکھا۔ مولانا ظفر علی خان کو پتہ چل چکا تھا کہ نوجوان برطانوی سرکار کے خلاف سول نافرمانی کا ارادہ کر چکے ہیں۔ انہوں نے اور ان کے رفقائے کار نے نوجوانوں کو راضی کرنے کی کوشش کی لیکن نوجوان استعماری ہتھکنڈوں کو پہچان چکے تھے وہ صرف اپنے بزرگوں کی حکم معدولی کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن روز روز کی قید نے ان کا جینا دوبھر کر دیا تھا اس لیے وہ استعمار کے سامنے ڈھال بننے

کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ نوجوان طلا طم خیز موجوں کی طرح اٹھے اوراپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ جلسے کی کارروائی اسی طرح ہوئی جس طرح انسپیکٹر سی آئی ڈی نے کہا تھا۔ڈاکٹر عالم نے اپنی میناکاری ککے بڑے جوہر دیکھائے لیکن لوگ ان سے سرکش تھے۔ یعسوب الحسن نے مولانا شوکت علی خان سے اجازت لے کر تقریر کی اور کہا:

"ڈاکٹر عالم نوجوانوں کے مقدس لہو کو اپنی انتخابی مہم پر قربان کرنا چاہتے ہیں، شہید گنج کی شکستہ اینٹوں کے ووٹ بنائے جارہے ہیں، ایسا کبھی نہ ہو گا، ہماری لاشوں سے گزر کر ہی انتخابی چوگان کھیلی جاسکتی ہے۔"[51]

رداستعماری جذبہ بپھر چکا تھا اور وہ برطانوی استعمار کے ساتھ مقامی استعمار کو بھی رگید چکا تھا۔ڈاکٹر عالم کے چہرے کی ہوائیاں اڑ چکی تھیں۔ آہستہ آہستہ حالات قابو سے باہر ہو رہے تھے کہ اچانک مولانا ظفر علی خان سٹیج پر آئے اور انہوں نے بڑے دھیمے الفاظ میں اپنی تقریر کا آغاز کر دیا اور آہستہ آہستہ پنڈال کو قابو میں کیا۔ اور مولانا ظفر علی خان نے قرار دادیں پاس کروائیں اور اجلاس کو اگلے روز کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ [52]

سجاد ظہیر کا ناول" لندن کی ایک رات" 1936 ء میں اشتراکی افکار کی روشنی میں لکھا گیا ۔ یہ ایک علامتی ناول ہے اس میں اس میں سماجی ، ثقافتی اور سیاسی مسائل پر بات کی گئی ہے ۔ مغربی تہذیب اور استعمار زدہ کی معاشرت بیان کی گئی ہے ۔ وہ دور کیونکہ مارکسی نظریات کے پنپنے کا دور تھا اور اس سال ہندوستان میں کیمونسٹ پارٹی وجود میں آئی ۔ اسے ترقی پسند کہا جا سکتاہے ۔ سجاد ظہیر نے عمدگی سے مشرقی اور مغربی تضادات کو واضح کیا ہے۔ ان نظریات نے ان تحریکوں پر گہرا اثر کیا۔ لیکن مذہبی معاملات میں جذباتی رہے۔

برطانوی استعمار ، استعمار زدہ کو مقامی استعمار کے ذریعے اس طرح استعمال کر رہا تھا کہ جیسے وہ ان پر اپنا حق تصرف رکھتے ہوں۔ انہوں نے مسلمانوں کے درمیان ایسا پروپگنڈہ کیا کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھنے کے روا دار نہ رہے۔ جس سے مسلم جماعتوں کے اختلافات اس حد تک بڑھ گئے کہ وہ جلسوں میں ایک دوسرے

کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے پر اتر آئے حالانکہ سب و شتم مسلمانوں کا شیوہ نہیں ہے۔ تعصب، نفرت اور فرقہ واریت ایک سماجی ناسور ہے جو معاشرے کو پراگندہ کرتا ہے اور یہ ایک استعماری چال ہے۔ حکومت اپنے گماشتوں کے ذریعے کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی مسئلہ چھیڑے رکھتی ہے جہاں سے انواع و اقسام کے فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ 1936ء میں منشی پریم چند نے ناول "گئودان" لکھا۔ جس میں انہوں نے کسانوں کی زندگی اور ان کے مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے خلاف استحصالی قوتوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ استعمار کی مکاری معاشرتی ابتری کا نتیجہ تھی۔ اسی طرح کا ایک واقعہ 1936ء کو محلہ سمیاں بھاٹی دروازہ سے شروع ہوا۔ مسلمانوں کی آبادی میں ایک گردوارہ تھا۔ اس میں آہستہ آہستہ سکھ جمع ہو رہے تھے۔ کسی نے بتایا کہ مسلمانوں کی آبادی ہے اور اسے خطرہ ہے کیونکہ یہاں پر سکھ اکٹھے ہو رہے ہیں۔ جب یہ خبر مسلمانوں تک پہنچی تو وہ بھی اکٹھا ہونا شروع ہو گئے دونوں طرف سے جوش و جذبے سے نعرہ بازی جاری تھی۔ سکھوں نے شکایت کی کہ مسلمان اپنے گھروں کی چھتوں سے سنگ باری کرتے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ گردوارہ میں اینٹوں اور روڑوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں جبکہ مسلمان اس سے انکاری تھے لوگ کہتے تھے کہ یہ ان کی چال ہے اور انہوں نے خود اینٹوں اور روڑوں کا بندوبست کیا ہوا ہے۔ سکھوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ کرپانوں سے مسلح تھے مسلسل دونوں طرف سے نعرہ بازی ہو رہی تھی جبکہ مسلمان تعداد میں ان سے زیادہ تھے لیکن نہتے تھے۔ حکومتی اہلکار موجود تھے۔ سکھ اپنی بات پر بضد تھے جب کہ مسلمان اپنی بات پر۔ مسلمان سکھوں کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ مسلمانوں کی طرف سے تصفیہ کی کوششیں کی گئیں جو کہ رائیگاں گئیں آہستہ آہستہ تناؤ بڑھتا گیا یہاں تک کہ ڈپٹی کمشنر کے کہنے پر بندوقوں کے رخ مسلمانوں کی طرف موڑ دیے گئے۔ جس پر مسلمانوں کو غصہ آیا اور ان کے تیور بدل گئے۔ انہوں نے ڈپٹی کمشنر کو سمجھایا کہ فساد ہونے کے قریب ہے کچھ سدباب کیا جائے۔ لیکن جواب یہ ملا کہ خیر ہے، ہو جائے، کوئی پرواہ نہیں کیونکہ استعمار اس عناد کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ آخر کار ڈپٹی کمشنر نے حکم دیا کہ گولی چلا دو لیکن حالات کی سنگینی کا دیکھتے ہوئے سپرنٹینڈنٹ نے ٹالنے کی کوشش کرتے رہے اور اس نے کہا کہ حالات مزید مخدوش ہو جائیں گے اور اس کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ اور سے اطلاع دی گئی کہ ٹکسالی

دروازہ کے باہر دو سکھوں کو قتل کر دیا گیا۔ حکومتی اہلکار اگر چاہتے تو یہ معاملہ خوش اسلوبی سے حل ہو سکتا تھا لیکن کشت و خون کے شیدائی ایسا کیوں کر سکتے تھے۔ مسلمانوں کا ایک جلوس سرکلر روڈ سے ہوتا ہوا موچی دروازے پر پہنچا خوب سنگ باری کی گئی لوہاری اور شاہ عالم مارکیٹ کے درمیان لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا۔ ہندوں اور سکھوں کی دکانیں کھلی تھیں اور بھی ڈر سے دکانیں بند کر کے بھاگ نکلے اور اسی طرح ایک نوجوان نے مندر کی مورتیاں توڑنے کی کوشش کی لیکن مندر کا جنگلا اس کے پیٹ میں لگا جس سے وہ وہیں موت کا ڈھیر بن گیا۔ جب پتھراؤ کے لیے اینٹیں ختم ہو گئی تو دست بہ دست لڑائی شروع ہو گئی۔ اور پولیس کھڑی یہ تماشہ دیکھتی رہی دفعہ 144 نافذ کر کے کرفیو لگا دیا گیا جس سے حالات مزید ابتر ہو گئے۔[53]

1937ء کے انتخابات سے پہلے برطانوی استعمار کے اہلکار معاشرتی حالات کو اس نہج پر لے آئے کہ انہیں ان انتخابات سے قدرے اطمینان ہوا۔ لیکن اس کے باوجود اپنی گرفت ڈھیلی نہ ہونے دی کیونکہ صوبوں کی آزادی کے لیے صوبہ جاتی انتخابات برطانوی استعمار کے زیر اثر تھے لیکن یہ آزادی ایک اہم پیش رفت تھی۔ گوہ کہ یہ برطانوی استعمار کے تابع تھی۔ یہ انتخابات کا انعقاد گورنمنٹ انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت کیا گیا اور یہ ایکٹ برطانوی پارلیمنٹ نے پاس کیا۔ اس وقت لارڈ ولنگڈن ہندوستان کے وائسرائے تھے۔ اس ایکٹ کے منظوری میں سائمن کمیشن، گول میز کانفرنسز، بر صغیر کے وائسرائے، برطانوی حکومت اور برطانوی پارلیمان میں کافی بحث و تمحیص کے بعد اسے منظور کیا گیا۔ اس ایکٹ کو بنانے میں بر صغیر کی عوام اور سیاست دانوں کی بلا واسطہ رضامندی شامل نہ تھی۔ 1935ء کو سعادت حسن منٹو نے افسانہ "نیا قانون" اسی تناظر میں لکھا جس میں انڈیا ایکٹ، اشتراکی نظریہ، سرخ پوش تحریک اور رد استعماری کارروائیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ وائسرائے لارڈ ولنگڈن کے رویے سے یہ ثابت تھا کہ وہ برطانوی اقتدار کا حامی ہے۔ اس لئے استعمار نہیں چاہتا تھا کہ کانگرس اور مسلم لیگ اپنے اپنے صوبوں میں اکثریت حاصل کریں اور حکومت بنائیں۔ ان انتخابات میں سب سے زیادہ سیٹیں انڈین نیشنل کانگرس نے حاصل کی۔ انہوں نے 11 صوبوں میں سے 8 صوبوں میں حکومت بنانے میں کامیاب رہی جبکہ 1585 سیٹوں میں سے 716 سیٹیں جیتیں۔ ال انڈیا مسلم لیگ کی کارکردگی توقع سے بھی زیادہ بری نکلی انہوں نے 109 نشستیں

حاصل کی۔ یونینسٹ پارٹی نے پنجاب میں بہترین کارکردگی دکھاتے ہوئے 175 میں سے 95 نشستیں جیتیں اور حکومت بنائی۔ اس کے علاوہ سندھ، بنگال اور این ڈبلیو ایف پی میں مقامی چھوٹی چھوٹی جماعتوں نے حکومتیں بنائی۔[54]

برطانوی استعمار نے ان انتخابات میں مسلمانوں کو ہدف بنایا ایسی حکمت عملی ترتیب دی گئی کہ پہلی بار صوبائی خود مختاری کی بنیاد پر منعقدہ انتخاب میں حلیفوں نے میدان مار لیا مذکورہ نتائج سے بات واضح ہے۔ برطانوی استعمار مسلمانوں میں وہ کمال حکمت عملی سے اپنا کام مکمل کر چکے تھے۔ اور انہوں نے اپنی پروردہ شخصیات اور جماعتیں میدان عمل میں لائی گئیں۔ برطانوی ایمپیریلزم کے لیے صوبہ پنجاب انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ کیونکہ اس صوبہ نے برطانوی استعمار کے لیے انتہائی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اسی صوبے سے بہادر، نڈر اور انتہائی دلیر سپاہی ملے جنہوں نے پہلی جنگ عظیم میں برطانوی استعمار کا بھرم رکھا، ان کی جفا کشی، لگن، ہمت اور خدمات نے یورپ اور دوسرے ممالک میں اپنا سکہ جمایا یعنی پنجاب برطانوی استعمار کے لیے ایک کان (Mine) کا درجہ رکھتی تھی۔ دوسری جنگ عظیم میں بھی اسی سرزمین کے سپوتوں نے اپنی بہادری اور دلیری کے جوہر دکھائے جس سے برطانوی استعمار کو یقین ہو گیا کہ جب تک یہ نوجوان اس کے ساتھ ہیں اس کا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔ اس نے ان کی خدمات کو دلی طور پر تسلیم کیا۔ اس لیے برطانوی استعمار نہیں چاہتا تھا کہ صوبہ پنجاب میں حکومت اس کی مخالف بنے۔

پورے پاکستان میں ہندو اور مسلمانوں کا مقابلہ تھا جبکہ پنجاب میں مسلمانوں، ہندوؤں کے علاوہ سکھوں کا بھی مسئلہ تھا۔ کیونکہ ہندو کانگرس کے زیر اثر تھے اور سکھ قوم پرست تھے وہ اپنی قوم کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے جبکہ مسلمانوں کا مسئلہ ٹیڑھا تھا۔ ہندو اور سکھ بھی نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں حکومت مخالف کوئی جماعت مضبوط ہو۔ برطانوی استعمار پہلے ہی مسلمانوں میں اپنی جڑیں مضبوط کر کے اسے مقامی استعمار کی شکل دے چکا تھا لیکن اس میں ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد قدرے کم تھی۔ جس کی وجہ سے کسی جماعت کی جرات نہ تھی کہ وہ برطانوی استعمار کے خلاف کسی سرگرمی کا حصہ بنے۔ پنجاب میں کچھ خاندانوں کی پنجاب کی سیاست پر اجارہ داری تھی اور وہ اپنے مفادات کے لیے استعماری قوتوں کے خلاف

اٹھنے والے ہر قدم کو روک لیتے تھے اور وہ اسے اپنے لیے اعزاز سے کم نہ سمجھتے۔ زمینیں دے کر بڑے بڑے جاگیر دار بنائے گئے، اور ان کے اندر احساس برتری پیدا کیا گیا، انہیں سیاست میں لایا گیا، پیر پرستی رائج کرنے کے لیے پیروں کو نوازا گیا، پنجاب کے پڑھے لکھوں کو پولیس اور فوج میں بھرتی کر کے احسان عظیم کیا گیا۔ اور انہیں اپنا مطیع و فرمانبردار سپاہی اور بدترین جاسوس بنایا گیا۔ اوپر سے ستم ظریفی یہ کی کہ مسلمانوں میں ایک نئے عقیدے کی بنیاد رکھی اور اس کے لیے مرزا غلام احمد قادیانی کو تیار کیا۔ جس سے استعماری امت کا خمیر پروان چڑھا۔ جس نے برطانوی استعمار کی غلامی کا جواز پیدا کرتے ہوئے اسے اپنے لیے باعث تکریم سمجھا۔ اور ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے کہ جن کی مثال لانا ناممکن ہے۔ اس طرح برطانوی استعمار نے مسلمانوں کی وحدت کو تاراج کرنے کا سامان مہیا کیا۔

قادیانیت کا ناسور بیج کر برطانوی استعمار نے اس خطے میں مسلمانوں کے سینوں میں ایسا خنجر گھونپا کہ 135 سال گزرنے کے بعد بھی جس کا زخم مندمل نہیں ہوا۔ جسے وہ آج بھی سہلا رہے ہیں۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد نے مسلمانوں میں رہتے ہوئے اپنے سیاسی ایجنڈے کو پروان چڑھایا لیکن مذہبی سطح پر مسلمانوں کو کافر قرار دیا اور ان سے دوری اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ برطانوی استعمار کی پشت بانی کرتے ہوئے انہیں جہاں جہاں مواقع ملے انہوں نے مسلمانوں سے غداری کی۔ استعمار کی چال اتنی مضبوط تھی کہ پنجاب میں مسلمانوں کا سنبھلنا دشوار ہو گیا۔ سکھوں اور ہندوؤں سے پہلے ہی تعلقات ناگفتہ بہ تھے۔ باقی قادیانیت مسلمانوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہوئی تھی کیونکہ اسے استعمار کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ رہی سہی کسر اپنوں نے پوری کر دی۔ جاگیر دار اور مفاد پرست ٹولہ۔ اس زبوں حالی پر صوبہ جاتی انتخابات کے ثمرات کیسے بار آور ہو سکتے تھے۔ مسلمان استعماری حصار میں تھا جس سے نکلنا مشکل تھا۔ برطانوی استعمار نے تمام مسلمان مفاد پرستوں کو یونینسٹ پارٹی کے پلیٹ فارم پر جمع کیا اور اس پارٹی کے سربراہ سر فضل حسین تھے وہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے اپنی معیاد پوری کر کے واپس آئے اور اپنی جگہ پر چوہدری ظفر اللہ خان کو وائسرائے ایگزیکٹو کونسل کا ممبر بنوایا اور ملک فیروز خان نون کو برطانیہ میں ہائی کمشنر لگوایا جبکہ سکندر حیات کو ریزرو بینک کا ڈپٹی گورنر بنایا گیا۔ سر فضل حسین نے آئندہ انتخابات میں

وزارت عظمیٰ کے لیے ذہن سازی کی۔ وہ ملکی سیاست میں قائد اعظم کے حریف تھے۔ لیکن قدرت نے مہلت نہ دی اور وہ انتخابات سے پہلے ہی فوت ہو گئے۔ ان کے جانشین سکندر حیات ٹھہرے اور ان کی سربراہی میں یونینسٹ پارٹی نے غیر معمولی اکثریت حاصل کی۔ مسلم لیگ کو صرف ڈیڑھ سیٹ ملی جو اس کے نمائندے منتخب ہو کے آئے تھے وہ بھی یونینسٹ پارٹی میں چلے گئے۔ الیکشن کی بھول بھلیوں کا کھیل جاری رہا۔ مسلمان نامور سیاستدان ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچتے رہے اور وفاداریاں بدلتے رہے۔ کئی مسلمان زعماء کے دست راست ڈاکٹر عالم آخر کار کانگرس سدھار گئے۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب کے انتخاب میں سکندر حیات کے ساتھ گورنر کا ساتھ بھی تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے گورنر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے شہید گنج کا رخ عدالت کی طرف موڑ دیا تھا۔ کیونکہ معاملے کو طول دینا حکومت کے فائدے میں تھا۔ اس وقت حکومت پریشان تھی اور اس سے نکلنا ناممکن دکھائی دیتا تھا۔ گورنر نے سود سمیت ڈاکٹر صاحب کا قرض ادا کر دیا۔ ان انتخابات نے مسلمان راہنماؤں کے پول کھول دیے۔[55]

شہید گنج کا معاملہ مذہبی سے زیادہ سیاسی بن چکا تھا۔ سیاسی اور مذہبی جماعتیں اس کی واگزاری کا نعرہ لگاتیں اور عوام کے اندر جوش و ولولہ پیدا کر کے نوجوانوں کو گرفتار کروا کر کچھ عرصہ کے لیے چپ ہو جاتیں۔ یہ وطیرہ کئی سالوں سے آزمایا جا رہا تھا جس کی وجہ سے بے شمار خاندانوں نے تکلیف، مصیبت، عسرت، تنگی دستی اور ذہنی اذیتوں سے زندگی گزاری۔ بے شمار نوجوان اس راہ حق میں شہید کر دیے گئے لیکن کسی نے سوال نہیں اٹھایا۔ کہ اگر مسئلے کا حل یہ نہیں ہے تو پھر اس طرح کوششیں کیوں کی جا رہی ہیں۔ اگر اس کا حل کسی اور حکمت عملی میں مضمر ہے تو اسے اپنانا چاہیے۔ اس قضیے کا بار بار زندہ ہونا بہت بڑے امتحان سے کم نہ تھا۔ نوجوانوں، بزرگوں اور تحاریک کے کارکنوں کے ساتھ ان کے رہنماؤں کو بھی بار بار مقدمات کا سامنا کرنا پڑتا اور کئی ماہ و سال کی قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑتیں۔ کارکنوں میں حوصلہ اور جذبہ تھا وہ حقیقی معنوں میں شہید گنج کے حصول کے لیے کوشاں تھے جبکہ بہت سے رہنماؤں کی نیت کچھ اور تھی وہ تقریریں کرتے قراردادیں پاس کرواتے اور سیاسی فائدہ اٹھانے کے لیے زبانی جمع خرچ کا سہارا لیتے۔ ان حالات کا جائزہ اس واقعے سے لیا جا سکتا ہے کہ نوجوانوں نے سول نافرمانی تحریک

شروع کرنے کی دھمکی دی۔ اور یہ دھمکی برطانوی استعمار کے لیے معانی خیز تھی۔ انہوں نے اس کا تدارک کرنے کے لیے اپنے گھوڑے بھگانے شروع کر دیے نوجوانوں کو روکنے کے لیے بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں نے رابطے کیے اور آخر کار ملاقات کی جگہ علامہ اقبال کا گھر ٹھہری۔ چوہدری افضل حق اپنے ساتھ شورش کاشمیری کو لے کر ایک گھنٹہ پہلے علامہ اقبال کے گھر پہنچ گئے اور انہیں صورتحال سے آگاہ کیا۔ علامہ اقبال گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے حقہ پیتے ہوئے یوں گویا ہوئے: "اوئے افضل حق ایہناں خنزیر آں نوں ایتھے کیوں بلایا ای" چوہدری افضل حق صاحب نے جواب دیا: "ڈاکٹر صاحب، اونہاں خنزیراں نے مینوں ایتھے بلایا اے" علامہ اقبال نے کہا: "تے ایہہ کوئی سوراں دا باڑا اے"

قصہ المختصر ڈاکٹر صاحب نے سکندر حیات کو ڈانٹا اور اسے سمجھایا کہ وہ اسلام دشمنی چھوڑ دے اور آئندہ میرے گھر کو استعمال نہ کرے۔ جب استعمار کا یہ وار خالی گیا تو اس نے یکے بعد دیگر طریقے آزمانے شروع کر دیے۔ مختلف سیاسی رہنما اپنے نوجوان کارکنان کے لیے استعمار کی طرف سے مختلف پیش کشیں لے کر آتے۔ لیکن یہ نوجوان بکنے والے نہیں تھے۔ وہ اپنے مقصد پر ڈٹے رہے۔ مجلس اتحاد ملت، مجلس احرار الاسلام، مسلم لیگ اور تقریباً تمام مسلم تنظیموں کی طرف سے جلسے، جلوس اور قراردادیں پاس کی گئیں۔ لیکن حل نہ نکل سکا۔ بلکہ کارکنان کو لالچ دیا گیا، دبایا گیا، دھمکیاں دی گئیں، ان کے بارے میں اخبارات میں جھوٹی خبریں لگوائی گئیں لیکن وہ برطانوی استعمار اور مقام استعمار کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوئے۔ عوامی خوف اور دہشت کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ میاں صاحب ایک کارکن کو کافی بحث و تمحیص کے بعد ڈپٹی کمشنر کے پاس لے گیا اور ڈپٹی کمشنر انہیں ڈپٹی انسپیکٹر جنرل سی آئی ڈی کی فرمائش پر ان کے پاس لے گئے۔ ڈپٹی انسپیکٹر جنرل نے کارکن کو گھور کر دیکھا اور بڑے رعب سے کہا:

> "اوہ، بالکل نوجوان, دیکھو میں تمہیں اسسٹنٹ سب انسپیکٹر بھرتی کر لیتا ہوں، سال بعد سب انسپیکٹر ہو جاؤ گے، ہمارے ساتھ کام کرو، اس محکمہ میں ترقی کے بہت سے مواقع ہیں۔"[56]

جب کارکن نے یہ پیشکش سنی تو اس کے جواب میں کہا:

"آپ سے میرا کوئی جھگڑا نہیں, میں تو اپنی قوم کے نمائندوں سے ایک ایسے
جھگڑے کا حل پوچھنا چاہتا ہوں جس جھگڑے کی وجہ سے بیسیوں نوجوانوں کا
خون بہا ہے۔"[57]

جب اس پیشکش کے جواب میں ہاں کی بجائے ناں سامنے آئی تو حکومتی اہلکاروں کے تیور بدل گئے۔ انہوں نے اپنے پورے زور بازو سے انہیں کچلنے کی کوشش کی۔ مختلف قسم کے ہتھکنڈے آزمائے گئے لیکن یہ اپنے مشن پر ڈٹے رہے۔[58]

دوسری جنگ عظیم ستمبر 1939ء سے شروع ہوئی اور 2 ستمبر 1945ء تک جاری رہی۔ جرمنی کے چانسلر ایڈولف ہٹلر تھے جبکہ برطانیہ کے وزیر اعظم نیول چیمبر لین تھے۔ اس جنگ میں جرمنی کی پیش قدمی اور ناروے کی شکست کے بعد چیمبر لین نے استعفیٰ دے دیا اور ان کی جگہ ونسٹن چرچل وزیر اعظم بنے۔ برطانوی استعمار اور جرمنی استعمار ئے اپنے توسیعی پسندانہ عزائم جاری رکھے۔ ان دنوں ہٹلر کا یہ قول کافی مشہور ہوا کہ وعدے پورے نہیں کیے جاتے بلکہ فتح کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ ہٹلر کی عادت ہی بہت بری تھی وہ وعدہ خلافی کرتا تھا، معاہدہ توڑ دیتا تھا اور اپنی بات سے مکر جاتا تھا۔ رد استعماری قوتوں کا کہنا تھا کہ اس ماحول میں استعمار پر ایسی کاری ضرب لگائی جائے کہ وہ پریشان ہو جائے اور پھر اس سے ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ کیا جا سکے کیونکہ پھر برطانوی استعمار کا استعماری طاقت کے طور پر قائم رہنا مشکل ہو جائے گا۔ ہندوستان کے امن عامہ کے حالات پہلے ہی نہ گفتہ بہ تھے لیکن آرمی بل پاس ہونے کے بعد حالات مشکل سے مشکل تر ہوتے چلے گئے۔ برطانیہ میں حکومت کے مرکزی لا ممبر چوہدری ظفر اللہ خان نے آرمی بل پیش کیا۔ اس بل کی رو سے فوج میں بھرتی کے خلاف کسی قسم کی بات کرنا یا اس کے خلاف تقاریر کو سننا جرم قرار دیا گیا اور اس کی سزا ایک سال رکھی گئی۔ "مجلس احرار الاسلام" نے پورے ہندوستان میں جلسے کرنے شروع کر دیے اور حکومت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ جس پر مغربی سرحد کا گورنر انتہائی ناراض ہوا کیونکہ اپنی تقاریر میں پٹھانوں سے کہا گیا کہ اب وقت فرض کی ادائیگی کا ہے۔ غیرت و حمیت سے کام لیتے ہوئے اپنے خطے سے برطانوی استعمار کو رخصت کر دیا جائے۔ اس کے بعد بمبئی میں کانفرنس رکھی گئی۔ اس میں بھی

حکومت کے بخیے ادھیڑ دیے گئے۔ مختلف شہروں میں جلسے ہونے شروع ہو گئے اور ادھر ہٹلر نے پولینڈ کے شہر ڈنزک پر حملہ کر دیا اور برطانیہ اور فرانس بھی اس جنگ میں کود پڑے۔ یعنی جنگ عظیم دوم شروع ہو گئی۔

دوسری جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہی ہندوستان میں مسلمان رہنماؤں پر مقدمات قائم ہونے شروع ہو گئے۔ لیکن مسلمان رہنماوں نے اس کی پرواہ نہ کی بلکہ ایک قرارداد میں برطانوی استعمار سے پرزور مطالبہ کیا گیا کہ وہ ہندوستان چھوڑ دے اور مشرقی صوبہ سرحد کے مقبوضہ علاقوں پر اپنا تسلط ختم کر دے۔ ڈیفنس ایکٹ اف انڈیا کے نافذ ہونے سے ہندوستان برطانوی استعمار کی عملداری کی وجہ سے خود بخود اس جنگ میں شریک ہو گیا جس کی وجہ سے ہندوستان برطانوی استعمار کی اشد ضرورت بن گیا لیکن "مجلس احرار الاسلام" نے جنگ میں بھرتی اور برطانوی استعمار کی مدد سے صاف انکار کر دیا۔ برطانوی استعمار کے خلاف رد استعماری طاقتیں مختلف شہروں میں جلسے، تقاریر اور آرمی بل کی خلاف برسر پیکار رہی اور دن بدن اس کے جوش وولولہ میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مقامی انتظامیہ بھڑک اٹھی اور پولیس ایک بار پھر ان کے پیچھے لگ گئی اور انہیں ڈھونڈتی رہی۔ آخر کار پولیس نے ایک جلسہ پر پھلا بول دیا ہے اور خوب لاٹھی چارج کیا یہاں تک کہ لوگوں کو مار مار کر بے ہوش کر دیا اور پھر ان رہنماؤں کو پکڑ کر لے گی اور ان پر قسم قسم کے مقدمات قائم کیے گئے یعنی ظلم وجور کا ایک بازار استعمار زدہ کے خلاف گرم تھا اور دوسرا بین الاقوامی سطح پر دوسری جنگ عظیم کی شکل میں گرم تھا۔ یہاں ہزاروں لوگوں نے کہہ دو بند کی صحبتیں برداشت کیں اور ان میں جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا جبکہ دوسری جنگ عظیم اپنے اختتام کو پہنچنے والی تھی اس میں کروڑوں زندگیوں نے اپنی زندگی کی بازی ہار دی۔ ظلم و زیادتی کی یہ داستان آج بھی دوسری جنگ عظیم کے صفحہ پر موجود ہے اور طاقتور سے طاقتور ترین طاقتیں تا قیامت اسے مٹا نہیں پائیں گی۔ اس جنگ کے بعد رد استعمار کی تحریکوں میں تیزی آئی اور انہوں نے اپنے اپنے خطوں میں آزادی کی تحریک شروع کر دیں کیونکہ اس جنگ کے دوران استعماری طاقتوں کی معیشت اور فوجی طاقت کمزور ہو گئی جس کی وجہ سے ان کے زیر تسلط خطوں پر عملداری کمزور ہوتی گئی۔[59]

پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا:

"جو کچھ قدرت کے ہاتھوں ہو رہا ہے عقل انسانی اس پر حکم نہیں لگا سکتی،
معلوم ہوتا ہے انسانی طاقت سے ماورا کوئی طاقت ضرور ہے جو اس سارے
ڈرامے کی ہدایت کار ہے۔"[60]

عدم تشدد کا فلسفہ (Philosphy of Non Violence) ایک ایسا نظریہ ہے جو کسی ظلم، زیادتی، سختی، تعصب اور جبر کے بغیر مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ اس فلسفہ کی بنیاد اس یقین پر ہے کہ اس کا حل پائیدار اور دیرپا اثرات کا موجب بن سکتا ہے۔ اس فلسفہ کی رو سے سماجی رویوں اور انسانی رشتوں میں مضبوطی پیدا ہوتی ہے اور یہ تبدیلی ایک بہتر معاشرے کو جنم دے سکتی ہے۔ جبکہ تشدد ایک ایسا رویہ ہے جو انسانی فکر کو غارت گری میں تبدیل کرتے ہوئے نوع انسانی کے لیے آزار کا باعث بن سکتا ہے۔ استعمار نے اپنے ادوار میں استعمار زدہ کے ساتھ تشدد امیز رویہ روا رکھا جس نے مزید معاشرتی بگاڑ کو جنم دیا ہے اور یہ رویہ بعد میں آنے والی نسلوں کے لاشعور سے اگلی نسل کو منتقل ہوا جس سے سماجی سطح پر ایسے رویوں کا اظہار ہوا کہ قوم آج تک اسے بھگت رہی ہیں۔ تشدد چھوٹا ہو یا بڑا اس سے نمٹنا اتنا آسان نہیں جتنا کہ خیال کیا جاتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے چھوٹی برائی کو بڑی برائی سے ختم کیا جائے یا کوئی بڑا خون خرابہ چھوٹے خون خرابے کو ختم کرنے کا باعث بنے۔ یہ طریقہ سوائے ہلاکت، بربادی، دہشت گردی یا معاشرتی ابتری کا باعث بن سکتا ہے اور یہ طریقہ جہاں جہاں استعمار نے اپنے پنجے گاڑے وہاں وہاں انہوں نے اپنے مفادات کو حاصل کرنے کے لیے استعمار زدہ کے ساتھ غیر انسانی رویہ اختیار کیا۔ عام معاشرتی سطح پر ہو، سیاسی سطح پہ ہو یا جیل میں قید مقہور و مجبور لوگوں کے ساتھ ہو۔ تشدد ہمیشہ ہلاکت کا ہتھیار ہے جبکہ عدم تشدد فلاح و بہبود اور نجات کا ہتھیار ہے۔ ہمارے ہاں جیلوں کا تصور سختی اور تشدد سے عبارت ہے جبکہ اس کا اصل مقصد مطلوبہ شخص کی ذہنی و جسمانی فلاح کا ہے۔ لیکن جو شخص خدانخواستہ جیل دیکھ آتا ہے تو وہ اپنے اندر ایک مجرمانہ سوچ لے کر آتا ہے جو معاشرتی بگاڑ کر باعث بنتی ہے۔ راجپال اوم پرکاش اور اس طرح کے بے شمار خوبصورت نوجوان اسی بے راہ روی کا شکار ہو کر دنیا سے منہ موڑ گئے لیکن ان استعماری اہلکاروں کے

اندر احساس بھی پیدا نہ کر سکے اس کی سب سے بڑی وجہ ان کا تشدد آمیز رویہ تھا جو آج تک معاشرتی اور ناہمواری کا باعث ہے۔ ان کا قصور صرف عدم مساوات، ناانصافی، حق تلفی اور عزت نفس کو مجروح کرنے والی قوتوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ لیکن انہوں نے عدم تشدد کا راستہ اپنایا۔ کیونکہ یہ راستہ کسی کو قربان کرنے کا نہیں بلکہ خود قربان ہو جانے کا درس دیتا ہے۔ ان کی یہ قربانی بعد میں تحریک آزادی کا باعث بنی۔

عدم تشدد کا نظریہ احترام آدمیت، محبت و ہمدردی، برداشت، صبر و تحمل اور اخلاقیات کا روادار ہوتا ہے۔ جب ملکی حکمران تربیت یافتہ نہ ہوں۔ اور یہ اوصاف ان کے اندر ناپید ہوں۔ تو وہ اپنے ملک کے وسائل کے ساتھ فوج، پولیس، حکومتی اہلکاروں کو غلط استعمال کرے گا وہ ڈکٹیٹروں والا اور تشدد آمیز رویہ اپنائے گا۔ جیسا کہ برطانوی استعمار نے جنوبی ایشیا، افریقہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، شمالی امریکہ اور مشرق وسطی وغیرہ کے ساتھ کیا ہے۔ فرانسیسی استعمار نے شمالی افریقہ، وسطی افریقہ، مغربی افریقہ، جنوب مشرقی ایشیا اور لبنان و شام کے ساتھ کیا۔ اسی طرح ولندیزی استعمار نے جنوب مشرقی ایشیا، جنوبی افریقہ اور جنوبی امریکہ کے ساتھ کیا۔ اطالوی استعمار نے شمالی افریقہ، مشرقی افریقہ اور بحیرہ اوقیانوس میں کیا۔ ان کی حکومتوں نے ظلم و جبر، تشدد اور مفاد کی سیاست کی اور اپنے پیچھے ایسے حکمران چھوڑ آئے جنہوں نے انہی جیسا رویہ اپنایا۔ معاشرتی ڈھانچہ اس طریقے سے ترتیب دیا کہ اس کو ٹھیک ہوتے ہوتے کئی سال درکار ہیں۔ انتظامی ڈھانچے میں ایسی خرافات پیدا کیں، ایسے رویوں نے جنم لیا کہ جن کا درست ہونے میں ہو سکتا ہے صدیوں لگ جائیں۔ گزشتہ کل کے نمک خوار وہ آج کے حکمران بنے بیٹھے ہیں۔ طاقتور اقوام کے ہاتھ میں آج بھی ان کی ڈور ہے وہ جب چاہیں انہیں اپنے تصرف میں لا سکتے ہیں لیکن ان ممالک کی عوام آج بھی مکمل طور پر آزاد نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی حشر آفرینیاں عیاں ہیں۔ ان پسماندہ ممالک کو رد استعماری رویہ ہی نجات دلا سکتا ہے بشرطیکہ وہ عدم تشدد کے فلسفے جیسے احترام آدمیت، محبت، برداشت صبر و تحمل جیسے اوصاف سے منضبط ہو۔ یہی وہ رد استعماری محرک ہے جو اسے استعمار کی امدادی چال سے نجات دلا سکتا ہے۔

لیکن افسوس کہ ہماری ذہنی تربیت اس طرح سے ہو چکی ہے کہ ہمارے رویے مقامی استعمار کا روپ دھارے ہوئے ہیں اور ہم انہیں آج بھی ڈکٹیٹروں کی طرح استعمال کر رہے ہیں۔[61]

استعمار اور استعمار زدہ کے درمیان تعلقات نے سماجی سطح پر خلیج کو مزید گہرا کر دیا۔ جس سے معاشرتی سطح پر مایوسی، حق تلفی، بے جا مداخلت اور حقوق کی عدم فراہمی جیسے مسائل پیدا ہوئے جو بعد میں باہمی رسہ کشی کا سبب بنے۔ اسی وجہ سے ان کے باہمی تعلقات انتہائی پیچیدہ اور گنجلک رہے اور یہ مشکل استعمار کی خود پیدا کردہ تھی کیونکہ اس نے اپنے اقتدار کی عملداری اور طول دینے کے لیے خواص پیدا کیے، حکومتی اہلکار بنائے، ہندوستانی فوج بنائی اور مختلف مذاہب کے درمیان فرقہ واریت کو ہوا دی تاکہ وہ آپس میں دست و گریباں رہیں۔ اس کا یہ سماجی ڈھانچہ اتنا مضبوط تھا کہ اسے اپنی عملداری میں انتہائی آسانیاں رہیں۔ جنگ عظیم دوم کے بعد استعماری قوتیں کمزور پڑ گئیں اور رد استعمار کی تحاریک نے جان پکڑ لی کیونکہ آزادی کا یہ جذبہ گزشتہ صدی سے پروان چڑھ رہا تھا۔ اب اس کے سامنے بند باندھنا بہت مشکل تھا۔ ہندوستان میں 1937ء کے صوبہ جاتی انتخابات نے برطانوی استعمار کا یہ سماجی ڈھانچہ توڑ دیا کیونکہ یہ طبقاتی نظام پر مشتمل تھا۔ جب کانگرس نے کل گیارہ صوبوں میں سے آٹھ صوبوں میں حکومت بنائی اور ان میں اپنے کنٹرول کو مضبوط کرنے کے لیے حکومتی اہلکاروں پر خصوصی توجہ دی جس کا سبب یہ بنا کہ وہ آئی سی ایس افسران جو برطانوی راگ الاپتے تھے اُنہیں اندازہ ہو گیا کہ اب حالات ویسے نہیں رہے۔ وہ کانگرسی حکومت کے ہم نوا بن گئے۔ برطانوی استعمار کا اگلا ستون ہندوستانی فوج تھا۔ جو استعمار کا ایک مضبوط قلعہ تھا۔ 1943ء میں سبھاش چندر بوس نے اسے آزاد ہند فوج بنا کر برطانوی استعمار کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ اس اقدام نے لوگوں میں جذبہ حریت پیدا کر دیا جس سے برطانوی عملداری میں رخنہ پیدا ہوا۔ برطانوی استعمار کے سماجی ڈھانچے کا آخری ستون "تقسیم کرو اور حکومت کرو" بھی زمین بوس ہو گیا۔ کیونکہ مذہبی تقسیم اور سماجی تقسیم اسی کی پیدا کردہ تھی۔ اس نے برصغیر میں فرقہ واریت کو طول دیا اور اس مسئلے کو ہمیشہ زندہ رکھا۔ جس کی وجہ سے مختلف مذاہب آپس میں دست گریبان رہے اور حکومت کے ساتھ بھی برسر پیکار رہے۔ حکومت ان کو قید و بند میں ڈالتی، سزا دیتی، تشدد کرتی اور گولیوں سے زخمی کرتی حتی کہ وہ جان

کی بازی ہار جاتے۔ یہ مسئلہ انگریزوں کی حکمرانی، ہندوؤں کی تنگ نظری اور مسلمانوں کی جہالت کی وجہ سے پیدا ہوا۔ جب کانگریسی وزارتیں بنی تو قائد اعظم کو ہندو ذہنیت اور مسلمانوں کی پسماندگی کا اچھی طرح علم تھا۔ جب پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ اعلان کیا کہ ہندوستان میں صرف دو ہی طاقتیں ہیں ایک برطانوی حکومت اور دوسری انڈین نیشنل کانگرس ہے۔ تو اس کے جواب میں قائد اعظم نے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ تیسری طاقت مسلمان ہیں۔ کیونکہ آل انڈیا نیشنل کانگرس کا دعوی تھا کہ یہ سیکولر جماعت ہے اور اس میں ہر عقیدے کا آدمی موجود ہے اس لیے انہوں نے "مسلم ماس کنٹیکٹ کمیٹی" ڈاکٹر اشرف کی سربراہی میں بنائی۔ اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ کانگرس مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ لیکن قائد اعظم کی شخصیت کی سحر انگیزی نے کانگرس کے اس تابوت میں بھی آخری کیل ٹھونک دی۔ کانگریسی وزارتوں نے ہندو وزیروں کی خود سری کو بے نقاب کیا۔ اور یہ مسلمانوں کی ناراضگی کا باعث بنیں۔ مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد جماعت ہے۔

جنگ عظیم دوم میں برطانوی استعمار نے ہندوستان کو ہندوستانیوں کی مرضی کے بغیر جنگ میں جھونکنے کا فیصلہ کیا جو کہ کانگرس کو برا لگا اور اس نے انگریز سرکار سے مذاکرات کیے لیکن اس کے کوئی خاطر خواہ نتائج نہ نکل سکے۔ ان سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ ہندوستانیوں کے حقوق کو تسلیم کیا جائے اور انہیں مکمل خود مختاری دی جائے لیکن برطانوی استعمار نے اسے یکسر مسترد کر دیا۔ جس پر کانگرسی وزارتیں مستعفیٰ ہو گئیں۔ یہ اقدام معاشرتی سطح پر استعمار زدہ کے لیے محرک کا باعث بنا۔ جس کی وجہ سے برطانوی استعمار کے خلاف نفرت اور مزاحمت کی فضا قائم ہوئی۔ ان حالات کے پیش نظر 22 دسمبر 1939ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر قائد اعظم محمد علی جناح نے بھی اس دن کو "یوم نجات" قرار دیا تاکہ وہ بھی برطانوی استعمار کے خلاف اپنی ناراضگی کا اظہار اور مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے پختہ ارادے کا اظہار کر سکیں۔ قائد اعظم نے دو قومی نظریہ پیش کیا۔ اور یہ باور کروایا گیا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں جن کی مذہبی، ثقافتی اور سماجی شناخت مختلف ہے ان کا ایک جگہ پر رہنا مستقل نزاع کا باعث ہے۔ اس سے کانگرس پر ہندو جماعت ہونے کا مستقل ٹھپا لگ گیا۔ قائد اعظم کے سحر کے سامنے مسلمانوں کی دوسری جماعتیں

جمیعت العلماء، خاکسار، احرار اور دیگر گروہ بے بس ہو گئے اور بڑی بڑی شخصیتیں ماند پڑ گئیں کیونکہ قائد اعظم نے جو محاذ قائم کیا تھا وہ بااحسن و خوبی اس پر ڈٹے رہے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے حکومت اور یونینسٹ سوچ رکھنے والے مسلمانوں سے یہ ہتھیار چھین کر جداگانہ انتخاب کی طرف لے آئے۔ قائد اعظم اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ مسلمانوں کا وہ طبقہ جو اس مسئلہ پر انگریزوں سے وفاداری نبھا رہا تھا کافی متفکر ہوا لیکن قائداعظم کے سامنے وہ بھی دم بخود ہو گئے۔ گاندھی جی نے بھی قائداعظم کے ساتھ مشفقانہ رویہ رکھا تاکہ مسلمانوں کے ساتھ تعلقات کشیدہ نہ ہوں۔ لیکن سماجی سطح پر اپنے تعلقات اور رویوں کو چھپانا قدرے مشکل تھا اس لیے مہاتما گاندھی کو بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا۔ قرارداد پیش کرنے سے پہلے "خاکسار تحریک" کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا۔ "خاکسار تحریک" کو مسلمانوں میں بے انتہا پذیرائی حاصل تھی کیونکہ وہ برطانوی استعمار کے خلاف مسلح جہد جدوجہد پر یقین رکھتی تھی اور مسلمانوں کے حقوق کی علمبردار تھی۔ 19 مارچ 1940ء کو خاکسار پریڈ کے دوران پولیس اور کارکنان کے درمیان جھگڑا ہو گیا کیونکہ استعمار خاکسار تحریک کے بڑھتے ہوئے اثرورسوخ سے پریشان تھا اس نے اس پریڈ کو روکنے کی کوشش کی جس پر ایک غیر معمولی خونی سانحہ وقوع پذیر ہوا اور اس سانحہ میں بے شمار لوگ ہلاک و زخمی ہوئے۔ لاہور کے فضا سوگوار ہو گئی اور اس میں خوف و ہراس پھیل گیا جس کی وجہ سے لاہور میں جلسے جلوسوں پر پابندی لگادی اور بہت سارے خاکسار کے کارکنان علامہ مشرقی سمیت قید کر لیے گئے۔ برطانوی استعمار کے خلاف مسلمانوں کے پاس یہ ایک اہم ہتھیار تھا۔ سنہری مسجد لاہور ان کا مورچہ تھا جواہر لال نہرو وہاں پر گئے اور انہوں نے ان کے ساتھ اظہار یکجہتی کرتے ہوئے ان کی حمایت میں ایک بیان دیا۔ برطانوی استعمار مسلمانوں کے تمام طبقات میں کاسہ لیسوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کر چکی تھی جو کوئی بھی موقع ضائع کیے بغیر اس کی حمایت کرتی۔ یعنی یہ وہ مسلمان لوگ تھے جو مسلمان ہوتے ہوئے بھی اسلام سے بغاوت کرتے تھے۔ انہوں نے جواہر لال نہرو کے سنہری مسجد کے تعزیتی بیان کو بنیاد بنا کر "خاکسار تحریک" کو کانگریسی ایجنٹ قرار دیا ہے جس سے سادہ لوح مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔[62]

اس سانحہ کے پانچ دن بعد 23 مارچ 1940ء کو قرارداد پاکستان پیش کی گئی۔ مسلمانوں کا ٹھاٹھے مارتا ہوا سمندر ان کے دلی جذبات کا ترجمان بنا اور یہ قرارداد انتہائی جوش و جذبہ سے منظور کی گئی۔ جس سے برطانوی استعمار کے علاوہ ہندو ذہنیت کی بھی انکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اب تحریک آزادی نئے دور میں داخل ہوئی۔ اب ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ ہندوستان کی آزادی اب اس کا مقدر بن چکی ہے اور کاسہ لیسوں نے بھی اپنے آپ کو نئے رنگ میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ تعزیر اور خوف سے بچنے کے لیے قائد اعظم کے ارد گرد اکٹھے ہونا شروع ہو گئے اور آہستہ آہستہ یہ سارے لوگ مسلم لیگ میں داخل ہو گئے۔ مسلم لیگ نے برطانوی استعمار اور ہندو زعماء کے ساتھ مذاکرات کرنے شروع کیے تا کہ ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کیا جا سکے جس کی وجہ سے اس کی طاقت میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ 1942ء کو اسٹیفرڈ کرپس جسے "کرپس مشن" بھی کہا جاتا۔ ہندوستان کی آئینی حیثیت کے بارے میں کچھ تجاویز لے کر آیا۔ جسے مسلم لیگ نے یکسر مسترد کر دیا اور مسلمانوں کے لیے الگ ریاست کا مطالبہ کر دیا۔ 1945 میں دیول پلان پیش کیا گیا۔ اس کا پورا نام "پلان آف ڈائریکٹر جنرل آف ایمرجنسی ریلیف اینڈ ری کنسٹرکشن" تھا۔ اس پلان کا مقصد ہندوستان کی ترقی اور خود مختاری کو فروغ دینا تھا لیکن ہندوستان کی جماعتیں کامل آزادی کا مطالبہ کر رہیں تھیں۔ اس لیے وہ اسے ناکافی سمجھتے تھے۔ اس کی شدید مخالفت کی گئی۔ 26 جنوری 1945ء کو لیاقت ڈیسائی سمجھوتہ ہوا۔ مسلم لیگ کی طرف سے لیاقت علی خان اور کانگرس کی طرف سے بھولا بھائی ڈیسائی نے قیادت کی۔ ان کے درمیان ایک معاہدہ طے ہوا۔ جس میں مشترکہ مرکزی حکومت اور جماعتوں کی متناسب نمائندگی پر اتفاق ہوا لیکن برطانوی حکومت نے اسے مسترد کر دیا۔ 25 جون 1945ء کو شملہ کانفرنس کا انعقاد "شملہ" میں کیا گیا اور یہ کانفرنس وائسرائے لارڈ ویول کی قیادت میں ہوئی۔ مسلم لیگ کی قیادت قائد اعظم نے کی جبکہ کانگرس کی قیادت کانگریسی صدر مولانا ابو الکلام آزاد نے کی۔ اب عبوری حکومت کے سلسلے میں مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان اختلاف پیدا ہوا۔ مسلم لیگ نے مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کو الگ نمائندگی دی جائے اور وہ حکومت میں مسلمان نمائندے نامزد کرے جبکہ کانگرس کا یہ دعوی تھا کہ وہ مسلمانوں سمیت تمام ہندوستانیوں کی جماعت ہے۔ کانگرس نے اس مطالبے کو تسلیم نہیں

کیا۔ مسلم لیگ اپنی سیادت اور قیادت کی وجہ سے مسلمانوں کی خواہشوں کا مرکز بن گئی جبکہ مسلمانوں کے مذاکرات کانگرس کے ساتھ بھی جاری تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ سے صلح اور جنگ دونوں رویے جاری رکھے کیونکہ وہ نیشنلسٹ مسلمانوں کے ہتھے چڑھی ہوئی تھی وہ اس کا سہارا لے کر لیگی سیلاب کو روکنا چاہتے تھے جبکہ پاکستان اب ناگزیر ہو چکا تھا۔ عوام اس مطالبے سے کسی صورت روگردانی نہیں کر سکتے تھے۔ قائد اعظم ڈٹے رہے جس کسی مسلمان نے اس نصب العین کی حکم عدولی کی وہ راندہ درگاہ ٹھہرا۔ اس طرح بہت ساری جماعتوں کے زعماء غیر مشروط طور پر اس جدوجہد میں شریک ہوئے۔[63]

ابتلا و آزمائش کا دور جاری رہا اور یوں جنگ عظیم دوئم کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ جنگ اپنے پورے جوبن کے ساتھ جاری رہی۔ جرمنی کے چانسلر ایڈولف ہٹلر نے بڑی فتوحات حاصل کیں۔ کچھ عرصہ بعد اس نے روس پر حملہ کر دیا اور بہت سارے علاقوں پر قابض ہو گیا۔ جاپان نے جب یہ صورتحال دیکھی تو اس نے بھی کس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ارد گرد کے علاقوں کو قبضے میں لینا شروع کر دیا۔ اور کافی فتوحات حاصل کیں۔ اتحادی افواج میں شامل امریکہ نے جاپان کے شہروں ہیروشیما اور ناگا ساکی پر بم گرائے۔ جس کے بعد جاپانیوں میں سکت نہ رہی۔ اور اسی طرح بینیٹو موسولینی اٹلی کے وزیراعظم نے کافی کوشش کی اور ہٹلر کا ساتھ دیا لیکن وہ پوری طرح حاوی نہ ہو سکے برطانوی اتحادی افواج نے 1943ء میں مخالف اتحادی ملک اٹلی پر حملہ کیا گیا اور سسلی جنگ کے بعد اس کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ 1945ء میں اٹلی کو مکمل آزادی مل گئی۔ اتحادی فوجیوں نے مسولینی کو پکڑ کر مزاحمتی تحریک کے لوگوں کے حوالے کر دیا اور انہوں نے اسے پھانسی دی۔ اتحادی افواج کا دباؤ بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ 30 اپریل 1945ء کو اسی دباؤ کی وجہ سے ہٹلر نے خودکشی کر لی اور اس کی نازی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ ہٹلر کی وصیت کے بعد ایڈمرل کارل ڈونٹس نے اس کی باقیات پر مشتمل چند ہفتے کی حکومت قائم کی جسے فلوینس برگ کہا جاتا ہے۔ 8 مئی 1945ء کو جرمنی نے اتحادی افواج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور ان اتحادی افواج نے جرمنی کو چار انتظامی زون میں تقسیم کرتے ہوئے عملداری سنبھالی۔ برطانوی حکومت یہ باور کر چکی تھی کہ کامیابی کے باوجود نو آبادیاتی انتظامی ڈھانچے کو قائم رکھنا مشکل ہو گا۔ برطانوی استعمار کی جنگ کے دوران

ہندوستانی پارٹیوں سے گفت وشنید جاری تھی۔ برطانوی استعمار کو اپنی فوج پر ناز رہا کیونکہ فوج کا زیادہ تر حصہ پنجاب کے بڑے بڑے سورماؤں خاندان سے تھا اس علاقے اور ان خاندانوں کے بہادر نوجوان برطانوی فوج کے ہندوستانی پلٹنوں، کمپنیوں اور رجمنٹوں میں شامل تھے لیکن 1942ء میں سبھاش چندر بوس نے انڈین نیشنل آرمی کی بنیاد سنگاپور میں رکھی اور وہ جاپانیوں کی مدد کے لیے قائم کی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان کے بے شمار افسران اور سپاہیوں نے اس میں شمولیت اختیار کی۔ ادھر ہندوستان کے حالات دگرگوں ہونا شروع ہو گئے۔ کرپس مصالحت کے لیے آئے اور اس میں کافی پیشرفت ہوئی لیکن برطانوی وزیراعظم ونسٹن چرچل نے درشتگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے واپس بلا لیا۔ اس کے بعد رد استعماری تحریکوں نے زور پکڑا۔ گاندھی جی نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک شروع کی اور ساتھ ہی قائداعظم نے "پاکستان" کا مطالبہ کر دیا۔ جس سے لوگوں میں جوش و جذبہ بڑھا۔ برطانوی استعمار کے خلاف جدوجہد بیٹھکوں، مہمان خانوں سے نکل کر ہندوستان کی گلیوں اور بازاروں تک پہنچ گئی۔ مسلم لیگ کے اکتیسواں سالانہ اجلاس منعقدہ کراچی 26 دسمبر 1944ء میں قائداعظم نے فرمایا:

> "برطانوی سیاست دانوں کے لیے صحیح راستہ یہی ہے کہ ہندوستان کو اس کی جائز وارث دو قوموں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہندوؤں اور مسلمانوں میں بات کر چلے جائیں۔"[64]

قائداعظم کے مطالبہ پاکستان پر مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان آہستہ آہستہ خلا بڑھتا گیا۔ اس وقت کانگرس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد تھے اور انہیں یہ زعم تھا کہ کانگرس تمام مکاتب فکر کی جماعت ہے جبکہ مسلم لیگ کا یہ دعوی تھا کہ مسلمانوں کی نمائندگی کا حق صرف مسلم لیگ کو ہی حاصل ہے۔ وہ کسی رجعتی عناصر کو عبوری ایگزیکٹو کونسل میں شامل نہیں ہونے دے گی جبکہ کانگرس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد کسی کانگریسی مسلمان کو کونسل میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ وائسرائے لارڈ ویول نے سیاسی تنظیموں کی نمائندہ حکومت قائم کرنے کے لیے شملہ میں انہیں مزاکرات کی دعوت دی۔ مسلمان نمائندوں کے نامزدگی پر مسلم لیگ اور کانگرس کے اختلافات سامنے آئے جس بنا پر شملہ کانفرنس ناکام ہوئی۔ شملہ

کانفرنس کی ناکامی نے مسلم لیگ کو تقویت بخشی اور عوام الناس میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی ۔ وائسرائے لارڈ ویول نے شملہ کانفرنس کے فوری بعد مسلم لیگ اور کانگرس کے مشترکہ مطالبہ پر جنرل انتخابات کا اعلان کر دیا۔ یہ انتخابات فرسٹ پاسٹ دی پوسٹ سسٹم (FPTP) کے تحت ہوئے۔ قائد اعظم کے خلاف مربوط انتخابی مہم کا آغاز کر دیا گیا۔ اس مہم میں اپنوں کے ساتھ اغیار بھی شامل رہے لیکن قائد اعظم اپنے محاذ پر ڈٹے رہے اور مسلمانوں ان کی قیادت میں منضبط رہے۔ مسلم لیگ کی انتخابی مہم زوروں پر رہی۔ قائد اعظم مسلمانوں میں اپنا بیانیہ بنانے میں کامیاب رہے جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر جوش و ولولہ دیکھنے میں آیا۔ لوگوں نے مسلم لیگ کے مقابلے میں بڑی سے بڑی شخصیات اور علماء کہ کوئی پرواہ نہ کی۔[65] 1946ء کا انتخابی معرکہ مسلمانوں میں تنظیم و یکجہتی کی ایک عمدہ مثال رہا۔ معاشرتی سطح پر تین نام قائد اعظم، پاکستان اور مسلم لیگ یہ ایک ایسا وظیفہ تھا جو کہ ہر کس و ناکس کی زبان زد عام تھا۔ استعمار، استعمار زدہ کے ساتھ تعلقات اور استعمار کے حلیفوں کے کارنامے سماجی، مذہبی، سیاسی سطح پر عیاں ہو چکے تھے کیونکہ انہوں نے ساری عمر کانگرس اور برطانوی استعمار کی کاسہ لیسی میں گزاری۔ کیونکہ اپنے علاقوں میں ان کا غریب غربا پر اختیار تھا اور وہ اس سیاسی تبدیلی سے پریشان تھے کہ ان انتخابات کے بعد ان کا مستقبل کیا ہو گا انہوں نے اپنے لیے یہ حل نکالا کہ وہ بھی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ان انتخابات میں کانگرس اور مسلم لیگ دو بڑی جماعتیں تھیں۔ کیونکہ یہ انتخابات برطانیہ حکومت نے کابینہ مشن کے تحت عبوری حکومت کے لیے کروائے تھے جس میں کانگرس اور مسلم لیگ دونوں جماعتیں شامل تھیں۔ جواہر لارڈ نہرو عبوری وزیر اعظم اور لیاقت علی خان کو وزیر مالیات بنایا گیا لیکن اس کے دوران مسلم لیگ اور کانگرس میں کشیدگی بھی جاری رہی اور یہ کشیدگی تقسیم تک برقرار رہی۔[66]

ہندوستان میں اٹھتی ہوئی آزادی کی تحریکیں اور اس کے نامساعد حالات کے پیش نظر برطانوی استعمار یہ جان چکا تھا کہ ہندوستان کو نو آبادیاتی ریاست کے طور پر رکھنا اب ایک مشکل امر ہے۔ اس کے پیش نظر 1946ء میں سہ رکنی وفد بھیجا۔ جسے وزارتی مشن کا نام دیا گیا ان کے ارکان میں برطانوی حکومت کے وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس، سر سٹیفورڈ کرپس اور اے وی الیگزینڈر شامل تھے۔ اس مشن کا مقصد

ہندوستان میں سیاسی دھڑوں کی مفاہمت کے ساتھ ایک مختصر مدتی حکومت بنانا تھا جو آزادی کے معاملات کی راہ ہموار کرے۔ بر صغیر کے سیاست دانوں کو اس کا بخوبی اندازہ تھا۔ اس مشن نے تمام سیاستدانوں سے ملاقات کی لیکن مسلم لیگ کے موقف کو تسلیم نہیں کیا گیا جس کی راہ میں کانگرس اور مسلمان استعماری ایجنٹ آڑے آئے اور باہمی مصالحت کا دروازہ بھی بند ہو گیا۔ جب مسلم لیگ راضی ہوئی تو کانگرس نے انکار کر دیا۔ لارڈ ویول بھی الگ ہو گئے۔ جب کانگرس راضی ہوئی تو مسلم لیگ شمولیت کی قرارداد واپس لے چکی تھی۔ اخر کار مسلم لیگ نے شمولیت کا فیصلہ کر لیا لیکن کانگرس نے 20 جون کو انکار کر دیا۔ لارڈ ویول کو چاہیے تھا کہ وہ مسلم لیگ کو کابینہ بنانے کی دعوت دیتے لیکن وہ منحرف ہو گئے تو قائد اعظم نے ان کی اس وعدہ خلافی کو آڑے ہاتھوں لیا۔ کچھ دنوں تک یہ سلسلہ موقوف رہا آخر کار لارڈ ویول اور پنڈت نہرو میں عبوری حکومت بنانے کا فیصلہ ہوا پنڈت نہرو دعوت لے کر قائداعظم کے پاس گئے لیکن قائد اعظم نے انکار کر دیا جس پر انہوں نے خود ایگزیکٹو کونسل ترتیب دی اور یہ اعلان کیا ہے کہ مسلم لیگ جب چاہے اس کا حصہ بن سکتی ہے۔ کانگرس کا یہ اقدام انتہائی اشتعال انگیز تھا جس پر مسلمان بھڑک اٹھتے۔[67]

برطانوی استعمار اور کانگریسی گٹھ جوڑ کامیاب رہا جس کے سبب پنڈت جواہر لال نہرو نے حکومت بنائی اور سرکاری بنگلے پر سروجنی نائیڈو نے اندرا گاندھی کی موجودگی میں جھنڈا لہرایا اور سلامی پیش کی گئی۔ کانگرس جانتی تھی کہ حکومت ہند کے معاملات کافی دشوار ہیں اور مرکز کے سیکریٹری بالخصوص انگریز اتنے تیز ہیں کہ تلوار کی دھار سے بھی زیادہ تیز ہیں اور کسی بھی شخص کو شیشے میں اتارنا ان کا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ اپنے ممبر سے مشورہ کیے بغیر براہ راست گورنر سے فیصلہ کرا لیتے تھے۔ کانگرس پہلے سے ہی ان کی ان حرکات سے واقف تھی انہوں نے فوری طور پر سیکرٹریوں کی گورنر جنرل سے براہ راست ملاقات پر پابندی لگا دی جس سے ان کے اندر سراسیمگی پیدا ہوئی لیکن کانگرس نے معاملات کو اپنے کنٹرول میں رکھا۔ استعماری چال کی مثال کچھ یوں ہے کہ گورا فوج نے آزاد سرحدی قبائل پر چڑھائی کی اور خوب گولہ باری کی جس سے کافی خون ریزی ہوئی۔ قبائل میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی جس پر خان عبدالغفار خان نے سرحد سے آکر پنڈت جی سے اس ساری صورتحال کو بیان کیا۔ جس پر پنڈت جواہر

لال نہرو نے محکمہ دفاع و خارجہ کے سیکرٹریوں سے رپورٹ مانگی تو انہوں نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ ایسا ہی ہوا ہے جس پر پنڈت جواہر لال نہرو نے انہیں کہا کہ اتنا بڑا واقعہ میرے مشورے کے بغیر کیا گیا جس پر سیکرٹریوں نے بتایا کہ یہ معمول کی کارروائی ہے اس طرح ہوتا رہتا ہے جس پر پنڈت نے اس جنگ کو فوری بند کرنے کا حکم دیا اور آئندہ کے لیے متنبہ کیا کہ کوئی بھی کام میرے مشورے کے بغیر نہ کیا جائے۔ پنڈت نہرو اس واقعے سے پریشان ہوئے لیکن انہوں نے مولانا حبیب الرحمن سے کہا کہ وہ اس واقعے کا تذکرہ کسی جلسہ میں کریں لیکن میرا حوالہ نہ دیں اور حکومت سے اس کا جواب مانگیں اس سے ایک تو آئندہ کے لیے یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا اور دوسرا ہماری حکومت بھی مضبوط ہو گی۔ جس پر مولانا نے دہلی کی جامع مسجد میں ہزاروں کے مجمعے میں اس واقعے کا اعلان کیا اور لوگوں کو اس سے آگاہ کیا۔

برطانوی استعمار کے آلہ کار سیکرٹریوں نے اس واقعے کو اس رنگ سے پیش کیا کہ کئی روز تک تنقید و ستائش جاری رہی۔ دوسرے دن اس واقعے سے اخبارات بھر گئے اور یہ واقعہ زبان زد عام ہوا لیکن اگلے ہی دن اس واقعے کو کچھ اس انداز سے اخبارات کی زینت بنایا گیا۔ کہ یہ بمباری اس لیے کی گئی کہ کچھ قبائلی پٹھان ہندوؤں کو اغوا کر کے اپنے علاقے میں لے گئے تھے ان کو چھڑوانے کے لیے یہ سارا کچھ کیا گیا۔ آزاد قبائل کا مسئلہ پچھلی صدی سے اسی طرح جوں کا توں رہا کیونکہ وہاں کی غیور عوام نے استعمار کو اپنے علاقوں میں ٹکنے نہیں دیا جس کی وجہ سے برطانوی استعمار اپنے مقامی اہلکاروں کی ذریعے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے انہیں تکلیف دیتا رہا۔ پولیٹیکل ایجنٹ اور سرداروں نے استعماری روش کو جواز فراہم کر کے تحفظ دیا۔ ان علاقوں کے پٹھان اگر کوئی رد عمل دکھاتے تو وہ استعمار کی زیادتی کا مقابلہ کرنے کے لیے ہوتا۔ برطانوی استعمار نے ان علاقوں کو اپنا ٹریننگ کیمپ بنایا ہوا تھا۔ برطانوی وزیر اعظم ونسٹن چرچل نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ میں بھی فوج میں ایک کمیشن افسر تھا اور ہمیں ان علاقوں میں جنگی مشقوں کے لیے بھیجا جاتا اور ہم اپنے اسلحے کو ازمانے کے لیے یا مدت گزرنے سے پہلے اس میں اسے استعمال میں لانا چاہتے تو یہاں آکر ہم اسے استعمال کرتے۔ ان علاقوں پر کبھی دہشت گردی کا، کبھی اغواکاری کا یا کبھی فرقہ واریت کے پس منظر میں انہیں معتوب کیا جاتا۔ ظلم کا یہ بازار کافی عرصہ سے جاری تھا۔ تحریک پاکستان

حقیقی معنوں میں مسلمانوں کے لیے تریاق تھی۔ مسلم لیگ کچھ عرصہ عبوری حکومت سے الگ رہی لیکن بعد میں نواب بھوپال کہ اصرار پر شامل ہوئی اور اسے محکمہ داخلہ کی بجائے فنانس کا قلمدان حوالے کیا گیا۔ کانگرس شاید یہ سمجھتی تھی کہ مسلم لیگ کے مشکلات پیدا ہوں گی۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد خان لیاقت علی خان کے مشیر چوہدری محمد علی نے بطور مشیر ایسی مشکلات پیدا کیں کہ کانگرس حکومت زچ ہو گئی اور وہ ذہنی طور پر "پاکستان" کو ماننے کے لیے تیار ہو گئے۔ وزیر داخلہ اور دیگر ہندو زعماء فرقہ واریت کو بڑھانے کی کوشش کرتے رہے اور یہ لاوا معاشرتی سطح پر پکتا رہا یہاں تک کہ دونوں قوموں کے درمیان نفرت کی دیوار اور اونچی ہو گئی۔ لیکن قائد اعظم اس قدر مضبوط اعصاب کے مالک تھے کہ وہ اپنے محاذ پر ڈٹے رہے اور انہوں نے اپنی قوم کے ذہنوں میں پاکستان کا نعرہ نقش کر دیا تھا اس لیے مسلمانوں کے دل و دماغ اور زبان پر صرف دو ہی لفظ تھے قائد اعظم اور پاکستان۔[68]

وزارتی مشن بظاہر اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ براہ ہو کر واپس چلا گیا لیکن اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طریق سے ادا کرنے سے قاصر رہا کیونکہ اس کا مقصد ہندوستان کی سیاسی قوتوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرتے ہوئے ان کو اکٹھا کرنا اور اس کے مستقبل کے لیے آئینی حل نکالنا تھا یعنی آزادی کی راہ ہموار کرنا تھا۔ جس کے لیے عبوری حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ عبوری حکومت کو اس انداز سے بنایا گیا کہ اس کا آئینی حل نکالنا مشکل تھا اور ہندوستان کی سیاسی قوتوں کے درمیان مفاہمت کی بجائے نفرت کا بیج بویا گیا یعنی وزارتی مشن کی اس عبوری حکومت کو ہندوستان میں فسادات کا دیباچہ کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس حکومت میں فریق اول کو برتری دلانے کے لیے اس کی بہت ساری تجاویز پر عمل کیا گیا۔ جبکہ مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہونے کی دعوی دار کو اپنی نمائندگی سے دور رکھا گیا مسلمانوں کی نمائندگی بارے بیان دیتے ہوئے اپنی حکومت کو مضبوط کیا کیونکہ کانگرس اپنی بالادستی کے باعث مسلمانوں کو پاکستان سے محروم رکھنا چاہتی تھی۔ جبکہ کانگرس مسلم لیگ کو مورد الزام ٹھہراتی تھی کہ وہ ہندوستان کی آزادی میں رکاوٹ ہے۔ دونوں اقوام کی نفرت عروج پر تھی۔ قائد اعظم سے کسی غیر ملکی صحافی نے پاکستان کے وجود

کے بارے میں سوال کیا تو قائد اعظم نے کہا: "اب پاکستان ہی بنے گا, اس سے کمتر کسی حل پر ہم سمجھوتہ نہیں کر سکتے"[69]

صحافی نے پھر پوچھا کہ پاکستان نہ بنا تو پھر کیا ہو گا؟ اس پر انہوں نے کہا: "اس کا فیصلہ وقت کر دے گا, آئندہ جو ہو گا اس کی ذمہ داری کانگرس اور برطانیہ پر ہو گی جو مسلمانوں سے دغا کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔"[70]

حکومتی نمائندے مختلف طریقوں سے ہندوؤں اور سکھوں کو مسلمانوں کے خلاف منظم کر رہے تھے۔ ان کی پشت پر ہندو افسران بھی شامل تھے۔ جس کی وجہ سے ہندوؤں اور سکھوں کو بھرپور کمک پہنچائی جا رہی تھی۔ انگریز افسروں کو سب پتہ تھا لیکن وہ چپ سادھے بیٹھے تھے۔ جن علاقوں میں ہندو اقلیت میں تھے وہاں پر حالات دوسرے علاقوں کے نسبت اور زیادہ خراب تھے کیونکہ وہاں پر سکھ، ہندوؤں سے ملے ہوئے تھے اور سکھوں نے اسلحہ و بارود پر کافی پیسہ خرچ کیا۔ مسلمان ریاستوں کو شاید اس بات کا ادراک نہ تھا جس کی وجہ سے اس معاملے میں ان کی کوئی تیاری نہ تھی۔ سرحد حکومت نے اعلان کیا کہ ہم انسانیت کی تذلیل نہیں ہونے دیں گے یہاں پر کوئی کسی کو قتل نہیں کرے گا۔ جبکہ پنجاب میں خضر حیات کی وزارت تھی۔ خضر حیات کی وزارت بنوانے سے پہلے مولانا ابو الکلام آزاد نے مسلم لیگ کے صوبائی رہنماؤں سے بات کی اور انہیں مل کر وزارت بنانے کی دعوت دی لیکن قائد اعظم نے صوبائی رہنماؤں کو بتایا کہ جب تک پاکستان کا مسئلہ حل نہیں ہوتا ہم کسی صورت کانگرس کے ساتھ مل کر حکومت میں شامل نہیں ہوں گے۔ اس لیے مسلم لیگ خضر حیات کی وزارت سے خائف تھی۔ مسلمانوں کے تحفظ کے حوالے سے اس وزارت کا ٹھنڈ پروگرام تھا۔ بنگال کے وزیر اعظم سہروردی انتہائی متحرک اور سمجھدار نکلی وہ لاہور سے پنجابی نوجوانوں کو پولیس میں بھرتی کر کے لے گئے اور انہوں نے کانگرس کی عبوری حکومت کو بتا دیا کہ ہم اسے نہیں مانیں گے۔ کلکتہ بھارت کا پہلا شہر تھا جہاں سے فسادات کا آغاز ہوا۔ ہندوؤں کی تیاری پہلے سے تھی انہوں نے مسلمانوں کو زندہ آگ میں ڈالا جبکہ ہندوؤں کا بھی یہی دعوی تھا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں میں

خوب لڑائی ہوئی لیکن پولیس اور مقامی انتظامیہ تماشہ دیکھتی رہی کسی نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔[71]

فسادات کا آغاز دراصل انسانیت کے منہ پر تمانچہ تھا۔ ہندوستان میں موجود بڑی بڑی شخصیتیں اور نامور سیاست دانوں کہ ہوتے ہوئے اس گناہ کبیرہ کا مرتکب ہونا ایک لمحہ فکریہ تھا۔ کلکتہ سے آغاز ہوا اور پے در پے یہ واقعات ہوتے رہے۔ انسانیت بلکتی رہی اور دم توڑتی رہی لیکن ان بے ضمیروں کے کان پر جوں نہ رینگی۔ نواکھالی بھارتی ریاست مغربی بنگال میں واقع ایک شہر ہے جو کلکتہ کے قریب ہے اس میں مسلمان 78 فیصد ہیں 1946ء میں کلکتہ کے ہندو مسلم فسادات کے بعد سانحہ نواکھالی وقوع پذیر ہوا۔ اگر اس سانے کے اسباب و علل کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں ہے کہ یہ فسادات اپنی اقوام کو غلط، بے جا اور غیر ضروری معلومات دینا، سیاسی حل سے چشم پوشی کرنا، استعمار سے اچھے تعلقات کی بنا پر دوسرے فریق کو کمتر خیال کرنا، طاقت کے نشے میں رہتے ہوئے خرابی کا مرتکب ہونا، غالب اکثریت کے زعم میں رہتے ہوئے دوسرے کے حقوق کا خیال نہ رکھنا، حکومتی نالائقی، بد انتظامی فوری طور پر فیصلہ نہ کر سکنا، نااہل اور غیر تربیت یافتہ لوگوں کو حکومتی معاملات چلانا شامل ہیں۔ جب ادراک ہوتے ہوئے بھی اگر کوئی ایک فریق دوسرے کے مطالبے کو بغیر کسی مثبت یا مضبوط ثبوت کے رد کر دے تو معاشرے افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کسی کی رائے یا حق کو ببانگِ دہل پامال کرنا تضحیک کے زمرے میں آتا ہے اور یہ انسانیت کی تذلیل ہے۔ جب کوئی وقوعہ ہو جائے اور وہ اختیاری ہو تو بعد میں اس پر رونا مگرمچھ کے آنسوؤں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کسی بھی خدمت کو سیاست چمکانے کے لیے استعمال کرنا یہ امر باعث کمینگی ہے۔ نواکھالی کے فسادات دراصل اکثریت کا اقلیت پر جبری تسلط تھا جس نے ذلالت کی تمام حدیں پار کر دیں گئیں۔ یہ شیوہ مسلمانی کے خلاف تھا۔ گھروں کو آگ لگا دی گئی، بوڑھوں کو معذور بنا دیا، نوجوانوں کو قتل کر دیا اور خواتین کے عصمت دری کی گئی۔ ان واقعات کا پے در پے وقوع پذیر ہونا۔ ان واقعات کا سدباب ہونا یا تدارک بنتا تھا جبکہ اشک شوئی سے کام لیا گیا۔ مولانا ابو الکلام آزاد کے پاس بہار کے وزیر اعظم سری کرشن سہنا آ گئے۔ انہوں نے صوبہ بہار کی صورتحال سے آگاہ کیا۔ جس سے مولانا کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا تو انہوں

نے کہا: "جن باتوں کا اندیشہ تھا وہ یقین کی حد کو پہنچ چکی ہے, سمجھو کہ بہار میں فساد سلگ چکا اور آنا فانا بھڑکنے والا ہے۔"[72]

چند ایام کے بعد یہ فرقہ وارانہ لہر بہار کے در و دیوار کو لرزا گئی۔ بد امنی اور افواؤں نے جلتی پر تیل کا کام کیا یہ فسادات دو طرفہ نہیں تھے بلکہ یک طرفہ تھے۔ یہاں پر صرف مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ بستیوں کی بستیاں اجاڑ دی گئیں، خواتین کی عصمت دری کی گئی اور بے شمار لوگوں نے یہاں سے ہجرت کی۔ ہندوستان کی تاریخ میں بہار کے خونچکاں واقعات تاریخ پر دھبہ ہیں۔ اس درندگی کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ ان واقعات کہ اسباب کا جائزہ لیا جائے تو حقائق ہوشربا صورتحال کا پیش خیمہ نظر آتے ہیں۔ یہ صوبہ ہندوستان کے شمال مشرقی سمت ہے اور اس کی سرحد نیپال سے بھی ملتی ہے اس کا صدر مقام پٹنہ ہے۔ اس صوبہ میں جو مسلم کش فسادات ہوئے وہ انتہائی منصوبہ بندی سے انجام دیے گئے۔ پٹنہ، مونگھیر اور گیا کے اضلاع کے علاوہ تقریبا پورا صوبہ لپیٹ میں رہا۔ کشت وخون کا یہ عالم دیکھ کر ایسے لگتا تھا کہ ہندوؤں نے دل کھول کر ہولی کھیلی ہے۔ ان اضلاع کے در و دیوار خون میں نہلا دیے گئے اور حویلیوں کو خاکستر کر دیا گیا۔ منظر اتنا ہیبتناک تھا کہ دل لرزہ بر اندام ہو جاتا۔ ہندو مسلم فسادات کو بھڑکایا گیا جس کے لیے عرصہ دراز سے تیاریاں جاری تھیں۔ ہندو اخبارات نے جلتی پر تیل کا کام کرتے ہوئے ان واقعات کو مکافات عمل اور نواکھالی کا ردعمل قرار دیا حالانکہ یہ سب کچھ ہندو انتظامیہ نے مہا مہارت سے اسی انجام دیا۔ گاڑیوں سے شناخت کر کے اتارا گیا اور قتل کر دیا گیا۔ اس سے پہلے ایسی کوئی مثال نظر نہیں آتی اتی۔ بہار اسٹیشن سے دو اسٹیشن پہلے بختیار پور دو ٹرینوں کو روک کر مسلمانوں کو مولی گاجر کی طرح کاٹ دیا گیا۔ انسانیت بلک بلک کر دم توڑتی رہی اور یہ ہندو فلسفے "اہنسا"، "ستیہ گری" کے پجاری سب کچھ بھول کر مسلمانوں کی بیخ کنی کرتے رہے۔ ان کے ذہنوں پر ہندوازم کا خون سوار تھا اور وہ اسے مذہبی فریضے سے زیادہ اپنے مفادات کے لیے سرگرداں تھے۔ انسانی جانوں کے ساتھ ساتھ جو املاک کا حشر کیا گیا وہ اپنی جگہ لیکن جس انداز سے لوٹ مار کی گئی اس پر تاریخ بھی انگشت بدنداں تھی۔ پنڈت نہرو اور سردار عبدالرب نشتر بہار گئے تو انہوں نے کہا: "پنڈت نہرو غارت زدگی کے اس منظم نظارے کو دیکھ کر مبہوت ہو گئے۔"[73]

ان خونچکاں واقعات کے پیچھے ایک سازشی دماغ جو سیاسی اور مذہبی بھی تھا۔ جو وزارتوں اور آئندہ کے لائحہ عمل سے بخوبی آگاہ تھا۔ مسٹر عبدالباری صوبہ کانگرس کے صدر تھے انہوں نے اس قتل عام پر ایک رپورٹ تیار کی اور گاندھی جی کی خدمت میں پیش کی گئی اور انہیں قائل کیا گیا کہ وہ بذات خود ان علاقوں کا دورہ کریں لیکن چند روز بعد انہیں قتل کر دیا گیا۔ صوبہ بہار کا ایک خوشحال قصبہ "مسوڑی" سرسبز و شاداب لہلہاتے کھیت خوبصورت منظر پیش کر رہے تھے۔ مسلمانوں کے خوبصورت اور بڑے بڑے گھر تھے لیکن ہندو بلوائیوں نے چن چن کر ہر ایک کو قتل کیا۔ قلعہ نما گھر خاموشی سے اپنے داستاں کنہاں تھے۔ مولانا ابو الکلام آزاد لاشوں کے انبار دیکھ کر ٹھٹک گئے اور آدھ گھنٹہ ساکت رہے۔ پھر ان تمام لاشوں کو اجتماعی قبر میں دفن کیا اور فاتحہ پڑھی۔ ضلعی کانگرس کمیٹی کے صدر اور مقامی عہدے داران سے مصافحہ کیے بغیر روانہ ہوئے اور کہا: "تم نے اہنسا کی لاج رکھ لی ہے، واقعی تم ستیہ داری ہو۔[74] "مسوڑی" قصبے میں ایک 10 سال کا بچہ گھومتا ہوا نظر آیا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ اس زبوں حالی میں تم ادھر اُدھر کیوں گھوم رہے ہو۔ اس نے کہا: "میری ماں اور میرے باپ کی یہ اکٹھی قبر ہے جس کی حفاظت کرتا ہوں"[75] جب اس سے پوچھا گیا کہ تم کہاں سے کھاتے ہو تو اس نے جواب دیا: "چمپا لال چمار کا بیٹا منی لال میرے ساتھ پڑھتا تھا، اب مجھے دو وقت کی روٹی دے جاتا ہے"[76]

اس درد بھری داستان کے بے شمار اوراق بکھرے پڑے ہیں کن کن کا تذکرہ کیا جائے۔ یہ ایک محال امر ہے جسے اس تحقیقی کام میں سمونا مشکل ہے۔ مہاتما جی کی اواز "ہندوستان چھوڑ دو" کئی سمے بود اس پر عمل درآمد ہونا شروع ہوا سب سے پہلے دیش بھگتوں کی باری آئی تو انہیں مار کر نشان عبرت بنا دیا گیا ان کے پیٹ چاک کیے، مقعد میں سلاخیں اور ان کے سروں کو کاٹ کر درختوں پر لٹکا دیا گیا۔ مقامی استعمار کی ستم ظریفی کو کہاں تک بیان کیا جائے۔[77]

بہار کے خونی واقعات کو درج زیل نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

- یہ قتل عام باقاعدہ باہمی مشاورت سے کیا گیا اور اس غارت گری میں کارکنوں کو اعتماد میں لیا گیا اور انہیں ضروری سامان فراہم کیا گیا۔

- جن مکانوں کو ٹارگٹ کرنا مقصود تھا ان کو ایک دن پہلے نشان زدہ کیا گیا۔
- قتل وغارت گری کرنے والے لوگوں کو مربوط تربیت دی گئی اور یہ خیال رکھا گیا کہ جس گاؤں پر حملہ کرنا مقصود ہو تو اس گاؤں کا کوئی بھی شخص اس جتھے میں شامل نہ ہو گا بلکہ دوسرے گاؤں والے اس پر حملہ آور ہوں گے۔
- ان جتھوں کی مزید تقسیم کاری کرتے ہوئے مختلف قسم کی ذمہ داریاں تفویض کی گئیں اور ان کاموں کی بجا آوری کے لیے ہتھیار مہیا کیے گئے۔ آگ لگانا، فائر کرنا، نقب لگانا، قتل کرنا، لوٹنا، اغوا کرنا وغیرہ شامل تھا۔
- ان جتھوں کی حملہ آور ہونے کی حکمت عملی کچھ یوں تھی۔ ہزاروں کی تعداد میں بلوائی جلوس بنا کر حملہ آور ہوتے۔ سب سے پہلے مطلوبہ گاؤں کے باہر کھلی جگہ پر پڑاؤ ڈالتے۔ ان کے لیے وہاں پر میلے ٹھیلوں کی طرح کھانے پینے کا وافر انتظام کیا جاتا ہے۔ "نعرہ بجنگی گونجاتے" ان میں مختلف انداز سے جوش وجذبہ پیدا کیا جاتا اور حملے کے لیے نکل پڑتے.
- مطلوبہ گھروں پر سامنے سے شدید فائرنگ کرتے۔ نقب لگانے والے نقب لگاتے اس کے بعد آگ لگانے والے آگ لگاتے، قتل کرنے والے قتل کرتے، بچوں کے سینے اور پیٹ چاک کرتے اور بوڑھی عورتوں کو ذبح کر دیا جاتا اور بوڑھوں کو اپاہج بنا دیتے تاکہ ان کے لیے نشان عبرت ہو اور اغوا کرنے والے خوبصورت عورتوں اور لڑکیوں کو اغوا کر کے لے جاتے۔
- ہندو مقامی آبادیوں میں فرقہ وارانہ اشتہارات تقسیم کیے جاتے ہیں کہ جن سے ان بلوائیوں کے اندر خون جوش مارتا اور وہ بدلے کے لیے تیار ہو جاتے۔
- مسلمان آبادیوں کے گھروں کو سامنے سے محفوظ رکھا گیا اور نقب لگا کر اندر داخل ہوئے اور اس کے کھڑکیوں اور دروازوں سے لکڑیوں کا کام لیتے ہوئے آگ لگا دی گئی جس میں زندہ انسانوں کے ساتھ قرآن مجید کو جلا دیا گیا۔
- ان گھروں میں جتنی کتابیں تھی انہیں آگ لگا دی گئی۔

- ہر مکان سے سونا نقدی وغیرہ لوٹ لی گئی
- قیمتی برتنوں کو ملیچھ سمجھتے ہوئے توڑ دیا گیا۔
- کپڑوں اور بستروں سے لاشیں جلانے کا کام لیا گیا۔
- اناج کی کوٹھیوں کو آگ لگا کر خاکستر کر دیا گیا۔
- گھروں کے صحنوں میں ایک کنواں تھا۔ خواتین نے کنویں کے کنارے اپنی چوڑیاں توڑ کر چھلانگیں لگا دی۔ جس پر بلوائیوں نے چارپائیاں ڈال کر اوپر پتھر رکھ دیے تاکہ وہ وہ وہیں مر جائیں۔
- مسوڑی کی مسجد میں شیر خوار بچوں کو کیل ٹھونک کر محرابوں میں ٹانگ دیا گیا اور آبادی کو قتل کر دیا گیا۔ بعد میں ان سب کو اجتماعی قبر میں دفن کیا گیا۔
- نوجوان لڑکیوں کو آپس میں تقسیم کیا گیا۔ بعد میں انہیں فروخت کر دیا یا زیادتی کے بعد گنگا میں بہا دیا۔
- تمام مکانوں کی جامع تلاشی کے بعد جو روپیہ سونا ملا اسے پنچائت سسٹم کے تحت آپس میں تقسیم کیا گیا۔
- گاؤں کے مویشی ساتھ والے گاؤں میں دے دیے اور کھیت کھلیان کاٹ کر بیچ دیے گئے۔
- مسلم لیگ کے دفاتر کی صورتحال کچھ یوں تھی کہ اسے لہو سے پہنچا گیا تھا اور اس کی دیواروں پر دو دو بچوں کے جسمانی پنجر کیلوں سے لٹکائے گئے تھے اور اس کے نیچے درج تھا:

"لے کے رہیں گے پاکستان"[78]

- ان فسادات کا حیران کن پہلو یہ بھی ہے کہ جس صوبے میں یہ واقعات تواتر سے ہوتے رہے اس صوبے کا گورنر برطانوی انگریز تھا اور وہ اس وقت چھٹی پر تھا۔ گورنر نے اپنی چھٹی منسوخ کی اور واپس آکر کچھ احکامات صادر فرمائے جس سے فسادات رک گئے۔

لوگوں اور مقامی ذمہ داران سے جب اس قضیہ کے متعلق پوچھنے کی کوشش کی گئی تو انہوں نے اسے مکافات عمل قرار دیا اور کچھ نے اسے نواکھالی کا ردعمل ظاہر کیا اور بعض لوگوں نے اسے گوریلا جنگ کی ریہرسل قرار دیا۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے انگریزی میں اس کی جامع رپورٹ تیار کر کے احکام بالا، کانگرس اور گاندھی جی کو بھجوائی اور اس کی ایک کاپی خان عبد الغفار خان کے حوالے کی۔ خان صاحب کی دعوت پر گاندھی جی تار ملتے ہی بہار پہنچنے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے بعد وزارت اہلکاروں کی دوڑیں لگ گئیں۔ گاندھی جی نے متاثرہ علاقوں کا دورہ کیا اور حالات دیکھ کر مایوس ہونے۔ انہوں نے کابینہ کے ارکان سے کہا:

"تم اس پر فخر نہیں کر سکتے: تم نے ستیہ کو ذبح کیا اور اہنسا کو آگ میں جھونکا ہے, میں تم سے خوش نہیں, مجھے بعض چہرے قتلوں کے چہرے نظر آرہے ہیں۔"[79]

نواب عبد الرب نشتر نے اسی زمانے میں انگریزوں کے متعلق کہا تھا کہ یہ ہندوستان کو اس کی آزادی کا مزہ چکھانا چاہتے ہیں اور وہ جلدی یہاں سے نکلنے کے لیے بڑے بیتاب دکھائی دیتے ہیں ایسے لگتا ہے کہ یہ کنواری لڑکی کی طرح کوئی گناہ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جواہر لال نہرو اور گاندھی جی نے بھی کہا تھا کہ انگریزوں کے دن پورے ہو چکے ہیں اور وہ ہندوستان سے جلدی نکل جانا چاہتے ہیں واقعات کی صورتحال کچھ اس طرح بنے کہ اس نے انگریزوں کو مشکوک کر دیا کیونکہ جہاں جہاں فسادات رچائے گئے وہاں صوبے کا گورنر انگریز اور ڈپٹی کمشنر بھی انگریز تھا۔ صوبہ اتر پردیش کے علاقے گڑھ مکتیشر میں ہندو مسلم فسادات ہوئے لیکن اس کے اثرات پورے صوبے تک پہنچے۔ جلاؤ گھیراؤ اور قتل و غارت گری کے علاوہ بعض نامور خاندانوں کی لڑکیوں کو اغوا کر کے گوڑ گاؤں کے ضلع میں فروخت کر دی گئیں۔ جس پر یوپی کے چیف سیکرٹری نے حکومت پنجاب کو اس کی واگزاری کے لیے صوبائی حکومت کو مزید فورس کے لیے خط لکھا خط کیونکہ کانفیڈینشل تھا پنجاب کا چیف سیکرٹری کیونکہ استعماری ایجنٹ تھا

اس نے آگے مسٹر بنیٹ انسپیکٹر جنرل کے پاس بھیج دیا اس نے خط پر لکھ دیا کہ ہمارے پاس اس مقصد کے لیے کوئی فورس نہیں۔ ہوم سکریٹری مسٹر میکڈانلڈ نے اس خط پر "فضول خط" لکھ کے داخل دفتر کر دیا۔ یہ کانفیڈینشل نوٹنگ مصدقہ ذرائع سے حکومت تک پہنچی تو جواہر لال نہرو نے گورنر جنرل کو بتایا کہ ان فسادات کے پیچھے انگریز افیسرز ہیں وہ جانے سے پہلے معاملات کو بگاڑنا چاہتے ہیں۔ اس طرح کے بے شمار عناصر جن میں حکومتی اہلکار، وزیر، مشیر اور نمائندے جو استعمار کے زلہ خوار رہے وہ گاہے گاہے ایسی حرکتوں میں ملوث رہے۔ جس کا علم ابو الکلام آزاد، گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کو بھی تھا لیکن وہ بے بس تھے۔[80]

ہندوستان کے حالات دن بدن فرقہ وارانہ تعصبات کہ دلدل میں دھنستے جارہے تھے۔ کانگرس کی حکومت نے اس کے محرکات کا کافی حد تک اندازہ لگالیا تھا لیکن بہت سارے معاملات میں وہ بے بس نظر آئی۔ کانگرس کے صدر مولانا ابو الکلام آزاد نے پنجاب کے وزیر اعظم ملک خضر حیات کو دہلی میں طلب کیا۔ ملک خضر حیات یونینسٹ پارٹی کے رکن تھے اور انتہائی قابل اور بردبار شخص تھے اور انہوں نے یونینسٹ پارٹی کے اتحادی کانگرس اور سکھوں کی مدد سے حکومت بنائی۔ ملک خضر حیات ابھی دہلی میں ہی تھے کہ ہوم سیکرٹری پنجاب ایوان جینکنز میکڈونلڈ اور اس انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب ریگینالڈ ایڈورڈ ہیری بینٹ نے مل کر پنجاب کی فضا مکدر کرنے کے لیے مسلم لیگ نیشنل گارڈ پر پابندی عائد کرتے ہوئے ان کے صوبائی دفتر سے تمام آہنی ٹوپیاں قبضے میں کرلی گئیں۔ یہ اہنی ٹوپیاں مسلم لیگ نیشنل گارڈ والوں نے ملٹری سے ردی ہونے پر خرید کی گئی تھیں۔ برطانوی استعماری اہلکاروں کے بعض سکھ خاندانوں سے گہرے مراسم تھے۔ پنجاب میں ہنگامہ برپا ہو گیا ہے۔ میاں افتخار الدین مسلم لیگ کے با اعتماد اور خلوص کارکن تھے لیکن جماعتی سطح پر وہ ملک خضر حیات کے حریف تھے۔ انہوں نے انتظامیہ کی اس حرکت پر بغیر مشورہ کیے ہفتے کے لیے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی اور ساتھ دی انڈین سیفٹی ایکٹ 1947ء کی تنسیخ کا مطالبہ کر دیا۔ "خضر وزارت توڑ دو" کے نعرے فضاؤں میں بلند ہونا شروع ہو

گئے۔ پورے صوبے میں ہلچل مچ گئی زبردست اور باکمال تقریروں کا آغاز ہو گیا جس کی وجہ سے یونینیسٹ حکومت اپنا وقار ہوتی چلی گئی۔ ملک خضر حیات فوری طور پر دہلی سے لاہور پہنچے۔ مسلم لیگ کے بڑے بڑے لیڈروں کو پابند سلاسل کر دیا گیا تھا۔ عوام نے جان کی بازی لگادی جس سے احتجاج کا بازار گرم ہو گیا۔ خفیہ ادارے پنجاب کو بھی فرقہ وارانہ بربریت میں دھکیلنا چاہتے تھے لیکن لیگیوں کا تدبر کام آیا۔ ایک نوجوان عبد المالک کی جان بیڈن روڈ پر چلی گئی لیکن مسلم لیگیوں نے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہندوؤں کے خلاف کچھ بھی نہ کہا۔ ان کے جوش و خروش کا نشانہ صرف ملک خضر حیات تھے۔ ملک خضر حیات نے نیشنل گارڈ سے پابندی ہٹالی اور تمام گرفتار سیاسی کارکنان کو چھوڑ دیا گیا۔ ہر گلی ہر ملامت ملک خضر حیات کے لیے تھی۔ مسلمان لڑکیوں نے سیکرٹیریٹ پر پاکستانی پرچم لہرا کر لوگوں میں جوش و جذبہ کو دوبالا کر دیا ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے کہ انقلاب آ گیا۔ برطانوی استعماری اہلکاروں کی سازش کامیابی کی طرف بڑھتی گئی لیکن مسلم لیگ کی اعلی ظرفی کی بدولت انہیں ناکامی ہوتی چلی گئی۔ حکومت کے مسلمان افسر گاہے گاہے مسلم لیگ کی مدد کرتے رہے۔ ملک خضر حیات کو مشورے ملتے رہے کہ انہیں تشدد سے دبایا جاسکتا ہے۔ لیکن وہ راضی نہ ہوئے۔ انہوں نے ایک دوست سے گفتگو کرتے ہوئے کہا:

> "یہ لوگ میرے ہاتھوں میری قوم کا تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں میں اپنی قوم کا دشمن نہیں جو کچھ میرے ہاتھ ساتھ ہو رہا ہے مجھے منظور ہے لیکن ہندو اخبار جو چاہتے ہیں وہ کبھی نہ ہو گا وہ مجھ سے ہمدردی نہیں کر رہے بہتر بھی کر رہے ہیں مسلمان میرے نام کے دشمن ہو گئے ہیں انہیں حق حاصل ہے جتنی گالیاں بھی دینی چاہیں دے لیں میں خوش ہوں لیکن میں ان کا زور کبھی ٹوٹنے نہ دوں گا بینٹ کہتا ہے کہ فلاں فلاں معافی مانگنے کے لیے تیار ہے ایسا کبھی نہیں ہو گا میں اس سے پہلے مستعفی ہو جاؤں گا۔"[81]

کانگرسی وزیر، انگریز افسران اور دوسرے اعلی عہدے داران ملک خضر حیات کے سامنے چپ ہو جاتے ہیں۔ وہ وزارت چھوڑنے کی دھمکی دیتے۔ کئی جگہ تشدد کے واقعات ہوئے لاٹھی چارج ہوا انسو گیس پھینکی گئی انبالہ میں گولی بھی چلائی گئی لیکن تحریک کا وہ رنگ نہ بن سکا جو استعماری اہلکار چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھی وزرا سے مشورہ کیے بغیر اپنی والدہ کے کہنے پر استعفی دے کر گھر کی راہ لی۔ بعد میں اپنے ساتھی وزراء کو بلا کر انہیں آگاہ کیا جس پر وہ سب حیران رہ گئے۔ پھر انہوں نے خان مدوٹ کو گھر بلوایا اور ان سے کہا:

"نواب صاحب لیجیے میں نے وزارت سے استعفی دے دیا ہے اپ شوق سے وزارت بنایئے میں اور میرے رفقا ہر حالت میں اپ سے پورا پورا تعاون کریں گے لیکن میرا خیال ہے کہ اپ وزارت نہ بنا سکیں گے سکھوں اور ہندوں کے متعلق اپ کے اندازے اور مطالعے غلط ہیں"[82]

175 کے ایوان میں ملک خضر حیات کے پاس 86 سیٹیں تھیں۔ مسلم لیگ کو دو غیر مسلم ممبر ملنا مشکل ہو گیا۔ ریڈیو پاکستان پر استعفی کی خبر چل گئی، نواب ممدووٹ کو پھولوں کے ہار پہنا دیے گئے، شہر شہر قریہ قریہ گولے چھوڑے گئے، آتش بازی کی گئی مسلمان اخباروں نے مسلم لیگ کی وزارت بن جانے پر تہنیتی پیغامات چھاپ دیئے۔ مسلم لیگی قیادت اس غلط فہمی میں رہی کہ وہ سکھوں سے سمجھوتہ کر کے وزارت بنالیں گے۔ قائداعظم نے پیشکش کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ملک خضر حیات نے عوام سے کہا:

"مجھے اندیشہ ہے کہ پنجاب کا روایتی اطمینان جو اسے صدیوں سے حاصل ہے ہمیشہ کے لیے غارت ہو جائے گا، اب یہاں کے لوگوں پر شاز ہی چین کی رات یا چین کا دن آئے گا، لیگ کے لیے وزارت سازی کا دروازہ ضرور کھلا ہے لیکن وزارت بنانا اس کے بس میں نہیں۔"[83]

سکھوں نے اعلان کیا کہ ہماری لاشوں پر سے گزر کر ہی وزارت بن سکتی ہے۔ ہندو اخباروں کے ایڈیٹروں نے بھی دھمکی لگائی۔ کانگرس نے طوفان کھڑا کر دیا۔ سکھوں نے مسلمانوں پر سنگریزی شروع کر دی اور پاکستان مردہ باد کے نعرے لگائے۔ شاہ عالمی دروازے کے پاس ایک اور مسلمان راہگیر قتل ہو گیا۔ پنجاب کو افواؤں نے گھیر لیا۔ حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ انتظامیہ کی طرف سے دفعہ 144 کا نفاذ عمل میں لایا گیا اور حالات مخدوش ہونے پر کرفیو لگا دیا گیا اور اس طرح پنجاب کا امن تباہ ہو گیا۔[84] پنجاب میں فسادات کی ابتدا ہندوؤں اور سکھوں نے کی۔ مسلم لیگی رہنماؤں نے حتی الامکان کوشش کی کہ فسادات کو ہر حال میں روکا جائے۔ لیکن یہ یک طرفہ کوشیش کامیاب نہ ہو سکیں۔ مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں میں گھمسان کی جنگ شروع ہوئی۔ سکھوں اور ہندوؤں کے اکثریتی علاقوں میں مسلمان معتوب رہے جبکہ مسلمانوں کی اکثریتی علاقوں میں مسلمانوں نے اقلیتوں کے ساتھ برا سلوک کیا۔ مسلمانوں کی بڑی بڑی دکانوں کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ لیکن انسان کا انسانیت سے بڑا تعلق کوئی نہیں ہے اور یہ تعلق مذہب و ملت سے ماورا ہے اس پر فتن فضا میں کسی دشمن کی بقا کے لیے اسے تحفظ دینا بذات خود ایک وبال جان بن جاتی ہے لیکن انسانیت کے اس تعلق نے اس کی پرواہ نہ کی۔ یہ انسانیت اور سماجی تعلق کی عمدہ مثال ہے۔ قصہ کچھ یوں ہے ہندوستان پنجاب کے ضلع جالندھر کے شہر پراگداس کے سکھ نے اپنی بیٹی کی ہم جماعت تین مسلمان لڑکیوں کو اپنے گھر میں پناہ دے کر جان بچائی۔ بلوائی ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کے گھر پہنچے اور لڑکیوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ سکھ نے پہلے تو انکار کیا لیکن جب انہوں نے تلاشی پر اصرار کیا تو سکھ کو غصہ آ گیا تو اس نے کہا:

"لڑکیاں میرے پاس ہیں, تمہارے حوالے نہیں کروں گا, صرف میری جان سے کھیل کر ہی لے جاسکتے ہو، پہلے میری لڑکی اٹھاؤ پھر یہ لڑکیاں لے جانا"[85]

غیرت و حمیت کا تعلق انسانی خصلت، خاندان اور سماجی ماحول اور تربیت سے عبارت ہے۔ اس کی یہ ذاتی خصوصیت اسے ممتاز کر گئی۔ اس طرح بلوائی واضح جواب سن کر گالیاں دیتے ہوئے رخصت ہوئے اور ان بزرگوار نے اگلے دن انہیں ان لڑکیوں کے ورثہ کے حوالے کر دیا لیکن کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ اکالی سکھوں نے ان سردار صاحب کو اسی جرم میں قتل کر دیا۔ سکھ لیڈر ماسٹر تاراسنگھ راولپنڈی کہوٹہ کے رہنے والے تھے۔

ان کی بوڑھی ماں کو ٹانگیں سے چیر کر ہلاک کر دیا اور گھروں کو آگ لگا دی گئی۔ ہندوؤں کے محلوں کو بے دردی سے لوٹا گیا۔ مسلمان رضاکار صوبہ بہار سے اپنے ساتھ بچوں کی ہڈیاں اور عورتوں کے بال لائے تھے۔ لوگوں کو ان کی مظلومیت کے متعلق بتایا گیا جس نے لوگوں کو مزید برانگیختہ کر دیا۔ دیہات کے دیہات جلا دیے گئے اور بے حساب لوگوں کو قتل کر دیا گیا عورتوں کو اغوا کر لیا گیا اور سکھوں کی داڑھیاں مونڈھ دی گئیں اسی ڈر اور خوف سے گھبرا کر بہت سارے مسلمان ہو گئے۔ گو کہ یہ صوبہ بہار کے مظالم کا عشر عشیر بھی نہ تھا لیکن پھر بھی ظلم کی انتہا کر دی گئی۔ یہ اسلامی فعل نہیں تھا بلکہ انسانی شکل میں موجود وہ شیطان جس نے کسی بندھن، کسی رشتے یا کسی تعلق کی پرواہ نہ کرتے ہوئے یہ سب کچھ انجام دیا۔ آخر کار لاہور میں بھی اس غنڈا گردی کا بازار گرم ہوا۔ اس کی ابتدا ہندوؤں اور سکھوں سے ہوئی۔ خدا کی بستی شوکت صدیقی کا ناول ہے انہوں نے اس میں قیام پاکستان کے بعد کے حالات زندگی، مسائل، سیاسی، معاشی الجھنوں اور نظریاتی وابستگی کے متعلق بات کی ہے ۔اس کے مطالعہ سے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ اپنی زندگی گزار رہا ہے۔ یہی بندھن، تعلق، رشتے داری اپنے اپنے مفادات کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔

سنگھٹن تحریک بیسویں صدی کی قتل و غارت گری میں تربیت یافتہ تحریک ہے جس کا مقصد ہندو معاشرت کو مضبوط اور خطرات سے بچانا ہے۔ سنگھٹن تحریک کے لوگوں نے رات کو مسلمانوں پر حملہ کیا اور انہیں زندہ جلا ڈالا۔ برانڈرتھ روڈ پر دو راہگیر مسلمانوں کو گولی مار دی گئی۔ سرکلر روڈ پر ایک نوجوان کی آنتیں نکال دیں۔ سوئے ہوئے لوگوں پر تیل چھڑک کر زندہ جلا دیا گیا۔ پے در پے ان واقعات نے مسلمانوں کو اشتعال دلایا ۔اسلام غنڈوں کے ہاتھ میں آ گیا انہوں نے جو ہو سکتا تھا وہ غیر انسانی رویہ اختیار کیا جسے ضبط تحریر نہیں کیا جا سکتا ۔ہندوستان کے ان تمام واقعات کا محرک ان اقوام کے لیڈران کا دہرا معیار یا دوغلا پن تھا جو ان تمام واقعات کی بنیاد بنا۔ اشتعال انگیز جلسے، جلوس کیے گئے۔ غیرت و مردانگی کی باتیں کی گئیں۔ حتیٰ کہ اسلحہ کی نمائش کی گئی اور انہیں مہیا کیا گیا۔ برسر عام کرپانیں اور تلواریں لہرائیں گئیں۔ مزید برآں نعرے اس قسم کے لگائے گئے کہ عوامی جزبات بھڑک اٹھے۔ اب سمندر کے سامنے مولانا ابو الکلام آزاد اور گاندھی جی کیا کر سکتے تھے۔ ان کے ارد گرد یا ان کی کابینہ میں وہی لوگ تھے جنہوں نے اشتعال انگیزی کو جنم دیا۔ وہ ان کی دوہری شخصیت کو جانتے

تھے۔ انہیں ان واقعات کا ادراک تھا لیکن اپنی سیاست کے خول سے باہر نہیں آنا چاہتے تھے۔ قائد اعظم نے ماسٹر تاراسنگھ کو سمجھانے کی کوشش کی اور پنجاب حکومت میں شمولیت کی پیشکش کی لیکن اسمبلی چیمبر کے باہر نکل کر کرپان لہرائی اور اعلان کیا کہ ہماری لاشوں سے گزر کر مسلم لیگ کو وزارت نہیں بنانے دیں گے۔ آج وہی لیڈران اپنی قوم کی حفاظت کرنے سے قاصر تھے۔ جنہوں نے اپنی قوم کی آبیاری عصبیت سے کی اور وہ آج رنگ دکھا رہی تھی۔ اگر ان لیڈران نے ہوش مندی سے اور وقت پر سیاسی فیصلہ لے لیا ہوتا تو آج ان قباہتوں سے بچا جا سکتا تھا۔ سورن سنگھ نے کہا: "ایک ہی علاج ہے, ملک تقسیم ہو جائے, بٹوارہ ہو اور ضرور ہو, اب ہم مسلمانوں کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں"[86]

ہندوستان کے فسادات اس کی زیرک قیادت کے لیے ایک لمحہء فکریہ تھے۔ اتنے بڑے بڑے سیاستدان، اتنی بڑی انتظامیہ اور ہر طرح کے ذرائع سے مسلح کیا انہیں یہ نہیں پتہ کہ ان فسادات کی جڑ کیا ہے؟ اتنا روپیہ پیسہ کون خرچ کر رہا تھا۔ سب کچھ ان کی نظروں کے سامنے تھا اور وہ جانتے تھے یہی وہ دوہرا شعور سد راہ تھا۔ جہاں انگریز ڈپٹی کمشنر تھے وہاں یہ فساد جاری تھا اور وہ بڑے فخر سے کہتے: "ہم نہ کہتے تھے کہ ہندوستان کے لوگ آزادی کے قابل نہیں"[87]

قاضی عبد الغفار کا ناول "لیلی کے خطوط" جب بھی رویوں کے خلاف باغیانہ طرز احساس کی بات ہو تو تقسیم کا پر آشوب دور نظر آتا ہے۔ اسی طرح "سفینہ غم دل" 1952 میں شائع ہوا ہے اس میں بھی تقسیم کے حالات و واقعات بعد کی صورت حال کو بڑی صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔

20 فروری 1947 کو برطانوی وزیر اعظم لارڈ اٹیلی نے اعلان کیا کہ برطانوی حکومت 16 جون 1948 سے پہلے ہندوستان چھوڑ جائے گی۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی نے 8 مارچ کو اعلان کیا کہ ہندوستان کی تقسیم ناگزیر ہے۔ مسلم لیگ، کانگرس، یونینسٹ اور سکھ رہنماؤں نے تقسیم کے متعلق مختلف بیانات دیے۔ وائسرائے لارڈ ویول کو برطانوی وزیر اعظم لارڈ اٹیلی سے اختلافات کی بنیاد پر مستعفی ہونا پڑا۔ 22 مارچ 1947 کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن مکمل اختیارات کے ساتھ گورنر جنرل کی حیثیت سے ہندوستان پہنچے۔ 8 مئی 1947 کو برطانوی حکومت کو آگاہ کرنے کے لیے لندن روانہ ہوا۔ اور 31 مئی کو تقسیم ہند کا منصوبہ لے کر واپس آیا تو تین جون 1947 کے منصوبے سے

ہندوستانی لیڈران کو آگاہ کیا۔ اس منصوبے کو "ماؤنٹ بیٹن پلان" بھی کہا جاتا ہے۔ اس منصوبے کا مقصد ہندوستان کو دو آزاد ممالک بھارت اور پاکستان میں منقسم کرنا تھا. اس منصوبے کو تمام جماعتوں نے تسلیم کیا کیونکہ ملکی حالات کے پیش نظر اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔ سر سائریل ریڈ کلف کی سربراہی میں ریڈ کلف کمیشن مقرر کیا گیا۔ جس کا مقصد ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنا تھا جس میں پاکستان مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل ہو گا جبکہ بھارت ہندو اکثریتی ملک ہو گا۔ ریڈ کلف ایوارڈ کا اعلان 17 اگست 1947 کو کیے گئے اور یہ اعلان غیر منصفانہ تھا کیونکہ مسلمانوں کی اکثریت کے باوجود گرداس پور کا ضلع ہندوستان کو دیکھ کر کشمیر کا قضیہ پیدا کر دیا جائے۔ ہندو رہنماؤں نے ہندوؤں کو کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی حفاظت خود کریں کیونکہ حکومت ان کی حفاظت نہیں کر پائے گی جبکہ مسلمان اینڈ موقع پر سوچتا ہے جس کا خمیازہ انہیں بھگتنا پڑا۔ ریڈ کلف ایوارڈ کی تقسیم غیر منصفانہ اور جانبدارانہ تھی لیکن اسے مانے بغیر گزارانہ تھا۔ یہ ایک الگ بحث ہے۔ اصل گفتگو کا محور وہ تمام فسادات ہیں جو ان اقوام کے درمیان وقوع پذیر ہوئے۔ فرانز فینن لکھتے ہیں:

> "استعمار کی شکست کبھی خاموشی سے عمل میں نہیں آتی. اس لیے کہ یہ افراد کو متاثر کرتی ہے اور ان میں بنیادی تبدیلیاں لاتی ہیں۔ یہ ان تماشائیوں کو جو اپنی معنویت کے بوجھ تلے دبے ہوتے ہیں بامعنی اداکاروں میں تبدیلی کر دیتی ہے۔"[88]

لیڈروں کی دوہری شخصیت کے باعث وقت پر فیصلہ نہ کر سکی۔ کانگرس ہندوستان کی تقسیم کے مخالف تھی۔ اگر ان حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے فیصلے لیے جاتے تو یقیناً اتنا بڑا جانی نقصان نہ ہوتا۔ اگر کانگرس شروع سے ہی ہندوستان کے بٹوارے پر راضی ہو جاتی تو سماجی و معاشرتی سطح پر معاملات تناؤ کا سبب نہ بنتے۔ چالاکی اور مکاری چھپی نہیں رہ سکتی۔ ایک نہ ایک دن وہ کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ قائداعظم بھی پہلے ان کے ساتھ تھے لیکن جب وہ ان کی ذہنی استعداد کو سمجھے تو انہوں نے ان سے علیحدگی اختیار کی۔ وہ ہندو سوچ کو بھانپ چکے تھے۔ اس لیے قائداعظم نے واشگاف الفاظ میں دو قومی نظریہ پیش کیا۔ اگر کانگرس صلح و آشتی سے اسے تسلیم کر لیتی تو معاشرتی خلفشار سے بچا جا

سکتا ہے۔ کانگرس نے یہی معاملہ سکھوں کے ساتھ کیا۔ انہوں نے اپنے لوگوں کی طرح سکھوں کو بھی مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا۔ اس پر سکھوں نے بڑے دعوے کرنے شروع کر دیے جن میں ان کا ایک بڑا دعوی "سکھ صوبہ" کا بھی تھا۔ اب اس تقسیم کے بعد وہ ہندوؤں کی جھولی میں چلے گئے۔ یہ احساس برتری ہی تھا جو انہیں کسی فیصلے پر آنے سے روکتا رہا۔ قائد اعظم نے پنجاب کی وزارت بنانے کے لیے ان سے ان کے مطالبات پوچھے لیکن انہوں نے اظہار تفاخر کرتے ہوئے دھمکی دی کہ خون کی ندیاں بہا دیں گے لیکن مسلمان وزارت قائم نہیں ہونے دیں گے۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی مسلمان وزارت تھی اس کے وزیر اعظم ملک خضر حیات تھے۔ لیکن ان کی پارٹی یونینسٹ تھی جس کا کانگرس سے الحاق تھا۔ اگر قائد اعظم کی باتیں مان جاتے تو ہو سکتا تھا آئندہ آنے والے دنوں میں مسلم لیگ شاید ان کے حق میں فیصلہ کر دیتی۔ لیکن قائد اعظم ہندوؤں کے ساتھ سکھوں کے توڑ جوڑ کو پہچان چکے تھے۔ مذہبی لحاظ سے وہ ہندوؤں سے مختلف ہیں لیکن تہذیب و ثقافت میں ان کے ساتھی وہ اپنے ذہنوں میں شعوری اور لاشعوری طور پر مسلمانوں کے بارے اچھا گمان نہیں کرتے۔ ہندوؤں اور سکھوں کی ذہنی پراگندگی فسادات کا باعث بنی۔ حالانکہ صدیوں سے اکٹھے رہتے آئے ہیں ان کا رہن سہن، بود و باش، سماجی و سیاسی، معاشی و معاشرتی معاملات مثالی نہیں رہے تو زیادہ برے بھی نہیں رہے۔[89]

برطانوی استعمار کے آنے سے پہلے بھی ہندوستان میں کچھ خود مختار ریاستیں تھیں۔ برطانوی استعمار نے ان میں سے کچھ خود مختار ریاستیوں کو فتح کر لیا اور کچھ ریاستوں کے ساتھ معاہدے کر کے انہیں نیم خود مختاری دے دی گئی۔ لیکن خارجہ پالیسی اور دیگر معاملات اپنے کنٹرول میں رکھے۔ اس دور میں ان ریاستوں کی تعداد 565 رہ گئی۔ ان ریاستوں کو صرف اپنی داخلی خود مختاری برقرار رکھنے کی اجازت دی گئی لیکن اس پر بھی انہوں نے قدغن لگائی کہ وہ استعمار کے وفادار ہوں گے۔ اس کے باوجود ان ریاستوں کے اپنے خود مختار حکمران، قوانین، عدل و انصاف، شعبہ مالیات اور دیگر شعبہ جات یعنی داخلی سطح پر ان کا اپنا نظام حکومت تھا اور انہیں برطانوی استعمار کی مکمل تعاون حاصل تھا۔ اسی طرح کی ایک پٹیالہ ریاست تھی جس کے حکمران مہاراجہ یادویندر سنگھ تھے۔ وہ روزنامہ "ریاست" میں چھپنے والے مضامین سے بہت تنگ تھے۔ انہوں نے اس کے ایڈیٹر کو رام کرنے کی کوشش کی لیکن ان سے کچھ بن نہ سکا۔ اسی اثناء میں روزنامہ "ریاست" دن بدن عوام کی آواز بنتا چلا گیا اور ظلم و جبر کے خلاف ایک آہنی دیوار ثابت ہوا. والی

ریاست مہاراجہ یادویندر سنگھ کو اس روزنامے کا بڑا قلق تھا۔ ایک مقامی مقدمے میں پٹیالہ پولیس نے لالہ جوت رام کے گھر کی تلاشی لی تو انہیں ایک پوسٹ کارڈ ملا جو کہ کافی عرصہ پہلے لالہ جوت رام کے نام لکھا گیا تھا جس میں 200 روپے کا تذکرہ تھا کہ چند دن کے اندر اسے ادا کر دیا جائے گا لہذا یہ قرضہ ایک ماہ کے بعد 200 روپے لالہ جوت رام کو واپس کر دیا گیا تھا۔ سب انسپیکٹر کو مہاراجہ پٹیالہ اور ایڈیٹر روزنامہ "ریاست" کی دشمنی کا علم تھا۔ اس نے وہ کارڈ انسپیکٹر جنرل پولیس کو دے دیا جس پر ایڈیٹر کو پھانسنے کے لیے لمبی منصوبہ سازی کے تحت خیانت کاری کا جھوٹا مقدمہ قائم کیا گیا۔ گواہان کے لیے لمبڑداروں کو تیار کیا گیا اور لالہ جوت رام پر دباؤ ڈال کر بیان لیا گیا لیکن لالہ انتہائی بہادر، فیاض اور دوست نواز تھے۔ اگلے روز دہلی ایڈیٹر روزنامہ "ریاست" دیوان سنگھ کے پاس پہنچ کر انہیں تمام حالات و واقعات سے آگاہ کیا۔ دیوان سنگھ نے لالہ جوت رام سے کہا کہ آپ کو رسید دینے پر کوئی اعتراض ہے تو لالہ نے رسیدی ٹکٹ لگا کر رسید لکھ دی اور کچھ دن رہ کر واپسی کا سفر اختیار کیا۔ کچھ دنوں بعد پٹیالہ ریاست کہ پولیس اہلکار ایکسٹر اڈیشن ایکٹ کے تحت گرفتاری کے لیے دہلی پہنچ گئے۔ ایکسٹر اڈیشن ایکٹ دو ممالک کے درمیان قانونی طریقہ کار ہے جس کے تحت ملزم کو متعلقہ ملک کے حوالے کیا جاتا ہے تاکہ مقدمہ چلا کر قرار واقعی سزا دی جاسکے۔ دیوان سنگھ پٹیالہ جیل کی سختیوں اور مہاراجہ کی ذہنی سطح سے واقف تھے۔ انہوں نے پٹیالہ پولیس کے اہلکاروں کو رسید پیش کی تو وہ حیران ہوئے کہ مقدمہ ہاتھ سے نکل گیا لیکن وہ دیوان سنگھ کو لے کر مقامی تھانے کے سپرد کرتے ہوئے انہیں حوالات میں بند کرنے کا کہا، جس پر ڈپٹی سپرنٹینڈنٹ پولیس نے انہیں جواب دیا کہ یہ ہمارا کام ہے آپ ہوٹل جا کر آرام کریں۔ ڈپٹی سپرنٹینڈنٹ پولیس ملک دیوی دیال نے فوری سپرنٹینڈنٹ سی آئی ڈی مسٹر مارگن کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا اور مسٹر مارگن نے ڈپٹی کمشنر مسٹر جانسن کو ٹیلی فون کے ذریعے تمام حالات بتائے دیوان سنگھ کے تعلقات سے بھی آگاہ کیا۔ جس پر ڈپٹی کمشنر جانسن نے ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ 500 روپے زر زمانت پر اسے رہا کر دیا جائے۔ رات 11 بجے سٹی مجسٹریٹ مسٹر لوئیس نے گھر پر ضمانتی کاغذات پر دستخط کئے اور انہیں رہا کر دیا گیا۔ اگلی صبح جب پٹیالہ ریاست کے اہلکاروں کو دیوان سنگھ کی رہائی کا علم ہوا تو ان کا رنگ اڑ گیا اور پریشان ہوئے۔ دیوان سنگھ ایجنٹ گورنر جنرل کرنل سینٹ جان کے پاس پہنچے اور انہیں اپنے مقدمے سے آگاہ کیا اور بتایا کہ یہ جھوٹا اور بے بنیاد ہے۔ کرنل سینٹ جان نے واضح طور پر بتایا کہ مقدمہ جھوٹا ہو یا سچا گورنمنٹ کسی صورت بھی ریاستی حکومت کو بے نقاب

ہو تا نہیں دیکھ سکتی۔ وہ اسے ایکسٹر اڈیشن ایکٹ کے تحت پٹیالہ ریاست کے سپرد کر دے گی۔ دیوان سنگھ نے پوچھا کہ کیا برطانوی انصاف یہی ہے؟ جس پر کرنل سینٹ جان نے تحکمانہ انداز سے جواب دیا: "ہم انصاف نہیں جانتا. ہمارا کام ہے کہ نوابوں اور مہاراجوں کی پریس کے حملوں سے حفاظت کی جائے"[90]

دیوان سنگھ کو اس جواب سے اندازہ ہو گیا کہ مہاراجہ یا وزراء میں سے کسی نے استعماری افسروں کو اعتماد میں لے کر کارروائی کی ہے اور اگر انہیں ریاست کے حوالے کر دیا گیا تو ہائی کورٹ بھی کچھ کر نہیں سکے گی۔ دیوان سنگھ نے اپنے گھوڑے تیز کر دیے اور گھومتے گھماتے شملہ پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنے دوستوں کو حالات کی سنگینی سے آگاہ کیا۔ اسمبلی کا اجلاس جاری تھا مسٹر نیوگی نے ایڈجرنمنٹ موشن پیش کر دی۔ سب ممبران حیران ہوئے اور پولیٹیکل سیکرٹری ہند سے پوچھا گیا تو وہ بھی لاعلم نکلے۔ آخر کار فیصلہ کیا گیا کہ دیوان سنگھ کو اس مقدمے میں پٹیالہ ریاست کے سپرد نہیں کیا جائے گا۔ جس پر والی ریاست پٹیالہ مہاراجہ پولیٹیکل سیکرٹری سر جان تھامپسن سے ملے اور ان سے کہا کہ ریاست پٹیالہ کی بہت بے عزتی ہو چکی ہے جس پر وہ سرنگوں ہے۔ اب دیوان سنگھ کو ریاست کے حوالے کر دیا جائے ورنہ میں ریاستی حکمرانی سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔ جس پر سر جان تھامپسن نے مہاراجہ کو ٹال مٹول سے رخصت کیا اور ڈپٹی پولیٹیکل سیکرٹری سے کہا کہ اگر مہاراجہ سبکدوش ہونا چاہتے ہیں تو ہو جائیں لیکن بکری کو بھیڑیے کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ اس واقعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ برطانوی استعمار اور مقامی استعمار کا تعلق کیسا تھا۔ یہ محکوم ریاستیں استعمار زدہ کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرتی ہوں گی۔ رد استعماری رویوں سے کس طرح ظلم و بربریت سے نپٹتی ہوں گی۔ دیوان سنگھ اثر ورسوخ کا حامل ہوتے ہوئے صرف 200 روپے کے جھوٹے مقدمے میں پریشان ہوا۔ کیا ایک غریب یا عام آدمی ان طاقتوروں کے سامنے کوئی سوال اٹھا سکتا ہے۔[91] اس طرح کا ایک اور واقعہ ریاست نالہ گڑھ ان 565 ریاستوں میں سے ایک تھی جہاں پر برطانوی استعمار کے مقرر کردہ حکمران مسلط تھے اور نالہ گڑھ کا قصبہ اس کا دارالحکومت تھا۔ اس شاہی ریاست کا حکمران راجہ بھوپندر سنگھ تھا۔ اس کی رانی کا نام گوربخش گور تھا۔ ان کے آپس میں ذاتی، ریاستی اور خاندانی اختلافات بڑھ گئے تھے۔ گورنمنٹ اف ہند کی طرف سے بھیجا گیا وزیر جو کہ سرکاری افسر بھی تھا۔ اس کا رانی کے ساتھ برتاؤ نہ گفتہ بہ تھا اور کسی شخص کو بھی

اجازت نہ تھی کہ وہ رانی گور بخش کور کو مل سکے ان حالات کے پیش نظر ایڈیٹر روزنامہ "ریاست" کو خط لکھا گیا اور ریاستی مسائل کے ساتھ اپنے مصائب بھی بیان کیے جس پر دیوان سنگھ ڈپٹی کمشنر ویک فیلڈ کے پاس گیا کیونکہ ریاست نالہ گڑھ ان کے ماتحت تھی۔ انہوں نے ریاستوں کے بڑھتے ہوئے مظالم، بد انتظامی اور رشوت خوری کے متعلق کھل کر بات کی اور ساتھ ہی ان مظالم کی تیار کردہ ایک فہرست پیش کی اور انہیں اس صورتحال سے آگہی کے بعد مطالبہ کیا گیا کہ ان جرائم کی تصدیق کے لیے ایک ایماندار افسر بھیجا جائے تاکہ وہ اچھے طریقے سے چھان بین کر سکے۔ ڈپٹی کمشنر نے یقین دلایا کہ ان الزامات کی تحقیقات کی جائیں گی اور آپ کو آگاہ کیا جائے گا۔ جس پر دیوان سنگھ واپس دہلی روانہ ہوا۔ کوئی تین ہفتوں کے بعد ڈپٹی کمشنر کا ایڈیٹر روزنامہ "ریاست" کو تار گیا کہ وہ سوموار کو گیارہ بجے آکر ملیں۔ ڈپٹی کمشنر نے ملاقات پر دیوان سنگھ کو تمام کارروائی سے اگاہ کیا گیا اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ گورنمنٹ وزیر موصوف کو معطل کر کے اس کے خلاف رشوت کا کیس بھی بنانا چاہتی ہے اس لیے انہیں ثبوت فراہم کیے جائیں۔ دیوان سنگھ نے ڈپٹی کمیشن کو بتایا کہ اگر یہ الزامات درست ہیں تو میرا موقف درست ہے۔ ثبوت کے حوالے سے معذوری ظاہر کی گئی لیکن انہیں یہ تجویز دی گئی کہ وزیر موصوف کو فوری برطرف کیا جائے تاکہ غریب عوام اور رانی گور بخش گور کو انصاف مل سکے۔ لہذا وزیر کو وہاں سے ہٹا دیا گیا اور تنزلی کر کے کسی دوسرے علاقے میں بھیج دیا گیا۔ اگر یہ قضیہ کسی انگریز عہدے دار کے درمیان ہوتا تو یہ کبھی بھی رانی گور بخش کور اور مظلوم رعایا کے حق میں نہ ہوتا کیونکہ یہ ہندوستانیوں کے درمیان تھا اس لیے اس پر عمل ہوا اور مقامی استعمار کے ظلم و بربریت سے چھٹکارا حاصل ہوا۔[92] والیان ریاست ہندوستان کے متعلق پولیٹیکل سیکرٹری جان تھامپسن نے کہا:

> "سردار صاحب! اب شاید زندگی میں موقع نہ مل سکے مگر میری خواہش ہے
> کہ اگر ایک بار پھر مجھے والیان ریاست پر اختیارات حاصل ہوں تو میں ان میں
> سے نصف کو پانچ سال کے اندر ختم کر دوں۔ یہ لوگ اس قابل نہیں کہ پبلک
> ان کے رحم و کرم پر چھوڑی جائے"[93]

جبر و تشدد اور بہمیت استعمار کی نمایاں خصوصیت ہے اور وہ ان مقاصد کے حصول کے لئے مقامی استعمار کو ڈھال کے طور پر استعمال کرتا رہا ہے۔ درج ذیل واقعات مقامی استعمار کے ذریعے کی جانے والی جبر و

تشدد کی پالیسی کا اہم مظاہرہ ہیں۔ مقامی استعمار کا استعمار زدہ کے ساتھ رویہ ناقابل فہم حد تک گھناونا، اندوہناک اور دوہری شخصیت کا حامل تھا۔ ان کے جرائم کو بے نقاب کرنے کا ذمہ روزنامہ "ریاست" نے لیا ہوا تھا۔ ایک دفعہ رائے بہادر سردار نرائن سنگھ ٹھیکے دار اور ایڈیٹر روزنامہ "ریاست" دونوں محو سفر تھے۔ پٹیالہ کے سردار بہادر جنرل بخشیش سنگھ جو وہاں کی فوج کے جنرل تھے جنہیں ان کی بہادری اور لیاقت کی وجہ سے برطانوی حکومت کی طرف سے کئی خطابات اور تمغے مل چکے تھے۔ پٹیالہ میں ان کا بڑا مقام تھا۔ اور لوگ اُنہیں عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ سردار نرائن سنگھ نے مہاراجہ پٹیالہ کی دوہری شخصیت کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ وہ کس طرح جنرل بخشیش سنگھ سے ذاتی طور پر ناراض ہوئے اور انہیں ایک جھوٹا مقدمہ بنا کر جیل میں ڈال دیا اور وہ فوجی جنرل جیل کے قیدیوں کی وردی پہنے جیل کوٹری میں زندگی کے بقیہ دن گزار رہا ہے۔ ایسے شخص کی رہائی کے لیے مدد کرنی چاہیے۔ کچھ دن بعد ایڈیٹر روزنامہ "ریاست" نے جنرل بخشیش سنگھ کے حوالے سے واقعات درج کیے اور کمانڈر ان چیف ہند کی توجہ دلاتے ہوئے گورنمنٹ سے مطالبہ کیا کہ اتنے اعزازات کے ساتھ ایک شخص کا جیل کوٹھری میں رہنا برطانوی حکومت کے لیے باعث ننگ وعار، فوج کے لیے باعث شرم اور فوج میں بدلی پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ رائے بہادر سردار نرائن سنگھ ہندوستان کے کمانڈر ان چیف سر ولیم برڈ وڈ سے ملے اور ان کی خدمت میں روزنامہ "ریاست" پیش کیا۔ سر ولیم برڈ وڈ کے پاس اس کی اطلاع پہلے سے ہی تھی اور انہوں نے وائسرائے کو آگاہ کر دیا تھا اور وائسرائے نے پولیٹیکل سیکرٹری کو کہا کہ مہاراجہ پٹیالہ کو بخشیش سنگھ کی رہائی کے لیے لکھا جائے۔ مہاراجہ پٹیالہ ایک روز جیل کے دورے پر گئے اور پریڈ کے دوران انہوں نے سردار بہادر جنرل بخشیش کے ساتھ 60 اور قیدیوں کو رہا کرنے کے احکامات جاری کیے۔ اصل میں لوگوں کو یہ دکھانا مطلوب تھا کہ مہاراجہ نے دریادلی دکھاتے ہوئے ساٹھ قیدیوں کے ساتھ سردار بہادر جنرل بخشش کو بھی رہا کر دیا۔ اس واقعے سے آسانی کے ساتھ یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ جس ریاست کا والی اخلاقی گراوٹ کا پروردہ ہو وہ اپنی رعایا کے ساتھ کس طریقے سے پیش آتا ہو گا۔[94]

برطانوی استعمار کی بنیادی پالیسی یہ رہی کہ " تقسیم کرو اور حکومت کرو" اور ان تقسیم شدہ ریاستوں کے حکمران انگریز سرکار کے پروردہ رہے۔ ان کا استعمار زدہ کے ساتھ رویہ اور سلوک غلاموں جیسا رہا۔

ہندوستان میں جتنی بھی ریاستیں ہیں ان میں سے کوئی ریاست ایسی نہیں ہے جہاں پر ظلم و ستم کی داستانیں رقم نہ ہوتی ہوں۔ جھوٹ، فریب اور بے بنیاد مقدمات کی بھرمار سے سینکڑوں بے گناہ، مصائب و الام کا شکار قید و بند کی زندگیاں گزار رہے تھے۔ مہاراجہ نابھہ اپنے مخصوص عملے کے ساتھ منصوری پہاڑ پر چلے گئے وہاں پر کسی ملازم نے مہاراجہ سے باورچی ہری سنگھ کی چغلی کھائی کہ ایک چمچ اور کانٹا چوری ہو گیا ہے۔ شک ہے کہ اور کانٹا کی چوری ہری سنگھ نے کی۔ مہاراجہ اپنے اپ کو مطلق العنان سمجھتے تھے لیکن یہاں معاملہ دوسرا تھا یہ علاقہ مہاراجہ کی عملداری سے باہر تھا کیونکہ یہ انگریز علاقہ تھا یہاں پر شکایت درجہ کی جاتی اور پھر اس کے بعد تفتیش کی جاتی جو کہ مہاراجہ کی طبیعت کے خلاف تھا۔ راجہ نے انسپیکٹر جنرل پولیس سردار کاہلا سنگھ کے نام خط لکھا اور اس کو حکم دیا کہ ہری سنگھ نے سرکاری چوری کی ہے اس لیے اسے تا حکم ثانی جیل بھیج دیا جائے۔ ہری سنگھ ملفوف اہم خط لے کر ریاست نابھہ پہنچا اور اہم امانت سمجھتے ہوئے انسپیکٹر جنرل کے حوالے کیا۔ انسپیکٹر جنرل نے اسے پڑھ کر ہری سنگھ کو جیل میں ڈال دیا۔ اور یوں بغیر مقدمہ، بغیر سزا، بغیر اپیل اور بغیر کسی قانونی مشورے کے اس غریب کو مقید کر دیا گیا۔ اور یہ مظلوم کے لیے اس وقت تک قید میں رہا جب تک مہاراجہ کو معزول کر کے کسی انگریز کو ایڈمنسٹریٹر لگا دیا گیا۔[95]

برطانوی استعمار کے خلاف ہندوستان میں مختلف رد استعماری تحریکیں چلیں اور ان تحریکوں کے قائدین وقفے وقفے سے مختلف علاقوں میں عوامی اجتماعات سے خطابات کرتے رہتے تھے۔ استعمار کے خلاف ان تحریکوں کے سدباب کے لیے مقامی استعماری انتظامیہ کے بھی گاہے بگاہے سخت سے سخت انتظامات دیکھنے میں آتے رہے۔ "ہندوستان چھوڑ دو" کے حوالے سے مہاتما گاندھی عوام کو متحرک کرنے کے لیے پنجاب کے مختلف علاقوں کے دوروں پر رخت سفر تھے حالانکہ یہ تحریک ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ان کی ٹرین پلول اسٹیشن پر پہنچی۔ اس کے بعد پنجاب کا ضلع گورگانواں شروع ہوتا ہے۔ تو 30 جولائی 1942ء کو "پلول" ریلوے اسٹیشن پر مہاتما گاندھی کو گرفتار کر لیا گیا اور یہ خبر آگ کی طرح ہندوستان میں پھیل گئی۔ جس پر ہنگامے پھوٹ پڑے اور مختلف جگہوں پر جلسوں کے اعلانات کیے گئے۔ ایڈیٹر روزنامہ "ریاست" کو شاہی مسجد کے جلسہ کی اطلاع ملی اور وہ اسے رپورٹ کرنے کے لیے جلسے میں گیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا یہ عظیم اجتماع

برطانوی استعمار کے لیے آنے والے وقتوں میں پریشانی کا سبب بن سکتا تھا۔ دونوں طرف کے لیڈروں نے خوب تقریریں کیں لیکن ان میں سکھوں کی نمائندگی نہ پاکر دیوان سنگھ کو تھوڑی غیرت سی محسوس ہوئی تو ان کی نظر اچانک ماسٹر موتا سنگھ پر پڑھی۔ آپ ریاست پٹیالہ قصبہ بھسوڑ میں ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر جنگ آزادی کے سرگرم رکن تھے۔ جب انہیں تقریر کے لیے کہا گیا تو انہوں نے معذوری ظاہر کی جس پر دیوان سنگھ نے ایک مقرر کی تقریر ختم ہونے کے بعد اچانک اعلان کیا کہ سکھوں کے بزرگ لیڈر موتا سنگھ تقریر کریں گے اس اعلان کے بعد ماسٹر صاحب کو مجبوراً تقریر کے لیے اٹھنا پڑا۔ ماسٹر صاحب نے خوب تقریر کی اور پنڈال ماسٹر موتا سنگھ زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔ ماسٹر صاحب نے کہا: "ظلم کو برداشت کرنا خود ظلم کی تبلیغ کرنا ہے"[96]

ماسٹر موتا سنگھ کی تقریر نے مقامی استعمار کو خوب ملائن کیا۔ اتنے میں ایک طرف سے شور و غوغا بلند ہوا پتہ چلا کہ جالندھر چھاؤنی میں فوج میں بغاوت ہو گئی اور یہ فوجی نوجوان دس بارہ گوروں کو قتل کر کے بھاگ آیا ہے۔ لوگوں نے اسے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا اور فلک شگاف نعرے بلند ہو رہے تھے۔ کہاں گاندھی جی کی "اہنسا" اور "ستیہ گرہ" اور کہاں یہ بربریت۔ فوجی نوجوان کے آنے سے جلسہ درہم برہم ہو گیا لیکن لوگوں کا جوش دیدنی تھا۔ لوگ شہر کی طرف جانے لگے باہر دروازے پر پہنچے تو بھاری پولیس گھوڑوں پر سوار تھی اور ان کے ساتھ ایک انگریز انسپیکٹر بھی تھا اس نے اعلان کیا کہ فوری طور پر اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں ایک جگہ پر جمع نہ ہوں لیکن بہت سارے لوگ وہاں تماش بین بنے کھڑے رہے۔ جس پر پولیس افسر نے گولی چلانے کا حکم دیا۔ گولی چلی اور مزید دو لوگ موقع پر ہلاک اور تین چار زخمی ہو گئے۔ اس کے بعد چوک خالی ہو گیا۔ مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ دیوان سنگھ کے بھی ماسٹر موتا سنگھ کے تقریر کرنے کے اعلان پر وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے اور یہ بھوکا پیاسا پیدل اپنے گاؤں حافظ آباد کی طرف روانہ ہوا۔ کامونکی کے قریب مقامی لوگوں نے دیوان سنگھ کی خدمت خاطر کی اور وہ پھر رخت سفر ہوا۔ اگلا پڑاؤ قلعہ میاں سنگھ تھا وہاں پر ایک درخت کے نیچے بیٹھا تو ایک شخص اپنے گھر لے گیا خوب خاطر تواضع کی اور تانگے کی سواری مہیا کی اس دیوان سنگھ کو قلعہ دیدار سنگھ پہنچا دیا اور وہاں سے ٹانگے کے ذریعے وہ اپنی منزل حافظ آباد پہنچ گیا۔ مہمان

داری اور صلہ رحمی کی یہ مثالیں آج کے دور میں معدوم ہیں۔ محبت، خلوص، رواداری خال خال ہی نصیب ہوتی ہیں۔ بہر حال پنجاب کے گورنر سر مائیکل اوڈوائر کو رخصت ہونا پڑا انہوں نے جلیاں والا باغ کے واقعہ پر جنرل ڈائر کی حمایت کی تھی۔ ان کی جگہ پر سر ایڈورڈ میکلیگن تعینات کر دیے گئے۔ تحقیقاتی کمیٹیاں بنا دی گئیں اور جلیانوالہ باغ پر حکومت شرمندہ دکھائی دی۔ نئے گورنر کے آنے سے پکڑ دھکڑ بند کر دی گئی اور جن لوگوں کے وارنٹ گرفتاری نکل چکے تھے ان کی گرفتاری کی کوشش نہیں کی گئی اور معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔[97]

برطانوی استعمار نے اپنی طرز حکمرانی کو برقرار رکھنے اور غیر انسانی و جمہوری قوانین کی پاسداری کے لیے کسی قسم کا ظلم و ستم اور بربریت سے بھی گریز نہیں کیا۔ عوامی رائے کی پرواہ نہیں کی گئی بلکہ اسے دبانے کے لیے مختلف قوانین کا سہارا لیا گیا۔ عوامی اجتماعات و مظاہروں کو کچلنے کے لیے پولیس اور فوج کی مدد لی گئی۔ غیر انسانی سخت رویہ اپنایا گیا۔ جس سے پنجاب کے مختلف شہروں میں ایک ہیجانی کیفیت دکھائی دیتی تھی جس کے باعث سرکاری املاک، ریلوے اسٹیشنوں کو آگ لگائی جا رہی تھی اور مواصلاتی نظام کو درہم برہم کرنے کے لیے ریلوے کے تار کاٹے اور بینک لوٹے جا رہے تھے اور سرکاری اہلکاروں پر حملے ہونے شروع ہو گئے۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ برطانوی استعمار کے خلاف عوام الناس میں شدید غم و غصہ پایا جاتا تھا کیونکہ 13 اپریل 1919 کو بیساکھی کے میلے کو منانے اور رولیٹ ایکٹ کے خلاف پرامن احتجاج کے لیے امرتسر میں جلیاں والا باغ کے مقام پر جمع ہوئے۔ "رولیٹ ایکٹ" کمیٹی کے چیئرمین سر سیدنی رولیٹ کے نام پر رکھا گیا۔ یہ 1919ء میں نافذ کیا گیا اور اس قانون کے تحت حکومت کو وسیع اختیارات دے دیے گئے جس میں بغیر وارنٹ اور مقدمہ کے لیے غیر معینہ مدت تک گرفتاری، اخبارات اور رسائل پر پابندی اور بے ضبطگی کی سزا، گھر گھر تلاشی کے اختیارات اور ہر قسم کے اجتماعات پر پابندی لگائی گئی۔ دوسرے الفاظ میں کچھ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ قانونی طور پر استعمار زدہ کی آزادی کو سلب کر لیا گیا۔ جس پر بریگیڈیئر جنرل ریجنالڈ ڈائر نے جلیانوالہ باغ کے احتجاج کو ختم کرنے کے لیے نہتے ہندوستانیوں پر برطانوی فوج کو گولی چلانے کا حکم دیا۔ جس کے نتیجے میں سینکڑوں لوگ ہلاک اور ہزاروں کی تعداد میں زخمی ہوئے۔ اس واقعے نے ہندوستان میں بسنے والی تمام اقوام کے ذہنوں میں برطانوی استعمار کے خلاف نفرت پیدا کر دی۔ انہی ایام میں انگریز فوج کے لیفٹیننٹ ٹارٹنم فیصل

آباد سے وزیر آباد جارہے تھے ان کے ساتھ کچھ دوسرے فوجی افسران بھی تھے جب ان کی گاڑی حافظ آباد اسٹیشن پر پہنچی تو لوگوں نے دیکھا کہ اس میں انگریز بیٹھا ہوا ہے انہوں نے اس کو پکڑ کر اس کی خوب درگت بنائی۔ یہاں تک کہ اس کی حالت غیر ہوگئی ریلوے حکام نے جب یہ صورتحال دیکھی تو ٹرین کو وقت سے پہلے ہی روانہ کر دیا جس سے لیفٹیننٹ ٹاٹنم کی جان بچ گئی۔ اس واقعے کے بعد پنجاب میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ شناخت پریڈ کا بہانہ بنا کر ارد گرد کے تمام مرد حضرات کو قید کر لیا گیا اور منادی کرا دی گئی کہ جو شخص اس شناخت پریڈ میں شامل نہیں ہو گا اسے گولی مار دی جائے گی۔ ایک خوبصورت نوجوان طالب علم ہوشیار سنگھ جو وقوعہ کے وقت اپنے گھر میں تھا اسے بھی اس واقعے میں ملوث کر لیا گیا۔ اسی طرح کے اور بھی بے شمار بے گناہوں کو مقدمات قائم کر کے پھانسی یا عمر قید کی سزا کے لیے رسمی کاروائیاں شروع کر دی گئیں۔ ہوشیار سنگھ کے گھر والوں نے اس کی رہائی کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے اس معاملے پر بہت سارے وکلا سے گفت و شنید ہوتی رہی لیکن آخر کار وکیل رائے بہادر بدری داس کو تمام واقعات بتائے گئے تو انہوں نے عدل و انصاف کے متعلق مقامی انتظامیہ کی دوہری شخصیت کے متعلق انہیں آگاہ کیا اور کہا:

> "سردار صاحب! لڑکا گنہگار ہے یا بے گناہ یہ کوئی سوال نہیں یہ عدالتیں ہیں اور عدالتیں ہی نہیں مارشل کی عدالتیں یہاں جھوٹ اور بے ایمانی کی دوڑ ہے اگر آپ پولیس سے زیادہ جھوٹ بنا سکتے ہیں تو لڑکا چھوٹ جائے گا اور اگر آپ پولیس سے زیادہ جھوٹ نہیں بنا سکتے جو پولیس کے جھوٹ کو کاٹ سکے تو یقینا لڑکے کو سزا ہو گی اور شاید لڑکے کو پھانسی مل جائے---- جھوٹ کی دوڑ کا سوال ہے جو زیادہ جھوٹ بنا سکے گا کامیاب ہو گا آپ ہوں یا پولیس ہو۔"[98]

رائے بہادر بدری داس کی رائے سن کر فیصلہ کیا گیا کہ یہ ثابت کیا جائے کہ وقوعہ کے وقت ہوشیار سنگھ حافظ آباد میں موجود ہی نہیں تھا بلکہ وہ لدھیانہ میں تھا۔ جس کے لیے خط و کتابت میں جعلسازی کی گئی اور آخر کار ہوشیار سنگھ کے دفاع میں گواہیوں کے ساتھ کامیاب ٹھہری۔ جس پر اسے باعزت بری کر دیا گیا۔ اس کیس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پولیس کس طریقے سے جھوٹے مقدمات قائم کر کے استعمار زد کو کس طریقے سے

شکار بنا کر بڑی بڑی رقمیں لوٹتی ہے اور اگر سودا نہ طے ہو تو وہ جھوٹی گواہیاں دلوا کر بے ایمانی اور ظلم کا سہارا لے کر ان لوگوں کو تخت دار تک پہنچا دیتی ہے۔ یہ استعمار کی تربیت کا شاخسانہ ہے۔ انہوں نے جس طرح معاشرتی انصاف کو اپنے گھر کی لونڈی بنائے رکھا اور اب اس کے گماشتے مقامی استعمار کی شکل میں اسی راہ پر گامزن ہیں۔[99]

انارکزم ایک ایسا فلسفہ ہے جو استعماری حاکمیت کو چیلنج کرتا ہے۔ یہ ایک سیاسی نقطہ نظر ہے اس کے مطابق معاشرتی معاملات کو حکومت یا ریاست کے بغیر بھی حل کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے معاشرتی سطح پر رضا کارانہ اور آزادانہ بنیادوں پر ایسی تنظیمیں یا ادارے تشکیل دیئے جانے چاہییں جو اپنی منشا و مرضی کے مطابق اپنی توانائیوں کو بہتر انداز سے بروئے کار لا سکیں۔ اس صورتحال میں کسی بھی کنٹرولنگ اتھارٹی کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس فلسفے کے محرک شخصی آزادی، برابری، رواداری اور خود انحصاری جیسے عوامل شامل ہیں۔ انارکسٹ ایسے شخص کو کہتے ہیں جو اس فلسفے کا حامی اور ناصر ہو۔ یہ فلسفہ یورپ میں 19 ویں صدی کے صنعتی انقلاب کے ساتھ پروان چڑھا جب معاشرتی سطح پر حکومتی اور استحصالی نظام نے جنم لیا تو تب سماجی و معاشی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ عوام الناس کی مایوسیوں نے انہیں اس میدان میں لا کھڑا کیا اور انہوں نے مختلف تحریکوں میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ ہندوستان کے تناظر میں بھگت سنگھ تحریک نے ان جزئیات کو سمیٹا۔ وہ ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن اسوسی ایشن کے ایک سرگرم اور انقلابی رکن تھے انہوں نے استعمار کے خلاف متعدد مسلح کاروائیوں میں حصہ لیا۔ انہوں نے 1920ء سے 1930ء تک کے عشرے کے دوران برطانوی استعمار کو تگنی کا ناچ نچایا۔ 1929ء میں اسمبلی ہال میں بم پھینکا جس سے کوئی جانی نقصان نہ ہوا لیکن اسے گرفتار کر کے 1931ء میں پھانسی دے دی گئی۔ لیکن برطانوی استعمار کے خلاف بھگت سنگھ کی کوششیں بھگت سنگھ تحریک کا سرنامہ بنیں۔ پنجاب کے کالجوں کے طلباء کے اندر اس تحریک نے انارکزم پیدا کر دیا۔ بڑی تیزی کے ساتھ جوق در جوق لوگ اس میں شامل ہونے لگے لیکن مہاتما گاندھی اس تحریک کے آڑے آئے انہوں نے اپنے فلسفہ "اہنسا" اور "ستیہ گرہ" کو بڑھاوا دیا اور جرآت کرتے ہوئے اعلانیہ طور پر تشدد آمیز کاروائیوں کی بھرپور مذمت کی تاکہ معاشرے کو خلفشار سے بچایا جا سکے اگر گاندھی جی اس کے سدراہ نہ ہوتے تو قتل و غارت گری

بڑھ جاتی جس سے زیادہ سے زیادہ لوگوں پر مقدمات قائم کیے جاتے پھر گرفتاریاں ہوتیں اور لوگوں کو قید و بند کی مشکلات سے گزرنا پڑتا اور بالآخر نوبت پھانسیوں تک پہنچ جاتی۔[100]

پنجاب کے لوگوں کے دوہرے شعور بارے اکثر کہا جاتا ہے کہ یہ فطرتاً سازش کے اہل نہیں ہیں کیونکہ یہ لوگ جتنی جلدی سازش میں شامل ہوتے ہیں اتنی ہی جلدی اس سے نکلنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں اور جس کا نتیجہ مخبر یا سرکاری گواہ بننے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے پنجاب میں کبھی بھی کوئی سازش کامیاب نہ ہو سکی وہ پہلے ہی پکڑی گئی اور ناکام ہو گئی۔ جب کہ بنگال میں کوئی بھی سازش منکشف نہیں ہوئی اور وہ کامیاب رہی۔ اگر کوئی انارکسٹ پکڑا گیا تو اس نے بجائے وعدہ معاف گواہ بننے کے یا سازشی منصوبہ سازی کو عیاں کرنے سے پہلے ہی زہر کھا کر خودکشی کر لی۔ جس سے وہ منصوبہ راز میں رہا۔ انتظامیہ یا سی آئی ڈی کے سامنے نہ آ سکا۔ وائسرائے لارڈ ارون 1926ء سے 1931ء تک ہندوستان کے وائسرائے رہے۔ لارڈ ارون کے دور کے اقدامات اور پالیسیاں متنازع رہیں۔ اسی دور میں نہرو رپورٹ، قائداعظم کے 14 نکات، سائمن کمیشن، گاندھی ارون پیکٹ، سول نافرمانی کی تحریک اور پہلی گول میز کانفرنس شامل ہیں۔ جب 1928ء میں سائمن کمیشن بنایا گیا تو اس میں اس کمیشن میں کوئی ہندوستانی رکن شامل نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے بھرپور طریقے سے غم و غصے کا اظہار کیا گیا حالانکہ اس سے پہلے نہرو رپورٹ میں ایک آئینی فریم ورک تجویز کیا گیا تھا لیکن برطانوی استعمار نے اسے فالو نہیں کیا۔ جس پر حالات مشکل سے مشکل ہوتے چلے گئے۔ پنجاب کے کچھ نوجوان طالب علموں نے افراتفری پیدا کرنے کے لیے 1929ء کو لاہور کے قریب وائسرائے لارڈ ارون کی ٹرین کے نیچے بم نصب کر دیا گو کہ یہ بم دھماکہ ناکام رہا اور وائسرائے بچ گئے۔ اس واقعے سے طلباء میں رد استعماری جذبات اور قربانی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اپنی زندگیوں اور مستقبل کی پرواہ کیے بغیر یہ ناتجربہ کار بغیر کسی رہنما کے کالجوں کے نوجوان طالب علم اور نہ ہی ان کے پاس زادِ راہ کے لیے کوئی رقم تھی۔ یہ نوجوان نتائج سے بے پرواہ لیکن حوصلے اور جذبات اتنے بلند تھے کہ وہ لوگ دہلی میں آئے اور برطانوی استعمار کے خلاف اتنی بڑی منصوبہ سازی کی اور پھر اس پر عمل درآمد بھی کیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور بڑے پیمانے پر پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ محکمہ پولیس کی غیر قانونی گرفتاریاں اور مقدمات کی بھرمار نے معاشرتی سطح پر

ایک انارکی پیدا کی ہوئی تھی اور پھر جھوٹے گواہ بھی پیدا کیے جاتے تاکہ کوئی بھی بے گناہ بچ نہ پائے۔ مسلح جدوجہد میں ببر اکالی تحریک اور آزاد ہند فوج کا نام بھی قابل ذکر تھا جس نے اپنی مسلح جدوجہد سے برطانوی استعمار کے لیے مشکلات پیدا کیں۔ لیکن ان کاروائیوں کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ بعد میں آنے والے وقتوں میں ان لوگوں نے ایک دوسرے کے گلے کاٹنے شروع کر دیے اور لوٹنا شروع کر دیا اور حکومتی سطح پر ان سے آہنی ہاتھوں سے نپٹا گیا۔ اگر تمام رہنما عدم تشدد کے فلسفے پر عمل پیرا ہوتے تو نتائج اس سے کہیں زیادہ مختلف ہوتے۔[101]

برطانوی استعمار کی طرز حکمرانی کی وجہ سے استعمار زدہ میں بداعتمادی اور تشدد کا عنصر غالب رہا اور یہ مختلف فسادات اور بدانتظامی کی شکل میں نظر آیا۔ ہندوستان میں وقت کے ساتھ استعمار زدہ کے ذہن میں خوف اور لالچ کی جڑیں مزید گہری ہوتی چلی گئی اور فسادات کے درمیان بے لگام ٹھہریں۔ جس نے انسانی مصائب میں اضافہ کیا۔ اس طرح پنجاب کے مذہبی فسادات کا ناسور دہلی تک آ پہنچا جس سے لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ جن محلوں میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی وہاں سے مسلمانوں کو دوسرے مسلمان محلوں میں بھیجا جا رہا تھا تاکہ ان کی زندگیاں محفوظ رہیں۔ اور وہ ہندوؤں کے بلووں سے محفوظ رہیں۔ اسی طرح جن محلوں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی وہاں سے ہندوؤں کو دوسرے محلوں میں بھیجا جاتا تھا جہاں ہندو اکثریت میں تھے تاکہ انہیں بھی کوئی تکلیف نہ پہنچے اور وہ محفوظ رہیں۔ طمع، لالچ، حرص اور بے راہ روی کے بخار نے ہندوستانی تہذیبی شعور کو تہہ و بالا کر دیا کیونکہ مقامی انتظامیہ استعمار کی تربیت یافتہ تھی وہ بھی اپنے فائدے کے لیے خاموش تماشائی بنی رہی اور دکھاوے کی کارروائیوں میں مشغول رہی۔ ان لوگوں کی نقل و حمل کی رہنمائی بھی مقامی پولیس کر رہی تھی۔ تاکہ کچھ عرصہ بعد جب فرقہ پرستی کا بخار اترے گا تو دوبارہ انہیں اپنے اپنے علاقوں میں واپس بھیج دیا جائے گا۔ گلی محلوں میں لوٹ مار جاری تھی گھروں کے تالے توڑ کر سامان اور دیگر اشیاء لوگ لے کر جا رہے تھے اور شہر میں دکانوں کی لوٹنے کی وارداتیں ہو رہی تھی اور کئی جگہوں پر آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ دیوان سنگھ اپنے دفتر روزنامہ "ریاست" میں بیٹھے کام کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں ایک بچہ بھاگا آیا اس نے انہیں اطلاع دی کہ گلی میں جو مسجد ہے اس کا تالا توڑ لیا گیا ہے اور لوگ

سامان لے کے جارہے ہیں. دیوان سنگھ نے اس واقعہ کو اہمیت اس لیے نہیں دی کہ چھوٹی سی مسجد ہے اس میں کیالوٹ کر لے جائیں گے لیکن اس کے بعد ایک اور بچہ آیا اس نے کہا کہ کچھ لوگ مسجد کو گرا رہے ہیں۔ جب اس نے یہ بات سنی تو اس کا غصہ آگیا دم بخود ہو گیا جب اس نے جا کر دیکھا تو پانچ چھ لوگ مسجد کے مینار گرا رہے تھے مسجد کا کچھ سامان تو لوگ لے گئے تھے لیکن کچھ سامان ابھی لے جانے کے لئے باہر دروازے پر رکھا ہوا تھا اور جس کو لے جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دیوان سنگھ نے غصے کے مارے ان لوگوں کو سخت سست کہا اور ڈرانے کی کوشش کی کہ اگر مسلمانوں کو مسجد گرانے کا پتہ چل گیا وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے اور تمہارے گھروں کو آگ لگا دیں گے اللہ کے عذاب سے بچو۔ تمہیں رحم نہیں تم بے رحم اور بے حس ہو چکے ہو۔ لوگوں نے جب یہ تقریر سنی تو اس کے بعد وہ لوگ اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ ایک اور خاندان جو پنجاب سے تباہ حالی سے آیا تھا۔ انہوں نے یہ سب باتیں سنی تو انہوں نے مخاطب ہو کر کہا: "یہاں آپ مسجد نہیں گرانے دیتے آپ کے گردوارے مسلمانوں نے پنجاب میں گرا دیے"[102]

دیوان سنگھ کی دلیلوں کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا ایسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ بھی پنجاب سے تباہ حالی کی حالت میں یہاں پہنچے اور وہ پنجاب کی تباہ حالی کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے ہیں۔ اس لیے ان کا دماغی توازن بھی بگڑا ہوا تھا۔ ڈانٹ ڈپٹ کا یہ نتیجہ ہوا کہ کسی کو حوصلہ نہ ہوا کہ وہ مسجد کو گرائے بہر حال ان کے دل میں نصیحت کا ملال ضرور تھا۔ اسی گلی میں جب مسلمان رہتے تھے تو ایک فقیر جمعرات کو مانگنے کے لیے آتا تھا لیکن اب کیونکہ مسلمان یہاں سے گھر خالی کر کے جا چکے تھے تو وہ کہیں صبح بڑی سریلی آواز میں آیا تو پتہ چلا کہ گلی کے باہر ابھی پہنچا بھی نہیں تھا تو کسی نے چھرے سے اس کو ہلاک کر دیا۔ اسی طرح ایک نابینا مسلمان جو ساتھ والی کوچہ قطبی گلی میں رہتا تھا محفوظ جگہ منتقلی کے لئے کانسٹیبل اس کو لینے کے لیے آئے تاکہ وہ مسلمانوں کے محلے میں چلا جائے یہ آنکھوں سے اندھا بوڑھا اور قریب قریب مفلوج تھا۔ جو کئی برس ایک ہی کوٹھی میں پڑا رہتا۔ اڑوس پڑوس اس کو کھانا دیتے اس کا خیال رکھتے تھے۔ اس غریب کا کون دشمن ہو سکتا تھا لیکن ایک روز اس کی بھی لاش نظر آئی۔ ایسے حالات دیکھ کر انسانیت بھی ماتم کناں نظر آئی۔ اس بے دردی نے انسانی قدروں کو رسوا کیا۔ اسی طرح جب ایک مکان لٹ رہا تھا کہ قریبی تھانہ میں اطلاع دی گئی تاکہ اسے بچایا جائے۔ انسپیکٹر

صاحب کو بلایا گیا۔ وہ تفتیش کے لیے ادھر ادھر پھرتے رہے آخر کار تفتیش مکمل کر کے اطلاع دینے والے کو بھی ساتھ تھانے لے گئے تو وہاں تھانے دار صاحب نے اس آدمی سے کہا:

"حرام زادے ہندو ہوتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی کہ تم ہندوؤں کے خلاف رپورٹ کر رہے ہو۔ پنجاب میں ہندوؤں کے ساتھ کیا ہوا اگر یہاں ہندوؤں نے مسلمانوں کو لوٹ لیا ہے تو کیا جرم ہے"[103]

دیوان سنگھ نے ان کو نصیحت کی کہ لوٹنا کانگرس اور مہاتما گاندھی کی تعلیمات اور اس کی بزرگی کے خلاف ہے یہ مہاتما گاندھی کہ نظریہ "اہنسا" اور "ستیہ گرہ" کے خلاف ہے لیکن اب ان کے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے ایسے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے یہ لوگ نا گاندھی کو جانتے ہیں نہ کانگرس کو اور شرافت بھی ان کے پاس سے نہیں گزری. یہ لوگ ایسے دکھائی دیتے تھے جیسے مادر پدر آزاد ہوں اور وہ اس صورتحال کو ثواب سمجھتے، قتل و غارت گری، خونریزی ان کا مذہب بن چکی تھی۔ یہ ایسی راہ پر نکل چکے تھے جہاں انہیں مالی فائدہ نظر آتا تھا۔ اور اگلے روز دیکھا گیا کہ گھروں کے دروازے ٹوٹ رہے ہیں۔ ہندو ٹولیوں کی شکل میں سامان لوٹ رہے تھے۔ لوہے کی الماریاں اور تجوریاں ہتھوڑوں کی زد میں تھیں۔ پولیس کے سپاہی بندوقیں کندوں پر رکھے گلی کے چکر پر چکر لگا رہے تھے اور ایسے محسوس ہوتا تھا کہ یہ گھروں کی نہیں بلکہ لوٹنے والوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔ دیوان سنگھ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک انسپیکٹر ایک گھر سے انتہائی قیمتی پلنگ نکلوا کر اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔

انسان اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور بعد میں حالات کے مطابق اپنے ذہنی صلاحیتوں، دنیاوی علوم اور گردونواح کے ماحول کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ فلسفہ فطرت انسان کو متوازن زندگی گزارنے کی طرف راغب کرتا ہے لیکن بعض اوقات اجتماعیت، جذباتیت یا مذہبی وابستگی کے پیش نظر وہ معاشرتی بندھنوں میں ایسا الجھ جاتا ہے کہ اپنی شناخت تک بھول جاتا ہے لیکن اس کے لاشعور میں فطری جبلت موجود ہوتی ہے جو اسے کسی بھی وقت دوبارہ پلٹ سکتی ہے۔ استعمار نے معاشرتی سطح پر استعمار زدہ کی ذہن سازی اس انداز سے کرتا ہے کہ وہ اسے اپنا فائدہ تصور کرتے ہوئے ہر جائز و ناجائز کر سکتا ہے حالانکہ وہ انسانیت کی

تذلیل کے زمرے میں آتا ہے۔ماسٹر ناہر سنگھ کے ساتھ معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ دیوان سنگھ کے استاد ماسٹر ناہر سنگھ موضع جنگ پورہ ضلع انبالہ میں رہا کرتے تھے وہ انہیں ملنے کے لیے دہلی آیا کرتے تھے۔ اس بار ملنے کے لیے آئے تو 1947ء کے فسادات شروع ہو گئے کچھ دن رہنے کے بعد جب وہ واپس جانے لگے تو دیوان سنگھ نے انہیں مزید رکنے کے لئے کہا اور انہیں بتایا کہ فسادات ختم ہو جائیں تو آپ چلے جائیں۔ ماسٹر صاحب نے جواب دیا کہ اکالیوں نے انہیں بلاوا بھیجا ہے کہ وہ فوری واپس آ جائیں اور نیک کام میں شریک ہوں۔ وہ گاوں کے مسلمانوں کو ختم کر رہے ہیں اور قریبی دھات میں بھی جانے کا پروگرام ہے۔ دیوان سنگھ نے جب یہ پتہ چلا تو وہ انتہائی پریشان کہ یہ کیسی وبا ہے جو رکنے کا نام نہیں لیتی۔ یہ سکھ ازم جو انسان دوستی اور فلاح کا داعی ہے جبکہ یہ سب کارروائیاں خلاف مذہب اور انسانیت ہیں۔ وہ کون سا محرک ہے جو انہیں اس قبیح گناہ کی طرف اکسا رہا ہے یہ کیسی عجیب منطق تھی۔ جب ماسٹر ناہر سنگھ گاؤں پہنچے تو ان کے اندر بھی جوش پیدا ہوا کیونکہ مسلمانوں کا قتل عام جاری و ساری تھا۔ سکھوں کی تلواریں اور خنجر خون ناحق سے آلودہ تھے یہاں کہیں بھی انہیں مسلمان نظر آتا اس کو تہہ تیغ کر دیتے۔ ایک دن ماسٹر ناہر سنگھ صبح ضروری حاجت سے فارغ ہونے کے لیے اپنے گاؤں سے باہر کھیتوں میں گئے تو وہاں ایک چھوٹی سی نہر بہہ رہی تھی اور اس میں تقریباً چار فٹ اونچائی کے قریب پانی رواں دواں تھا اچانک ان کی نظر ایک سر پر پڑی۔ ابھی تک سورج بھی نہیں نکلا تھا لیکن ماسٹر صاحب پریشان ہو گئے کہ اس وقت وہ کون سا شخص ہے جو سر نکالے کھڑا ہے۔ ماسٹر صاحب نے زور سے آواز دی اور پوچھا کہ تم کون ہو تو آواز آئی کہ ماسٹر صاحب میں آپ کا شاگرد ہوں کیونکہ مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا میں اس لیے یہاں چھپنے کے لیے آ گیا ماسٹر صاحب نے جب اس کی حالت دیکھی تو پریشان ہوئے وہ ڈر اور خوف سے شدید لرزاں تھا۔ اس نے ماسٹر صاحب کو بتایا کہ تمام ہمارے گاوں کے تمام مسلمانوں کو مار دیا گیا ہے اور میں نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے نہر میں چھپا لیا۔ وہ صرف سانس لینے کے لئے اپنا سر پانی سے نکالتا تھا۔۔ ماسٹر صاحب میری آپ سے درخواست ہے کہ مجھے مارا نہ جائے۔ جب ماسٹر صاحب نے اس کی یہ حالت دیکھی تو ان کے ذہن میں انقلاب کی ٹیسیں اٹھنے لگی۔ ان کی فطری جبلت جاگ اٹھی جس پر وہ بچے کو اپنے گھر لے گئے اور کپڑے پہنائے۔ جب اس واقعے کا لوگوں کو پتہ چلا تو ان کے اندر ماسٹر صاحب کے خلاف غم و غصہ پیدا

ہوا کہ ماسٹر صاحب نے مسلمان لڑکے کی کیوں حفاظت کی۔ ماسٹر صاحب بہت بہادر اور نڈر تھے اور آپ نے کئی بار ڈاکوؤں اور چوروں کا مقابلہ اکیلے بڑی بہادری سے کیا۔ وہ ڈرنے اور گھبرانے والے نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی کرپان کو لہرا کر لوگوں کو بتایا اگر یہ بچہ قتل ہو گیا تو میں گاؤں کے کسی شخص کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ماسٹر ناہر سنگھ کی یہ للکار سن کو لوگ حیران ہوئے اور خاموشی سے چلے گئے اور اگلے دن ماسٹر صاحب نے بچے کو ساتھ لیا اور ساتھ والا گاؤں جو کہ کافی فاصلے پر تھا وہاں مسلمانوں کے لیے ایک کیمپ تھا جہاں مسلمانوں کو حفاظت کے ساتھ جاتا اور ان کی ضروریات زندگی کا خیال رکھا جاتا تھا۔ ماسٹر صاحب جب اس کیمپ میں پہنچے تو وہاں جب انہوں نے مسلمانوں کی حالات زار دیکھی تو وہ بہت افسردہ ہوئے کیونکہ وہاں کے لوگوں کے عزیز و اقارب کو قتل کر دیا گیا تھا ان کے پاس کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں تھا اور عورتیں اور بچے غم سے نڈھال تھے یہ ایک قیامت صغری کا منظر تھا۔ ماسٹر ناہر سنگھ اسے دیکھ نہ سکے اور ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور ماسٹر ناہر سنگھ پر فطری جذبہ غالب آیا۔ تو انہوں نے اپنے آپ سے فیصلہ کی کہ وہ ان بے سہارا مسلمانوں کی مدد کریں گے اور ان کی زندگیوں کو بچائیں گے اور وہ کیمپ پہ لا کر ان کی خدمت کریں گے۔ ماسٹر صاحب نے تقریباً دو ہزار کے قریب بے کس و غریب مسلمانوں کی جان بچائی اور انہیں کیمپوں تک پہنچایا۔ یہ مسلمان جب پاکستان کو روانہ ہوئے تو ماسٹر ناہر سنگھ کے گلے لگ کر شکریہ ادا کرتے رہے اور زار و قطار روتے رہے تھے۔ ایک ضعیف العمر عورت کے آنکھوں سے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ اس نے ماسٹر صاحب کی پیشانی چومی اور کہا:

"بیٹا تم اگر نہ ہوتے تو آج ہم اس دنیا میں زندہ نہ بچ سکتے"[104]

ماحول انسانی زندگی پر ہمہ گیر اثرات رکھتا ہے اور یہ اثرات انسانی ذہنوں پر مرتب ہو کر سیاسی سماجی اور مذہبی محرکات و اثرات کا باعث بنتے ہیں۔ اگر یہ اثرات و محرکات مثبت ہوں تو تبدیلی خوش آئند اور اچھی ہو گی۔ اگر یہ تبدیلی منفی ہو تو یہ معاشرتی بگاڑ کا سبب بنتی ہے۔ برطانوی استعمار کے ساتھ کام کرنے والے اہل کاروں کے رویے اور سلوک بھی ناگفتہ بہ رہا۔ اس کی بنیادی وجہ وہ تربیت تھی جو انہوں نے سالہا سال سے استعمار سے حاصل کی اور پھر اس کے چلے جانے کے بعد بھی اس کا اظہار دیکھنے میں آیا۔ اس سے متصل مکافات عمل کا فلسفہ بھی ایک عالمی تصور ہے اس کا آسان مطلب نیوٹن کا تیسرا قانون کے مطابق ہے کہ ہر عمل کا رد

عمل ہوتا ہے۔ ہندوازم اور سکھ ازم کے لیے لفظ "کرما" استعمال کیا جاتا ہے. اس کا مفہوم بھی مکافات عمل سے ملتا جلتا ہے یعنی انسان کی اچھی یا بری گزاری گئی زندگی کا اثر موجودہ یا آئندہ آنے والی زندگی پر ضرور ہو گا۔ اس کا اخلاقی پہلو بھی اچھائی کی ترغیب دیتا ہے کیونکہ ہر عمل کا بدلہ ملتا ہے اور استعماری دور کی ایک مثال سے مربوط ہے کہ لالہ رام دتہ مل کا نام جیل میں ڈسپلن کے حوالے سے کافی مشہور ہوا کیونکہ اُنہوں نے جیل کے قیدیوں پر جو مظالم کیے اس کی مثال ڈھونڈنا قدر مشکل تھا۔ انہوں نے عادی مجرموں کے لیے چھ فٹ چوڑے اور پانچ فٹ اونچے پنجرے بنوا کر پارک میں لائن میں رکھے ہوئے تھے اور جو ایک ہی زنجیر سے مقفل ہوتے تھے۔ پنجرے کے اندر پانی پینے کے لیے ایک برتن رکھا گیا تھا اور بول وبراز کے لیے بھی ایک برتن تھا۔ رات کو مجرموں کو اس میں بند کر دیا جاتا اور اگلی صبح کو کھولا جاتا۔ اسی طرح جیل کی چار دیواری کی سیکیورٹی کے لیے جو پہرہ دیا جاتا وہ بھی رام دتہ مل کی ایجاد تھا۔ اگر کوئی قیدی شرارت کرتا تو ان کے حکم سے روٹی پکانے والے تندور میں پھینک دیا جاتا اور سرکاری کاغذوں پر لکھ دیا جاتا کہ اتفاق سے گر گیا تھا۔[105] "وہ تشدد جو نوآبادیاتی دنیا کی تنظیم کو برقرار رکھتا ہے وہ مقامی معاشرتی سانچوں کی تباہی کے آہنگ کو مسلسل قائم رکھتا ہے۔"[106]

گورنمنٹ نے ڈپٹی سپرٹینڈنٹ جیل کے عہدہ کے لیے براہ راست بھرتی کا اعلان کیا۔ تاکہ پڑھے لکھے نوجوانوں کا انتخاب کیا جاسکے اس سے پہلے سلیکشن بورڈ میں جو نوجوان بھرتی ہو کر آئے ان میں لالہ رام دتا مل کا بیٹا چمن لال بھی بھرتی ہوا۔ قد سات فٹ، جسامت وزنی، موٹے موٹے ہونٹ کان اور جسم کے دوسرے اعضاء بھی عام انسانوں سے موٹے اور شکل ہیبت ناک تھی۔ ان کو دیکھ کر قیدیوں کے جسم میں سرسراہٹ سی محسوس ہوتی جبکہ رعب و دبدبہ دیدنی تھا۔ ان کی تعیناتی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل کی حیثیت سے اولڈ سینٹرل جیل ملتان میں ہوئی۔ سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر میجر شاہ جو پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر اور مذہبی اعتبار سے قادیانی تھے۔ چمن لال کو ابھی تھوڑا عرصہ ڈپٹی سپرٹینڈنٹ بنے ہوا تھا تو کانگرس نے نافرمانی کی تحریک شروع کی جس کی وجہ سے سینکڑوں کارکنان کو گرفتار کیا گیا اور ملتان سینٹرل جیل بھیج دیا گیا سردی کا موسم تھا اور سردی اپنی جوبن پر تھی قیدیوں کو اوڑھنے کے لیے ایک رضائی دی جاتی جو وزن میں کم تو تھی ہی لیکن لمبائی چوڑائی بھی کم تھی۔ سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر میجر شاہ قیدیوں کو دیکھنے کے لیے جیل گئے اور ایک کانگریسی قیدی نے سپرٹینڈنٹ سے شکایت

کی کہ اس کی رضائی میں روئی کم ہے اور لمبائی چوڑائی بھی کم ہے جس پر چمن لال نے رد عمل دکھاتے ہوئے اسے جھوٹا قرار دیا لیکن سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر میجر حبیب اللہ شاہ نے حکم دیا کہ اس کی رضائی بدل دی جائے۔ مسٹر چمن لال کو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ جیل میں سکھ قیدیوں کی دو پارٹیوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا جس پر چمن لال نے ڈسپلنری ایکشن لیتے ہوئے حکم دیا کہ دونوں پارٹیوں کے سرکردہ لیڈروں کو لاٹھیوں سے زدوکوب کیا جائے اور پھر انہیں الگ الگ کوٹھیوں میں بند کر دیا جائے اور رات کو اوڑھنے کے لیے کوئی کپڑا بھی نہ دیا جائے۔ اگلی صبح ان میں سے ایک قیدی نمونیا کی وجہ سے مر گیا جب اس کا پوسٹ مارٹم کیا گیا تو اس کے جسم پر چوٹوں کے نشان پائے گئے جس کی تحقیقات کے لیے انسپیکٹر جنرل پہنچ گئے اور مزید تفتیش کے لیے معاملہ پولیس کے سپرد کر دیا گیا۔ مارنے والے پولیس ملازمین کے ساتھ مسٹر چمن لال کو زیر دفعہ 225 تعزیرات ہند گرفتار کر کے مقدمہ چلایا گیا مجسٹریٹ نے دو سال قید سخت کی سزا سنائی۔ سیشن کورٹ میں اپیل کی تو سیشن جج نے یہ سزا چھ ماہ کر دی۔ اس کے خلاف مسٹر چمن لال نے ہائی کورٹ میں اپیل کی تو یہ مقدمہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر ڈکلس کے سامنے پیش ہوا۔ سر ڈگلس نے جب مثل میں تمام واقعات پڑھے تو انہوں نے چمن لال کو قصوروار سمجھا اور محسوس کیا کہ مقتول کے ساتھ جیل میں ظلم ہوا ہے تو انہوں نے قانون میں زیادہ سے زیادہ سزا پانچ سال تھی وہ ان کو سنا دی گئی۔ مسٹر چمن لال سزا پانے کے بعد سینٹرل جیل لاہور تشریف لائے اس وقت سینٹرل جیل لاہور کے سپرنٹنڈنٹ وہی ڈاکٹر میجر شاہ تھے اور قیدی مسٹر چمن لال تھا۔ سردیوں کا موسم تھا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل میں میجر شاہ قیدیوں کو دیکھنے کے لیے آئے تو مسٹر چمن لال نے میجر شاہ سے درخواست کی کہ سردی بہت زیادہ ہے میرا قد لمبا ہے اس لیے مجھے زیادہ روئی والی اور لمبی رضائی جو ہے وہ دی جائے رات کو سردی محسوس ہوتی ہے میجر شاہ کو ملتان کے کانگریسی قیدی کی رضائے کا واقعہ یاد آ گیا آپ نے فوراً جواب دیا کہ مسٹر چمن لال تمہیں یاد ہے کہ ملتان اور سینٹرل جیل میں کانگریسی قیدی نے رضائی کے متعلق سوال کیا تھا اور آپ نے کیا کہا تھا کہ یہ قیدی بدمعاش ہے اور جھوٹ بولتا ہے۔ اب تمہاری درخواست پر کہتا ہوں کہ تم بھی بدمعاش ہو اور جھوٹ بولتے ہو یہ کہہ کر وہ آگے کی طرف چلے گئے۔[107]

مقامی استعمار کے ظلم و بربریت کے خلاف آواز بلند کرنا اور خصوصیت کے ساتھ ریاستی استبداد کے سامنے حق گوئی یا مظلومین کا ساتھ دیتے ہوئے ان کی گزارشات و شکایات کو اپنے اخبار میں جگہ دینا جان جوکھوں کا کام تھا حقیقی صحافی مشکلات کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ وہ خطرات کا سامنا کرتے ہیں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے اس کی ادائیگی میں سرگرم عمل رہتے ہیں اور ان حقائق کو تسلیم کرتے ہیں لیکن کسی قسم کی سودا بازی نہیں کرتے بلکہ حریت کی راہ پر چلنے والے راستے کی ابتلاء و آزمائش کی پرواہ کیے بغیر اپنے مقصد کے حصول کے لیے گامزن رہتے ہیں اور اصلاح احوال کے لیے ان کی خدمات کو انتہائی قدر کے نگاہ سے دیکھا جاتا ہے لیکن بعض اخبارات روپے پیسے کے چکر میں ضمیر فروشی کرتے ہیں اور سنسنی خیزی پیدا کرتے ہیں جس سے وہ مشکلات میں پڑ جاتے ہیں۔ جیسے روزنامہ "ریاست" کو جاری ہوئے ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ دہلی سے ایک اور اخبار "الخلیل" کے نام سے جاری ہوا۔ اس نے بھی والیان ریاست اور ریاستی اہلکاروں کے خلاف لکھنا شروع کر دیا لیکن اس کی زبان پست اور عامیانہ تھی اور اس نے اپنے اخبار میں سنسنی پیدا کرنے کے لیے بھوپال کے ایک انجینئر کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں رشوت کے الزامات کے ساتھ غلیظ الزامات بھی لگائے اور پھر پروپگینڈے کے طور پر ان پرچوں کو مختلف لوگوں کے پتہ پر بھوپال بھیجے گئے۔ جب ان پرچوں کو نوجوان ملزمان لڑکوں نے دیکھا تو انہیں انتہائی غصہ آیا اور وہ اسی غصے میں کسی کو بھی اطلاع دیے بغیر اخبار کے دفتر میں پہنچ گئے اور ایڈیٹر پر قاتلانہ حملہ کیا جس سے شور شرابہ پیدا ہوا اور ایڈیٹر معمولی سے زخمی بھی ہوئے لیکن شور ہونے پر گرفتاری سے بچنے کے لیے وہ تمام لڑکے بھاگ نکلے لیکن ان میں سے ایک اُردو بازار میں پکڑا گیا۔ اس کی گرفتاری کے بعد مقدمہ پولیس کے ہاتھ میں آگیا۔ دوسرے نوجوان بھی گرفتار ہو گئے۔ شہر میں بہت زیادہ سنسنی پھیل گئی کہ بھوپال کے لڑکوں نے ایک اخبار دہلی کے ایڈیٹر پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ اخبارات میں ہیجان آمیز مضامین کا سلسلہ شروع ہو گیا اس کے بعد نواب آف بھوپال پر بھی الزامات کی بارش ہونی شروع ہو گئی جس پر پریس رپورٹر اور پبلک معاملات میں دلچسپی لینے والوں کی دلچسپی اور بڑھ گئی اور یہ مقدمہ آنریری مجسٹریٹ لالہ سنت رام ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی عدالت میں پیش ہوا ان کو دفعہ 30 کے سپیشل اختیارات حاصل تھے یعنی یہ سات برس تک سزا دے سکتے تھے۔ جب مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو لڑکوں کے ورثاء نے

اس کی پیروی کرنی شروع کر دی اور انہوں نے ایڈیٹر "الخلیل" کو دو ہزار روپیہ دے دیا اور دوسرے گواہان کو بھی اپنے حمایت میں لے لیا جب ایڈیٹر کا بیان لیا گیا تو انہوں نے عدالت کے سامنے ان طلبہ کو پہچاننے سے انکار کر دیا کہ یہ نہیں تھے۔ ان کے علاوہ کوئی اور تھے۔ شہادتوں کے بعد یہ معاملہ کچھ عرصہ چلا اور پھر مقدمہ ختم ہو گیا۔[108] مقدمے کے فیصلے کے بعد ایڈیٹر صاحب اپنے وطن یوپی چلے گئے اور بھوپال کے روپے سے کوئی کاروبار وغیرہ شروع کر دیا لیکن بھوپال کے لوگ فاتح کی حیثیت سے واپس گئے تو روزنامہ "ریاست" نے انجینیئر صاحب سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا:

> "دنیا میں ہر شخص کے ضمیر کی قیمت مقرر ہے اور وہ اس قیمت پر خرید لیا جا سکتا ہے. ان ایڈیٹر صاحب کی ضمیر کی قیمت 2 ہزار روپے تھی یہ روپیہ ادا کر کے ہم نے ان کو خرید لیا اور لڑکے بری ہو گئے خدا کا شکر ہے کہ ایڈیٹر صاحب صرف زخمی ہوئے تھے اگر قتل ہو جاتے تو ہزار کی جگہ شاید ہم نے دس بیس یا 50 ہزار روپیہ صرف کرنے پڑتے."[109]

ہجرت کی فلاسفی انسانی بقا، معاشی ضرورت، ذہنی اور روحانی آسودگی، مذہبی آزادی حقیقت جیسے عوامل سے عبارت ہے۔ اس کے اثرات انفرادی سطح پر تو محسوس کیے ہی جا سکتے ہیں بلکہ اجتماعی طور پر معاشی، ثقافتی اور سماجی میدانوں میں گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ برطانوی استعماری حکومت کے خاتمہ کے اثرات، پاکستان اور بھارت کے قیام کی وجوہات، معاشرتی سطح پر سیاسی، سماجی اور مذہبی محرکات و اثرات نے اس ہجرت کو اتنا مکدر کر دیا کہ اگر اس کا تذکرہ زباں پہ آ جائے تو آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ وہ خونچکاں واقعات، دلگیر سانحات اور جزباتی مناظر سے لکھی ہوئی ہے۔ یہ اپنے جلو میں کئی پہلو اور واقعات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ دیوان سنگھ لکھتے ہیں کہ 1947ء میں روزنامہ "ریاست" کے دفتر میں رن سنگھ انتہائی محنتی، شریف اور دیانتدار ملازم تھا۔ ملکی حالات فسادات کی طرف بڑھ رہے تھے اور حالات دن بدن خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔ ایک روز دیوان سنگھ نے محسوس کیا کہ رن سنگھ کچھ بدلہ بدلہ اور پریشان نظر آ رہا ہے۔ اس نے ازراہ ہمدردی اس سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ تم دل لگا کر کام نہیں کر رہے ہو تو اس کے جواب میں

اس نے ایک خط ان کے سامنے رکھ دیا۔ یہ خط ان کے گھر والوں کی طرف سے اس کو بھیجا گیا تھا اور اس میں اسے کہا گیا تھا کہ ملازمت چھوڑ کر فوری طور پر گھر واپس آجائے کیونکہ مسلمانوں سے لوٹا ہوا مال کافی تعداد میں حاصل کر لیا گیا اور خوبصورت سے خوبصورت ترین عورتیں بھی موجود ہیں تم جتنا مال چاہو لے لو اور اگر عورت ضرورت ہو تو وہ بھی لے لینا بس تم فورا اپنے گھر پہنچو۔ اس خط کو دیکھ کر دیوان سنگھ مبہوت ہوا اور پھر اس کو سمجھایا کہ دوسروں کو مال حاصل کرنا گناہ ہے۔ مگر یہ نصیحت اکارت گئی۔ وہ ملازمت چھوڑ کر گھر چلے گیا اور اس نے سکھوں کے بیت المال سے اپنا حصہ وصول کیا۔ کسی زمانے میں وہ کسی فوجی ہسپتال میں وارڈ بوائے کے طور پر کام کرتا تھا اور وہاں سے اس نے کچھ طبی کام دیکھا دیکھی سیکھ لیا اور اب اس نے اپنے گاؤں میں پانچ سات مزید ادویات رکھ کے دیوان سنگھ کو خط لکھا کہ اب اس نے ڈاکٹری شروع کر دی ہے اور آئندہ جب خط لکھیں تو ڈاکٹر رن سنگھ کے نام پر بھیجا کریں۔

دوہری شخصیت ایک نفسیاتی حالت جو شدید جذباتی رویے سے پیدا ہوتی ہے اور اس کا اپنا انداز فکر ہوتا ہے اور یہ واقعات کا اظہار ہے۔ کردل باغ دہلی میں کچھ لوگ رہتے تھے جو موٹر ڈرائیور تھے لیکن فسادات کے دنوں میں انہوں نے بھی خوب لوٹ مار کی اور کناٹ پیلس کی ایک ریڈیو کی دکان کو لوٹا یہ لوگ ضلع امبالہ کے رہنے والے تھے وہاں سے وہ کافی سارے ریڈیو لوٹ کر گھر لے گئے لیکن ان کے گھر میں بجلی نہ تھی۔ انہوں نے ریڈیو چلانے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں پڑوسیوں سے بھی مدد لی گئی لیکن بجلی کے بغیر کیسے چل سکتے تھے معلوم ہونے پر انہوں نے اس مال کو اونے پونے داموں فروخت کر دیا۔ دیوان سنگھ ایک پڑھے لکھے اور کانگریسی وکیل کا واقعہ بتاتے ہیں کہ 1942ء میں گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد سیاسی حالات ابتر ہونا شروع ہو گئے اور انہیں بھی جیل میں نظر بند کر دیا گیا اور ان کے ساتھ دہلی کے ایک وکیل صاحب کو بھی نظر بند کیا گیا تھا جو کانگرس کے حلقوں میں کافی معتبر سمجھے جاتے تھے اور وہ ان قومی تحریکوں میں حصہ لینے میں پیش پیش تھے۔ 1947ء کے فسادات میں لوٹ کھسوٹ جاری تھی اور یہ وکیل صاحب بھی اس مال غنیمت سے استفادہ کرتے ہوئے دیکھے گئے۔ دیوان سنگھ نے چاہا کہ وکیل صاحب کے کانگرسی عزم کو جنجوڑا جائے لیکن اگلے ہی دن وکیل صاحب روزنامہ "ریاست" کے دفتر میں آئے اور معافی چاہی اور لوٹ کا مال واپس کرنے کی حامی بھری تاکہ ان

کی مزید جگ ہنسائی نہ ہو اور دوسرے کانگریسی لیڈران کو ان کے اعمال نامے کا پتہ نہ چلے اور وہ خود ہی شرم سے الگ ہو گئے۔ ان ہی دنوں میں ایک دوست دیوان سنگھ کے پاس آیا تو اس نے دیکھا کہ دیوان سنگھ یہ کم قیمت پین سے کام کر رہے ہیں کیونکہ ان کا پین گر کر اس کی نب ٹوٹ گئی تھی تو اس دوست کے پاس "پارکر" پین تھا اس نے انہیں بتایا کہ نیا قلم خرید لو لیکن انہوں نے جواب دیا کہ "پارکر" پین ساٹھ ستر روپے سے کم قیمت میں نہیں آتا اور اخبار بھی فسادات کی وجہ سے بند ہیں۔ اتنی قیمت ادا کرنا مشکل ہے اس پر ان کے دوست نے کہا کہ یہ پین سستا ہے اور 20 روپے میں مل سکتا ہے۔ یہ بھی لوٹا ہوا مال ارزاں قیمت میں فروخت کر رہے تھے لیکن انہیں ان کے ضمیر نے اجازت نہیں دی اور انہوں نے نہیں لیا۔[110]

معاشرتی سطح پر کچھ رویے حکمرانوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں اور وہ ان کی قیادت کی نوعیت کا اظہار کرتے ہیں۔ حیدر آباد دکن کے والی ریاست مرحوم میر محبوب علی خان نیک، صالح، فیاض اور کھلے دل کے مالک تھے یعنی ان کی شخصیت میں سیاسی قیادت کے تینوں نظریات موجزن تھے۔ جبکہ ان کے بعد میر عثمان علی والی ریاست بنے وہ اتنے ہی بخیل، متعصب اور تنگ نظر نکلے۔ ان کے والد کے پاس اگر کوئی دست سوال دراز کرتا تو وہ اس کا خیال رکھتے اور اسے نوازتے جبکہ میر عثمان بالکل مختلف تھا بلکہ وہ دینے کی بجائے لینے کا سوچتا اور وہ ہندوؤں کو تعصب کی نگاہ سے دیکھتا جس کی وجہ سے ریاست کے رئیس و سرمایہ دار طبقہ انہیں ہر وقت اپنے لئے خطرہ سمجھتا۔ اسی طرح ریاست حیدرآباد کی ایک جاگیر گدوال کی مالکہ ایک بیوہ رانی تھی۔ جن کے ہاں کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی اور وہ اپنے نواسے کو اپنا ولی عہد قرار دے کر اپنی جائیداد اور معاملات کو سنبھالنا چاہتی تھیں تاکہ وہ اپنے اور اپنی رعایا کے معاملات کو بہتر انداز سے چلا سکیں۔ لیکن والی ریاست حیدرآباد دکن کی نظر ان کی جاگیر پر تھی اور وہ چاہتے تھے کہ اس جاگیر کو کسی طریقے سے ضبط کیا جاسکے۔ جاگیر گدوال کی مالکہ بیوہ رانی اسے بچانے کے چکروں میں تھی۔ جب کہ رانی کے ایک عزیز مسٹر ریڈی مرکزاسمبلی کے ممبر ہوتے ہوئے بھی وہ اس معاملے میں بے بس تھے انہیں ایک ترکیب سوجی جس پر عمل پیرا ہو کر انہوں نے روزنامہ "ریاست" کے ایڈیٹر کو اس ظلم کی داستان سے آگاہ کیا۔ ایڈیٹر روزنامہ "ریاست" نے تواتر کے ساتھ اس پر مختلف مضامین لکھے جس کی وجہ سے وہ گورنمنٹ آف ہند کے پولیٹیکل سیکرٹری کو آگاہ کرنے میں کامیاب رہے اور مداخلت کر کے

نظام حیدرآباد کو اس جاگیر کی ضبطی سے روکا۔[111] اسی طرح کا ایک واقعہ وہاں کے سابق وزیر اعظم مہاراجہ سر کرشن پرشاد کے ساتھ پیش آیا کیونکہ والی ریاست کے سامنے صرف روپے پیسے کی پالیسی تھی جس کی وجہ سے وہ ہندوؤں کا بھی نیم مسلمان قرار دیتے تھے جبکہ مہاراجہ سر کرشن پرشاد کا خاندانی تعلق راجہ چندولال کے خاندان سے تھا۔ والی ریاست یہ چاہتے تھے کہ مہاراجہ سر کرشن پرشاد کی خاندانی جاگیر جو لاکھوں روپے سالانہ آمدنی کا ذریعہ تھی اسے ضبط کر لیا جائے مہاراجہ سر کرشن پرشاد حساس، ذہین اور خیال رکھنے والے تھے انہیں اس بات کی انتہائی تکلیف تھی کہ اگر ایسا ہو گیا تو خاندان کا وقار اور سہارا ختم ہو جائے گا۔ خاندانی مشکلات کے پیش نظر انہوں نے سوچا کہ اپنے با اعتماد دوستوں کی مدد سے مہاتما گاندھی کے گوش گزار کرنے کی کوشش کریں کیونکہ اس وقت مہاتما گاندھی کی تحریک زوروں پر تھی اور اس نے برطانوی استعمار کو پریشان کیا ہوا تھا۔ استعمار اپنی پوری قوت سے اس تحریک کو دبانے کے لیے پیش پیش تھا لیکن ناکام رہا۔ مہاراجہ سر کرشن پرشاد اپنے چند دوستوں کی مدد سے انتہائی رازداری کے ساتھ مہاتما گاندھی سے ملاقات کی اور انہیں اس قضیے سے آگاہ کیا جس پر مہاتما گاندھی نے انہیں جواب دیا:

> "سچائی اور جرات کے ساتھ کھلے طور پر میدان میں آجاؤ۔ چاہے اس راہ میں
> مٹ جاؤ اور اگر یہ جرات نہیں رکھتے تو ظلم برداشت کرتے چلے جاؤ۔"[112]

مہاراجہ سر کرشن پرشاد اس نظام کا حصہ رہے ہیں ان کے اندر کھلے بندوں مخالفت کی جوت کہاں سے پیدا ہو سکتی تھی وہ یہ جواب سن کر مایوس ہوئے حالانکہ ان کا یہ جواب ان کے لیے مزید راہیں کھولنے کا باعث تھا۔ مہاتما گاندھی کسی سازش میں شریک ہونا نہیں چاہتے تھے اس لیے انہوں نے مہاراجہ کو یہ مشورہ دیا۔ انہوں نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی جو بھی پالیسی اختیار کی وہ سب کے سامنے تھیں اسی وجہ سے اتنی مضبوط حکومت ہونے کے باوجود بھی برطانوی استعمار انہیں کچل نہ سکا۔ عصمت چغتائی کا افسانہ "ہندوستان چھوڑ دو" ہندوستان کی تحریک آزادی کے پس منظر میں لکھا گیا۔ کانگرس نے برطانوی استعمار پر اپنا دباو برقرار رکھنے کے لئے 8 اگست 1942ء کو "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کا آغاز کر دیا۔ اس تحریک کا مقصد ہندوستان کو استعمار سے آزادی دلوانا تھا۔ جس پر بہت سارے رہنماوں کو گرفتار کر لیا گیا اور ہندوستان میں دہشت کی فضا قائم کر دی گئی

اور اس فضا نے استعمار زدہ کے اندر بے خوفی اور بغاوت کی روح پھونک دی۔ ان جذبات و احساسات کو عصمت چغتائی نے اپنے اس افسانے میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ اس افسانے سے اس دور کی معاشرتی و سماجی صورتحال سے آگہی کے ساتھ نفسیاتی پہلوؤں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ گاندھی جی نے مہاراجہ سرکشن پرشاد کا ساتھ اس لیے نہیں دیا کہ انہوں نے ساری عمر اس نظام کو بنانے میں لگا دیا وہ اسے کیسے گرا سکتے تھے لیکن آخر کار والی ریاست کے ساتھ وہی ہوا جو منظور خداوندی تھا۔ اس کی حکومت اپنی ہی حرکتوں سے ذلیل و رسوا ہوئی۔[113]

رد استعماری تحرک کے ضمن میں مختلف ادوار میں ادب تخلیق ہوتا رہا اور ادیب اپنی اپنی صنف میں اسے تحریر کرتے چلے آئے ہیں اس کا اعزاز زیادہ تر ناول، افسانہ اور شاعری کی صنف کو حاصل رہا ہے۔ ان تخلیقات میں گھٹن زدہ ماحول میں آزادی کی جدوجہد کو کامیاب بنانے کے لیے لوگوں میں قومی شعور اور رد استعمار کے جذبات کو اجاگر کیا۔ ان میں کچھ دوران آزادی اور کچھ آزادی کے بعد ان حالات و واقعات کی تصویر کشی اور ان مجاہدین کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھے گئے جو ان کے ثمر بار آور کا موجب بنے۔ منشی پریم چند کا افسانہ "رانا بھگت" 1926ء میں لکھا گیا یہ ایک کسان کی کہانی ہے جو برطانوی استعمار کے خلاف ڈٹ گیا اور ان کے ظلم و ستم کو واشگاف کیا۔ ان کا ایک اور افسانہ "کفن" اس دور کی ایک تلخ کہانی ہے جس میں ایک کسان کی بپتا بیان کی گئی ہے جو برطانوی استعمار کی قلعی کھولتی ہے۔ یہ بھی انسانی استحصال کی ایک کڑی ہے۔ قسمت جوتائی کا افسانہ "تیسری قوت" 1946ء میں لکھا گیا یہ بھی استعمار کے خلاف استعمار زدہ کی آزادی کی کوششوں کو اجاگر کرتا ہے۔ اداس نسلیں عبداللہ حسین کا ناول ہے جس میں انہوں نے برطانوی راج، ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور معاشرتی حالات، تحریک آزادی کی جدوجہد اور تقسیم ہند کے حالات و واقعات کو بڑی عمدگی سے تحریر کیا ہے۔ "آگ کا دریا" قرۃ العین حیدر کا ناول ہے اس میں انہوں نے برصغیر کی تاریخ کو رقم کیا اور ساتھ ہی انہوں نے مذہب و ثقافت اور دوغلے شعور کو صراحت سے بیان کیا ہے۔ عزیز احمد کا ناول "مٹی کی موہن جوتی" رد استعمار کے تناظر میں لکھا گیا اس میں برطانوی استعمار کے خلاف آزادی کی جدوجہد اور استعمار زدہ کے رنج و الم کو بیان کرتا ہے۔ انتظار حسین کا افسانہ "دیوتا کا مرثیہ" ہے یہ رد استعمار کے تناظر میں لکھا گیا جس میں استعمار زدہ کی نمائندگی کرتے ہوئے اس کے جذبات کی کھل کر نمائندگی کی گئی۔ ان کا ناول "کانچ کا پل" برطانوی استعمار کے پس منظر میں لکھا گیا ہے جس میں برصغیر کے سیاسی اور سماجی حالات کو تحریر کیا گیا ہے۔ خدیجہ مستور کا ناول "آنگن" 1962ء میں شائع ہوا اس میں برصغیر کی تقسیم کے مناظر، جدوجہد آزادی کی تکالیف اور بعد کے حالات کی سنگینیوں پر مفصل بات چیت کی گئی ہے۔

عصر حاضر کی معاشرتی صورتحال کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ایک بات اظہر من الشمس ہے کہ خیر اور شر کی قوتیں ازل سے برسرپیکار ہیں اور یہ دونوں ابد تک برسرپیکار رہیں گی۔ استعمار اور رد استعمار کا تعلق بھی کچھ اسی طرح ہے۔ طاقتور اقوام کے معاملات ترقی پذیر ممالک کے ساتھ کچھ ایسے ہی ہیں۔ اسی طرح معاشرتی سطح پر متمول انسان دوسرے لوگوں کو حقیر اور کمتر خیال کرتا ہے۔ ایسے ہی معاشرتی طاقتیں اپنے اپنے محازوں پر براجمان ہیں اور ان کے درمیان سماجی سطح پر کشمکش زوروں پر ہے کیونکہ حکومت اپنے مسائل میں گھری ہوئی ہے اس کے کاروبار حکومت کو کثیر الجہتی مسائل کا سامنا ہے اس لیے وہ مضطرب ہے لیکن وہ ان مسائل سے چھٹکارا پانے میں مصلحت کا شکار ہے کیونکہ دوسری طاقتیں سیاسی اعتبار سے سماجی سطح پر کافی اثر ورسوخ حاصل کر چکی ہیں جبکہ مذہبی انتہا پسندی معاشرتی ناسور کی شکل اختیار کرتے ہوئے سیاسی میدان میں بھی اپنے قدم جما چکی ہے اور دن بدن لوگوں کو راسخ العقیدہ بنانے اور مذہبی تعلیمات کی آڑ میں اپنے عزائم کو پروان چڑھانے میں مصروف عمل ہیں۔

گروہ ثانی معاشرتی سطح پر عوام الناس کو جدیدیت کی طرف کھینچ رہا ہے اور روشن خیالی اس کا بنیادی عنصر ہے۔ یہ ایک فلسفیانہ تحریک تھی جو یورپ میں ابھری اس کی بنیاد عقل و سائنس پر رکھی گئی جس کی وجہ سے لوگوں میں تنقیدی سوچ نے جنم لیا اور انہوں نے روایت سے انحراف کرتے ہوئے درایت کو اپنایا۔ جس سے لوگوں میں انسانی حقوق، سائنسی ترقی، جمہوریت اور باہمی روابط کو بہتر کرنے کے شعور کا ادراک ہوا۔ جس سے روایتی انداز فکر کو بدلا گیا جدیدیت، نئے پن اور سیکیولرازم کی طرف توجہ مبذول کروائی گئی اور اس کا یہ تقاضا رہا کہ معاشرہ اپنے مذہبی چغے کو اتار پھینکے اور جدید لباس زیب تن کرے یعنی پینٹ شرٹ پہن لے۔ وہ ماضی کی فرسودہ روایات کو ترک کرتے ہوئے مابعد جدید صورتحال کی طرف اپنے آپ کو راغب کریں۔ اسی معاشرے میں ایک طاقت اور بھی ہے جو اسے زندگی کی ان خرافات سے دور رکھے ہوئے ہے اور جو اسے مابعد جدید صورتحال میں تبدیل ہونے سے مانع ہے۔ یہ صورتحال انتہائی گمبھیر ہے جو انسانوں کو دوہری شخصیت یا دوہرے شعور کی طرف کھینچ رہی ہے۔ ایک طرف مذہبی انتہا پسندی ہے جو مذہبی چوغہ پہنے بلا واسطہ عقائد کو متاثر کیے

ہوئے ہے جبکہ دوسری طرف جدید طبقہ جو جدیدیت کا نعرہ لیے مستقبل کے فکر انگیز نظریات کے سہانے خواب دکھاتے ہوئے ماڈرن ازم کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ بھی ایک فکری اور ثقافی تحریک ہے جو انسان کو تجربیت اور حقیقت پسندی کی طرف مائل کرتی ہے۔

سماجی سطح پر ایک ایسا طبقہ فکر ہے جو اسے دونوں انتہاؤں سے دور رکھتے ہوئے اسے محفوظ پناہ گاہ مہیا کیے ہوئے ہے اور وہ اسے مذہبی جنونیت سے نکال کر سادہ مذہبی زندگی گزارنے اور جدیدیت کی طرف مائل لوگوں کو دعوت فکر دیتے ہوئے مذہب کی طرف مائل کر رہا ہے۔ یہ طبقہ اسی معاشرے کے ادبی لوگوں، باشعور سیاست دانوں اور اعلی تعلیم یافتہ لوگوں پر مشتمل ہے جو یہ چاہتے ہیں کہ یہ معاشرہ پچھلی ناکامیوں کو بھول کر ایک نیا زاویہ نگاہ لیے ایک جدید معاشرے کی بنیاد بنے اور اس کی کامیابی سرمایہ دارانہ نظام سے ہے یہ ایک ایسا معاشی نظام ہے جس میں دولت کی تقسیم افراد کے ہاتھوں میں ہے جس کا تعلق بلا واسطہ بازاری طلب و رسد سے ہے جس میں دولت کی تقسیم کارکردگی اور وسائل پر ہے۔ لیکن یہ ناممکن ہے کیونکہ ہمارا معاشرہ سرمایہ داری نظام کا حصہ بننے سے قاصر ہے کیونکہ ہمارا معاشرہ زراعت کے پیشے سے منسلک ہے اور زرعی پیداوار ہماری ضرورتوں سے کمی بیشی کا شکار ہے کیونکہ ہمارے پاس سرمایہ دارانہ نظام اور پیشہ وارانہ ٹیکنالوجی کی کمی ہے۔ ہمارے ہاں ابھی تک مشینی انقلاب ہی نہیں آیا۔ ہم دنیا کی متروک ٹیکنالوجی سے استفادہ کر رہے ہیں یا کہیں زیادہ کوشش کی تو انفرادی سطح پر نقل تیار کر لی گئی۔ فصلوں کے بیج تک کینیڈا، سویڈن، ہالینڈ، چین وغیرہ ممالک سے درآمد کیے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں جمہوریت اور بیوروکریسی ناکام ہے کیونکہ اس کے پیچھے زراعت سے وابستہ ذہن کام کر رہا ہے اور یہ ذہن جاگیر دارانہ نظام کو تقویت بخشتا ہے۔ اور یہ نظام طاقت کے دوسرے مراکز کو مضبوط کرتا ہے۔ یہ طاقت کے ان مراکز کو سپورٹ نہیں کرتا جو لبرل ازم نے پیدا کیے۔ ہمارے ہاں انتہا درجے کی سرمایہ داری موجود ہے لیکن یہ صحت مند ذہنی طبقے کے لیے کشش یا لگاؤ کا باعث نہیں ہے جس کی وجہ سے اکثریت کا رجحان سرمایہ دارانہ نظام کی طرف مائل نہیں ہوا۔ دوسری طرف مذہبی انتہا پسندی پشاور، افغانستان اور دیگر ممالک سے درآمد شدہ ہے یا اس کے علاوہ اور بھی بہت سارے تعاملات ہیں جو معاشرتی سطح پر ایک مخصوص طبقہ ہائے فکر کے لیے کشش کا باعث ہیں لیکن اس کی تعداد معدودے ہے لیکن اپنے تحرک کے باعث انتہائی ضرر رساں ہے

۔اس لیے لوگ اس کی طرف مائل نہیں ہو رہے لیکن یہ اپنی کوششیں جاری رکھے ہوئے ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم کون ہیں ہم کیا کر رہے ہیں تو معاشی تناظر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم سرمایہ دارانہ نظام پر چلنے والے لوگ ہیں اور لیکن ہم نے اسے فارغ البالی کے لیے اپنایا ہوا ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں محنت، مشقت اور کمانے کے بعد سیر و سیاحت اس کا حصہ بن چکا ہے۔ وہ اپنی زندگیوں سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے دوسرے ممالک کے سیاحتی دورے کرتے ہیں اور تازہ دم ہو کر اپنے کاروبار کو مزید وسعت دینے کے لیے ہمہ تن گوش رہتے ہیں۔ ہم نے ان کی اس عیاشی کو تو اختیار کر لیا لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی اخلاقیات اور اصول و ضوابط سے نا آشنا رہے۔ انہیں اختیار کرنے کی نوبت نہ آئی۔ ہم صارف رہے اپنی سہولتوں اور عیاشیوں پر خرچ کرتے رہے کیونکہ ہمارے پاس سرمایہ کی کمی نہیں ہے لیکن ہم اپنی ان عادات کی وجہ سے اس طبقے کی پرورش کر رہے ہیں جو ہمارے اوپر حکومت کر رہا ہے اور جو بالواسطہ استعمار کا آلہ کار ہے کیونکہ نیا نو آبادیاتی نظام میں ملٹی نیشنل کمپنیز ترقی پذیر ممالک کی معیشت کو تباہی کے دانے پر لا چکی ہیں اور ہم ان کے بہترین صارف ہیں کیونکہ ہماری مقامی صنعت بالکل ختم ہونے کے قریب ہے اور ہم بجائے اس کے کے مقامی لوگوں کو اپنے ملک میں رغبت دلائیں اور انہیں بہترین سہولیات فراہم کریں تو یقیناً ہم اس پر قابو پا سکتے ہیں لیکن سرمایہ دارانہ نظام کے علمبردار اسے اپنائے ہوئے ہیں اور وہ دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہا ہے اور ہمیں بیرونی سرمایہ کاری کا لولی پاپ دیے ہوئے ہے۔ ہمارے ہاں خام مال اور افرادی قوت کی کمی نہیں ہے لیکن اس کے مواقع پیدا کرنا ایک بہترین حکمت عملی تیار کرتے ہوئے مستقل مزاجی سے اس پر عمل پیرا ہونا مشکل ہے۔ اس کی مثال سعودی عرب جیسے ملک کی دی جا سکتی ہے جہاں پر سوائے تیل کے دوسرے ذرائع مفقود ہیں لیکن وہ عنقریب دنیا کی بہترین صنعتی شہر بنانے جا رہا ہے اور یہ اس کا انتہائی اہم قدم ہے جو اس کے لئے بین الاقوامی سطح پر عروج کا باعث بنے گا۔ آج کل ہمارے معاشرے کو مختلف بحرانوں نے گھیرا ہوا ہے جس میں سر فہرست بجلی، مہنگائی، غذائی قلت، ثقافت، صنعت اور ٹیکنالوجی کے بحران سر اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس درد سری نے انسانی ذہن کو معوف کیا ہوا ہے اور انسان اپنے دروازے بند کیے اپنی زندگی میں مگن ہے اسے آج بھی اس معاشرے میں سرمایہ دارانہ نظام کی اشد ضرورت ہے لیکن وہ گوں مگوں کی کیفیت میں مبتلا ہے۔ کبھی وہ مذہب کی طرف رخ کرتا ہے اور

کبھی سیاسی سطح پر نوسر بازوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ جس سے اس کا ذہنی تناؤ بڑھتا جارہا ہے جس کی وجہ سے وہ کبھی ایک طبقے کے ساتھ کبھی دوسرے طبقے کے ساتھ الحاق کرتا ہے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس کا اپنا شعور نہیں بلکہ یہ دوہرے شعور کا شکار ہے۔

باب سوم:

حوالہ جات

1. فرانز فینن، "The Wrached of the Earth" ، مشمولہ: مضمون نو آبادیات مابعد نو آبادیات اور رد استعماریت (سیاسی اور ثقافتی تناظر میں)، محمد عامر سہیل: ماہنامہ قومی زبان، کراچی، نومبر 2020، ص:91
2. فرانز فینن، "The Wrached of the Earth"، ماہنامہ قومی زبان، کراچی، نومبر 2020ء، ص:91
3. محمد جعفر تھانیسری، ڈاکٹر، "کالا پانی المعروف تواریخ عجیب"، محمدن اینگلو اورینٹل پریس، لاہور، 1879ء، ص:12
4. ایضاً، ص:14
5. ایضاً، ص:17
6. ایضاً، ص:21،20
7. ایضاً، ص:24
8. ایضاً، ص:27-30
9. ایضاً، ص:42
10. ایضاً، ص:54،45
11. حسرت موہانی، مولانا، "قید فرنگ"، کتب خانہ اردوئے معلی، کانپور، 1929ء، ص:9
12. ایضاً، ص:96-98
13. ایضاً، ص56،53:
14. ایضاً، ص:52
15. ایضاً، ص44
16. ایضاً، ص44
17. ایضاً، ص46
18. ایضاً، ص49
19. ایضاً، ص32
20. ایضاً، ص93
21. ایضاً، ص92-94

22. محمد جعفر تھانیسری،ڈاکٹر،"کالاپانی المعروف تواریخ عجیب"، محمدن اینگلواورینٹل پریس،لاہور،1879ء،ص22-23

23. ایضاً،ص23

24. حوالہ:ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ، "Our Indian Musalman"،مکی دارالکتب،لاہور ،ص :62

25. شورش کاشمیری،"بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل"،مکتبہ ناصر،لاہور،1960ء،ص:21-23

26. ایضاً،ص23

27. ایضاً،ص23

28. ایضاً،ص22-23

29. ایضاً،ص40-41

30. ایضاً،ص23-29

31. مجروح سلطانپوری،"کلیات مجروح سلطانپوری"،الحمد پبلی کیشنز،لاہور،2003ء،ص:95

32. شورش کاشمیری،"بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل"،مکتبہ ناصر،لاہور،1960ء،ص:31-38

33. ایضاً،ص50-58

34. ایضاً،ص59

35. ایضاً،ص73

36. ایضاً،ص78

37. ایضاً،ص79

38. ایضاً،ص84

39. ایضاً،ص79-86

40. ایضاً،ص90

41. ایضاً،ص91

42. ایضاً،ص87-94

43. ایضاً،ص95-100

44. ایضاً،ص101-105

45. ایضاً،ص107-121

46. ایضاً،ص121-128

47. ایضاً، ص131

48. ایضاً، ص132

49. ایضاً، ص132

50. ایضاً، ص132

51. ایضاً، ص134

52. ایضاً، ص131-135

53. ایضاً، ص141-137

54. ایضاً، ص143

55. ایضاً، ص143-160

56. ایضاً، ص181

57. ایضاً، ص181

58. ایضاً، ص161-189

59. ایضاً، ص216-255

60. ایضاً، ص234

61. شورش کاشمیری، "بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل"، مکتبہ ناصر، لاہور، 1960ء، ص:238-239

62. ایضاً، ص261

63. ایضاً، ص254-262

64. ایضاً، ص264

65. ، ص277-263

66. ایضاً، ص279

67. ایضاً، ص351-363

68. ایضاً، ص365-372

69. ایضاً، ص420

70. ایضاً، ص420

71. ایضاً، ص419-424

72. ایضاً، ص426

73. ایضاً، ص428

74. ایضاً، ص441

75. ایضاً، ص441

76. ایضاً، ص441

77. ایضاً، ص425-450

78. ایضاً، ص455

79. ایضاً، ص459

80. ایضاً، ص451-462

81. ایضاً، ص465

82. ایضاً، ص466

83. ایضاً، ص467

84. ایضاً، ص463-468

85. ایضاً، ص473

86. ایضاً، ص477

87. ایضاً، ص490

88. فرانز فنن، "افتادگان خاک"، فکشن ہاؤس، لاہور، 2017ء، ص:31

89. شورش کاشمیری، "بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل"، مکتبہ ناصر، لاہور، 1960ء، ص:403-495

90. دیوان سنگھ، سردار مفتون، "ناقابل فراموش"، مکتبہ جدید پریس، لاہور، 1954ء، ص:75

91. ایضاً، ص72-77

92. ایضاً، ص129-130

93. ایضاً، ص104

94. ایضاً، ص174

95. ایضاً، ص177

96. ایضاً، ص168

97. دیوان سنگھ، سردار مفتون، "ناقابل فراموش"، مکتبہ جدید پریس، لاہور، 1954ء، ص:167-172

98. ایضاً، ص173

99. ایضاً، ص172-174

100. ایضاً، ص255

101. ایضاً، ص255-258

102. ایضاً، ص356

103. ایضاً، ص357

104. ایضاً، ص386

105. ایضاً، ص404

106. فرانز فینن، "افتادگان خاک"، فکشن ہاوس، لاہور، 2017ء، ص35

107. دیوان سنگھ، سردار مفتون، "ناقابل فراموش"، مکتبہ جدید پریس، لاہور، 1954ء، ص404

108. ایضاً، ص418

109. ایضاً، ص420

110. ایضاً، ص424-425

111. ایضاً، ص442

112. ایضاً، ص443

113. ایضاً، ص443

باب چہارم: منتخب اُردو آپ بیتیوں میں رد استعماری تہذیبی شعور کا مطالعہ

(سیاسی، سماجی، مذہبی محرکات واثرات)

رد استعماری تہذیبی شعور کا مطالعہ ایک ایسا شعبہ ہے جو استعماری ثقافتی اثرات کے خلاف ہماری فکری قوتوں کو ممیز کرتا ہے تاکہ منفی اثرات سے بچا جا سکے۔ استعمار نے اپنی چالاکی اور مکاری سے جو ثقافتی اختلاط پیدا کیا تھا یہ اس کے منفی اثرات کا جائزہ لینے اور اس کو زائل کرنے کے علاوہ مقامی ثقافتی شناخت کو بحال کرنے میں مدد و معاون ہے۔ رد استعماری تہذیبی شعور کے علمبرداروں میں بہت ساری شخصیات شامل ہیں جنہوں نے استعمار کے خلاف مقامی تہذیب و ثقافت کا تحفظ کیا اور اسے اپنے معاشرے میں دوبارہ بحالی کے انتھک تگ و دو کی۔ برصغیر کے حوالے سے مہاتما گاندھی (Mohatama Gandhi) کا نام لیا جاتا ہے انہوں نے "ستیہ گرہ" تحریک چلائی۔ یہ استعماری مصنوعات کا بائیکاٹ کرنے اور مقامی ثقافت و حرفت کو فروغ دینے کے لیے تھی اس کا نام "سوادیسی" تھا۔ فرانز فینن --نے اپنی تحریروں کے ذریعے استعمال نظام کے نفسیاتی اور سماجی اثرات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے ان کی کتابیں- The Wretched of the Earth, Black Skin (White Masks– جو کہ استعماری نظام کے خلاف مختلف تحریکوں کا پیش خیمہ بنیں۔ ایمے سیزر– (Aime Cesire)-مارٹینک نژاد فرانسیسی شاعر اور سیاست دان تھے۔مارٹینک -- کریبین سمندر میں ایک جزیرہ ہے جو کہ فرانس کی عملداری میں ہے۔ یہ فرانس کا حصہ ہونے کے ساتھ ساتھ یورپین یونین کا بھی حصہ ہے۔ایمے سیزر نے "نیگریٹو" تحریک کی بنیاد رکھی اور یہ تحریک افریقی ثقافت اور شناخت کی بحالی کے لیے پیش پیش رہی۔ ایمے سیزر کی تصانیف نے استعمار کو ہدف تنقید بنایا اور افریقی شناخت کے احیاء کو فروغ دینے کے لیے کوشاں رہے۔ لیوپولڈ سینگور–(Leopold Sedar Senghor)-جن کا تعلق سینیگال سے تھا اور وہ بھی "نیگریٹو" تحریک کے بانی اراکین میں شامل تھے۔انہوں نے بھی اپنی شاعری اور سیاست سے افریقی

ثقافت اور تہذیب کی بحالی میں اہم کردار ادا کیا۔ چنوا اچیبے-(Chinua Achebe)-نائجیریا کے مشہور ناول نگار ہیں جنہوں نے اپنے ادبی کاموں کے ذریعے افریقی معاشرت میں مخلط استعماری اثرات کو اجاگر کیا۔ انہوں نے اپنی مشہور کتاب(Things Fall Apart) میں افریقی معاشرتی تہذیب کی تباہی کو بیان کیا ہے۔ امیلکار کبرال-(Amilcar Cabral)-کا تعلق گیانابساؤ سے تھا۔ یہ افریقی تحریک آزادی کے رکن تھے۔انہوں نے بھی افریقی ثقافت اور شناخت کی بحالی کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔ نعوگی واتھیونگو-(Ngugi Wa Thiongo)-معروف ادیب اور دانشور تھے۔ جن کا تعلق کینیا سے تھا۔انہوں نے استعماری ثقافت کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے افریقی ثقافت کی بحالی پر زور دیا اور انہوں نے اپنی تصانیف کو انگریزی میں لکھنے کی بجائے مادری زبان "گیکویو" میں لکھا تاکہ افریقی ثقافت شناخت کو بحال کیا جاسکے۔ یہ شخصیات رد استعماری تہذیبی شعور کی علامت ہیں اور ان کی کوششوں نے مختلف خطوں میں نوآبادیاتی تسلط کے خلاف شعور بیدار کیا اور مقامی ثقافتوں اور شناختوں کو بحال کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

برصغیر کے حالات و واقعات کا جائزہ لیا جائے تو یہاں کے حالات بھی ناگفتہ بہ تھے۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری لکھتے ہیں میری ہزاروں کی جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ، جاہ وحشم، نوکر چاکر[1] غرضیکہ دنیا کی ہر قسم کی سہولیات میسر تھیں لیکن پل بھر میں انگریز کے غصے نے ان تمام کیفیتات کو یکسر بدل دیا۔ قضیہ یہ ہوا کہ وہ اسلامی روایات اور مشرقی تہذیبی شعور سے آگاہ تھے اور وہ اس معاشرتی بندھن میں بندھے ہوئے تھے۔ معاشرتی رکھ رکھاؤ، مہمان نوازی، اخلاق و مروت سے پیش آنا، صلہ رحمی، ایک دوسرے کے کام آنا، انسانی ہمدردی، آپس کی چھوٹی چھوٹی ضروریات کو پورا کرنا۔ یہ اس معاشرے کا خاصہ تھا۔ یہی وہ تہذیبی شعور تھا کیونکہ تہذیب ایک معاشرتی عمل ہے جو اس معاشرے کی ثقافت اور اس کے اخلاقی نظام کو وضع کرتی ہے اور اس میں اس معاشرے کی مجموعی حالات وعادات، روایات اور ان کی طرز زندگی ان کے فنون سے وابستہ ہے۔ اس معاشرے کی روایات اقدار ، ثقافتی ورثہ ، علم و ہنر، اخلاقی اقدار ،معاشرتی نظام، اقتصادیات اس معاشرے کی غمازی کرتی ہیں۔ اپنے ہم عقیدہ مسلمانوں کی خیر خواہی چاہنا، ان کی مدد کرنا یا معاشرتی سطح پر میل ملاپ رکھنا یا ان کی مہمان نوازی کرنا کوئی اتنا بڑا جرم نہ تھا کہ جس سے تہذیبی المیہ رونما ہوتا۔ انہوں نے

صرف گرفتاری سے بچنے کے لیے راہ فرار حاصل کی جو کہ انگریز سرکار کے غصے کی وجہ بنی۔ استعمار اپنی پوری طاقت سے وارد ہوا۔ پکڑ دھکڑ کا اغاز ہوا جس سے معاشرتی انتشار پیدا ہوا۔ عوامی حلقوں میں بے چینی کی سی کیفیت ظاہر ہونی شروع ہوئی۔ سرحدی سرحد پر ہونے والی لڑائی مزید تنازعات کا شکار ہو گئی اور جنگ و جدل کا بازار گرم ہو گیا۔ انگریز سرکار کے غصے میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا اور انہوں نے مختلف قسم کی پابندیاں نافذ کرنی شروع کر دیں عزیز و اقارب، تعلق داروں کی پکڑ دھکڑ شروع کر دی گئی اور ان کی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کو قرق کر لیا گیا ۔ مقدمہ کی معمولی سماعت کے بعد اسے نیلام کر دیا گیا۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری کے شیر خوار بچوں سمیت ان کی اہلیہ کو گھر سے نکال دیا گیا اور وہ دربدر ہو گئے۔ یہ تہذیبی المیہ صرف مولانا حسرت کے ساتھ پیش نہیں آیا بلکہ اس کے اثرات پورے برصغیر تک پہنچے جس سے پورے معاشرے کی تہذیب و ثقافت کو شدید نقصان پہنچا اور وہ معاشرہ خلفشار کا شکار ہوا۔ اس المیہ کا اثر نہ صرف اس معاشرے پر پر ہوا بلکہ یہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی تباہی کا سبب بنا۔

ملکہ وکٹوریہ کی ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر روڈیارڈ کیپلنگ (Rudyard Kipling) برطانوی نژاد شاعر نے ایک نظم لکھی۔ جس کا عنوان "The White Man's Burden" تھا جو 1899ء میں شائع ہوئی۔ اس نظم میں امریکی و برطانوی سامراج کی توسیع اور استعمار کے تسلط کا جواز بیان کیا گیا ہے۔ یہ نظم سامراجی عالمی نظریہ کی عکاس ہے۔ اس میں تین نظریات بیان کیے گئے ہیں۔

اول: سفید آدمی کے بوجھ کے عنوان سے بات کی گئی ہے۔ اس نظم میں استعمار زدہ لوگوں کو "آدھے شیطان اور آدھے بچے" کی حیثیت سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اجڈ اور گنوار ہیں۔ یہ خود طرز حکمرانی سے نابلد ہیں۔

دوم: نظریہ نگہبانی کے حوالے سے بات کی گئی۔ استعمار زدہ کو رہنمائی اور تحفظ کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ اتنے بالغ النظر نہیں ہیں۔ انہیں ہماری نگرانی اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔

سوم: مہذب معاشرہ بنانے کا دائرہ عمل۔ اس میں یہ باور کروایا گیا ہے کہ ہماری تعلیم ، تہذیب و ثقافت ، مذہب، قانونی نظام اور اقدار تمام دنیا سے اعلیٰ و برتر ہیں۔ مقامی تہذیب و ثقافت اور روایات کو ختم کر کے ہماری پیروی کی جائے کیونکہ یہ ان کی ترقی کے لیے فائدہ مند ہے۔

ان نظریات کو جس طرح فخر و مباہات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان کی حقیقت قدرے مختلف ہے۔ استعماریت ہمیشہ سے استعمار زدہ کو حقیر و ذلیل اور ہر طرح کی خوبیوں سے مبرّا سمجھتی تھی۔ اور وہ یہ سمجھتی تھی کہ اعلی تہذیب و تعلیم، سیاست، حکومت ان کے بس کی بات نہیں۔ وہ ان کے ظاہری حلیے، مفلسی اور عوامی جہالت کے پیش نظر اس نظریے تک پہنچی۔ اہل ہندوستان کے حوالے سے ان کی یہ رائے غلط فہمی کا نتیجہ تھی۔ حالانکہ فہم، ادراک، شعور کے اعتبار سے یہ قوم بالغ النظر تھی۔ مولانا حسرت لکھتے ہیں کہ میں ایک قیدی کی حیثیت سے ان قیدیوں کے ساتھ رہا اور ان قیدیوں کے خیالات عمومی نہ تھے بلکہ وہ اس سے کہیں زیادہ استعداد کے مالک تھے۔ وہ لوگ انتہائی زیرک تھے حالانکہ وہ اپنی کم علمی کے باوجود سیاسی حالات سے آگاہ تھے۔ اگر ان کے سامنے کسی پختہ رائے کا اظہار کیا جاتا تو وہ اسے من و عن قبول کرتے اور فوری ذہن نشین کر لیتے ہیں۔ [2] ان کے شعور کا اندازہ کچھ اس طرح سے لگایا جاسکتا ہے۔ سودیسی بائیکاٹ، تعلیم کے قومی معاملات اور پنچایتی اصولوں کو انہوں نے بڑی عمدگی سے سمجھا اور اس کے مطابق اس کا اظہار کیا۔ حکومتی نظام کی اصلاحات کو لغو قرار دیا۔ انہوں نے یہ ثابت کیا کہ اگر ان ادنی اقوام کو حصول علم کے عمدہ ذرائع حاصل ہوں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ترقی کے اعلی ترین مقام تک پہنچ سکیں۔ ان کی یہ حالت جان بوجھ کر کی گئی۔ ملازمین جیل کی بلاوجہ کی سختیاں، بے ہودہ گالیاں اور ناقص غذائی صورتحال کے حوالے سے اصلی حقیقت حال سے صرف قیدی ہی واقف تھے اس کے علاوہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ اس معاشرے کے مرد و زن خود آگاہ تھے۔ جنہوں نے استعماری صعوبتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اپنے مقصد کو پشت نہ دکھائی۔ استعماری ظلم و جور کے خلاف ان کے حوصلے پست نہ ہوئے۔ اس کی ایک عمدہ مثال کچھ یوں ہے کہ مولانا حسرت موہانی کو گرفتار کر کے پابند سلاسل کر دیا گیا تو ان کی بیوی نے حوصلہ افزائی کے لیے انہیں ایک تحریر لکھ کر بھیجی۔ جس کے الفاظ

کچھ یوں ہیں:. "تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو! میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا۔ خبردار! تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار ہو"[3]

مسٹر تلک تحریک آزادی کے ایک اہم رہنما اور ادیب تھے جنہیں ان کی رہائش گاہ واقعہ ڈیفنس سے گرفتار کر لیا گیا۔ جو تحریک آزادی کے روح رواں اور بلند ہمت انسان تھے۔ مولانا حسرت لکھتے ہیں کہ مجھے ایسے معلوم ہوتا تھا کہ اگر جج صاحب نے انصاف سے کام لیا تو یہ آج ضرور بری ہو جائیں گے۔ لیکن جسٹس داور نے فیصلہ دے کر کبیدہ خاطر کر دیا۔ اس پر مولانا حسرت نے ایک رباعی پڑھی:.

"طاعت ہے فرنگیوں کی جس کا دستور

کیا خاک انہیں داد گری کا ہو شعور

انصاف کے دشمن کا داد رہے لقب

"برعکس مہند نام زنگی کافور"[4]

ان اشعار میں مولانا نے استعماریت کہ نظریات کی قلعی کھول دی ہے۔ کہ فرنگیوں کی پیروی کرنے والے عدل و انصاف کے شعور سے محروم ہیں۔ وہ ان کے عدل و انصاف کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ محض دکھاوا ہے۔ ان کے اس مصنوعی پن کو بھانپنا عقل و شعور کا متقاضی ہے۔ ایسے لوگوں کو منصف کہا جا رہا ہے جو حقیقت میں انصاف کے دشمن ہیں۔ ان کی انانیت کے سامنے کوئی اصول و ضابطہ وقعت نہیں رکھتا اور تمام قوانین بے بس ہیں۔ یہ لوگ دوہری شخصیت کے مالک ہیں۔ "برعکس نہند نام زنگی کافور" یہ ایک فارسی زبان کا محاورہ ہے اور یہ ظاہری تضاد کے لیے بولا جاتا ہے۔ جیسے کہ سیاہ و سفید یعنی اصل حقیقت کے برعکس دکھائی دے۔

تعلیم یافتہ اخبار نویسوں پر بغاوت کے مقدمات قائم کیے گئے اور جیلوں میں انہیں خاص طور پر مختلف اذیتیں دی گئیں۔ اور یہ واقعات اتنے تواتر سے ہوئے کہ لوگوں نے اس کی طرف توجہ دینا ہی چھوڑ دی بلکہ سوائے عزیز رشتہ داروں کے کسی کو اس کا علم بھی نہیں ہوتا تھا۔ ان کی کیفیت کچھ اس سے کم نہ تھی کہ جس طرح مرنے کے بعد کچھ دنوں مرنے والے کی یاد دلوں سے فراموش ہو جاتی ہے بالکل اسی طرح گرفتار لوگوں کو مردہ سمجھ لیا گیا۔ اسی طرح وطن پرست، حریت پسند، آزاد خیال اور اعلی حوصلے کے مالک رد استعماری جدوجہد کے سپاہی سوامی شانند کے ساتھ ہوا۔ ایک یا دو قومی نظموں کی اشاعت کے جرم میں ان پر بغاوت کا مقدمہ درج کیا گیا اور انہیں بھی سات سال قید عبور دریائے شور کی سزا سنائی گئی۔[5]

خدا کی بستی میں سماجی عکاسی کے حوالے سے فاروق عثمان لکھتے ہیں

> "تہذیبی اور ثقافتی قدروں کا بحران جھوٹ, منافقت اور زرپرستی کو جس سطح پر لے آیا ہے. اس ناول میں اس سماجی زندگی کی عکاسی بڑے بھرپور انداز میں ملتی ہے. پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے جیسے تباہی اور آشوب کی نادیدہ قوتیں کشاں کشاں ایسے راستوں پر لے جاتی ہیں جہاں ایک المیہ ناول کے کرداروں کا منتظر کھڑا ہوتا ہے"[6]

غیر مہذب اور بے اعتنائی کے رویے کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ ترقی یافتہ اور مہذب ممالک میں قیدیوں کی اصلاح مقدم رکھی جاتی ہے لیکن ہندوستان میں اس اصول کو نظر انداز کر دیا گیا۔ قید خانوں کو کارخانوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ چکی پیسنے والوں کے علاوہ باقی قیدیوں کو اتوار کی چھٹی کا موقع کم ہی ملتا تھا۔ بلکہ عید، بکرا عید، محرم یا مذہبی تہواروں کا خیال بھی نہیں رکھا جاتا تھا۔ انہیں کام پر بھیج دیا جاتا یا کوئی بیگاری کام پر لگا دیا جاتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ کارخانوں کا ایک روز بند رہنا۔ جیل کی مالی آمدنی میں کمی اور حکام کی حسن کارکردگی میں نقص کے مترادف ہے۔ لہذا اگر کوئی قیدی بیماری پیٹ درد یا صحت کے حوالے سے کسی پریشانی کا

عذر پیش کرے تو اسے ہسپتال بھیجنے کی بجائے دار ڈر اور بعد میں نائب جیلر کی سختی کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور وہ اس قیدی کی خوب مرمت کرتے ہیں تا کہ وہ دوسرے قیدیوں کے لیے نشان عبرت بنا رہے۔ اکثر یہ کوشش کی جاتی تھی کہ ان سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے اور ان پر کم سے کم خرچ کیا جائے۔ جیل کی ابتری کے ذمہ داران جیل کے حکام تھے۔ اس میں جتنی بھی سختیاں یا بد تہذیبی کی جاتی وہ ان کے اشاروں یا ان کے کہنے پر کی جاتی تھیں۔ آلہ آباد کے ایک قیدی "سبحان" نے انسپیکٹر جنرل جیل خانہ جات سے یہ عذر پیش کیا کہ میرے ہاتھ کا گٹھا اترا ہوا ہے لہذا میں چکی کی مشقت کرنے سے قاصر ہوں اس لیے مجھے کوئی آسان مشقت دی جائے تا کہ میں آسانی سے کر سکوں. مترجم نائب جیلر نے اس بات کو اتنا بڑھاوا دیا کہ یہ شخص میرے خیال میں بہانہ بازی کر رہا ہے یہ فراڈی ہے اس لئے اس کی مشقت تبدیل نہ کی جائے اور ایسا ہی ہوا اس کی مشقت تبدیل نہیں کی گئی بلکہ اسے ایک ماہ کے لیے بیڑیاں پہنا دی گئی۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ ضلع آلہ آباد کے "خلیل" کا ہے۔ مشینی کام کرتے ہوئے اس کی انگلی کٹ گئی۔ نائب جیلر نے اس کی ترجمانی کرتے ہوئے بتایا کہ کام چوری کے لیے اس نے اپنے ہاتھ کو زخمی کر لیا ہے۔ اسے بھی غیر معینہ مدت کے لیے بیڑیاں پہنا دی گئیں اور تین مہینے کے لیے اس کے نام چکی کی مشقت لکھ دی گئی اور وہ بیچارہ ایک ہاتھ سے چکی پیسنے پر مجبور ہوا۔ کوئی پڑھا لکھا قیدی اپنا عذر انگریزی زبان میں سپریٹینڈنٹ سے نہیں کر سکتا تھا کیونکہ انگریز سے انگریزی میں بات چیت کرنا گستاخی سمجھا جاتا تھا۔[7]

نظم "The White Man's Burden" میں استعمار کے حوالے سے جو مہذب خاکہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ استعمار زدہ کی تہذیب اور ترقی کا خیال کریں گے. وہ ان کی نگہبانی کرتے ہوئے رہنمائی اور تحفظ کریں گے۔ وہ فارسی محاورہ "برعکس نام زنگی کافور" کا مصداق اور ان کے غیر مہذبانہ رویے کا عکاس ہے۔ انہوں نے اپنے تعصب اور غرور سے عدالت کے ایوانوں میں، معاشرتی میدانوں میں اور جیل کوٹھریوں میں انوکھا امتیاز پیدا کیا۔ قانون و انصاف کی دھجیاں بکھیر دی۔ مختلف اقوام کے درمیان امتیازات کو ہوا دی۔ نفرت اور تعصب

کا بیج بویا گیا۔ قید فرنگ میں مؤلف لکھتا ہے کہ جیل کے قیدیوں کی خوراک، پوشاک اور جائے قیام کیسی ہوتی تھی:

خوراک: مقامی یا کالے قیدیوں کے لیے صبح کے ناشتے میں آدھا پاؤ چنے اور نو چھٹانک پکی ہوئی روٹی دیے جانے کا حکم ہے۔ جبکہ قیدیوں کو چنے چھٹانک یا ڈیڑھ چھٹانک سے زیادہ نہیں ملتے تھے اور روٹی چھ سے آٹھ چھٹانگ تک ملتی تھی۔ وہ بھی مٹی اور چونا ملے آٹے سے بنی ہوتی تھی۔ اور وزن پورا کرنے کے لیے روٹی کو قدرے کچا رکھا جاتا تھا جس سے کو ئلوں کی بھی بچت ہو جاتی تھی۔ دوپہر کے کھانے میں ابلی ہوئی، گھی کے بغیر دال اور شام کو موٹے ڈینٹھلوں والا ساگ دیا جاتا تھا۔ اس کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ اگر اسے پھینک بھی دیا جائے تو کوے بھی اس کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ جبکہ گوروں کو ناشتے اور کھانے میں ڈبل، روٹی، اچار، شکر، گھی، گوشت، ترکاری، چاول، دودھ غرض سب کچھ کافی مقدار میں ملتا ہے۔

پوشاک: مقامی یا کالے قیدیوں کے لیے ایک لنگوٹ، ایک جانگیا، ایک کرتا، ایک ٹاٹ نیچے بچھانے کے لیے، ایک کمبل اوپر اوڑھنے کے لیے اور ایک ٹوپی سر پر رکھنے کے لیے دی جاتی ہے۔ پہننے کے لیے کپڑے قواعد کے مطابق چھ ماہ کے لیے ہیں لیکن ایک سال یا زیادہ دنوں تک چلائے جاتے ہیں۔ اگر وہ خراب ہو جائیں یا پھٹ جائیں تو ایک نئی مصیبت سر پر سوار کر دی جاتی ہے۔ کسی کے پاس کپڑوں سے زیادہ کوئی چیز ہو تو اسے بھی سزا دی جاتی ہے۔ جب کہ گوروں کے لیے بوٹوں کے کئی جوڑے، موزوں کے کئی جوڑے، متعدد سوٹ اور ان کو دھونے کے لیے علیحدہ ہندوستانی قیدی دھوبی کے طور پر دیا جاتا ہے۔

جائے قیام اور دیگر ضروریات: مقامی اور کالے قیدیوں کے لیے بارکیں اور مٹی کے چبوترے بنے ہوتے ہیں۔ گرمی ہو یا سردی ہر موسم میں انہیں اس پر سونا پڑتا ہے حتی کہ گرمیوں کے موسم میں کاغذ کا پنکھا رکھنے میں بھی ممانعت ہے۔ رات کو جائے حاجت کا کوئی بندوبست نہیں ہے اس لئے سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن جب صبح ہوتے ہی بارکیں کھول دی جاتی ہیں تو تمام قیدی ایک ساتھ پاخانہ جاتے ہیں۔ جس کی

وجہ سے انہیں کافی دیر منتظر رہنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی گھنٹی سے کام لیا جاتا ہے تو گھنٹی دو یا تین منٹ سے زیادہ جائے پاخانہ میں رہنے کی اجازت نہیں دیتی۔ جس کی وجہ سے قیدی کو فوری باہر آنا پڑتا ہے۔ ہاتھ منہ دھونے کا کوئی معقول بندوبست نہیں ہے۔ کتاب دیکھنا تو درکنار اگر کسی کے پاس کاغذ کا پرزہ بھی نظر آجائے تو اس کی شامت آجاتی ہے۔ جب کہ گوروں کے لیے علیحدہ علیحدہ کمرے، مسہری، گدا، چادر، میز، سٹول، رات کو روشنی کے لئے لیمپ، لکھنے اور پڑھنے کے لیے کتابیں، اخبارات، کاغذ اور قلم دوات ہر وقت موجود رہتے ہیں اور ہر کمرے کے لیے غسل خانہ الگ اور پاخانہ الگ ہوتا ہے غسل خانے میں تولیہ صابن ہوتا ہے۔ ہر یورپین قیدی کے کمرے میں دو ہندوستانی قیدی بطور پنکھا قلی دیے جاتے ہیں اور وہ بارہ بارہ گھنٹے پنکھا جھلنے کی ڈیوٹی دیتے ہیں۔

مذہبی فرائض کی ادائیگی: مقامی اور کالے قیدیوں کے لیے زیادہ مذہبی آزادی نہیں ہے۔ ایک تو ان کا لباس جو کہ ستر پوشی کے لیے ناکافی ہے۔ مجبوری میں نیم برہنگی حالت میں نماز پڑھتے ہیں ان کے لیے پند و نصائح کا انتظام تو درکنار اخلاقی جرائم کرنے پر انہیں الٹا انعام ملتا ہے۔ حکام بالا انہیں خصوصی طور پر غیبت، جاسوسی، ظلم اور بدزبانی پر اکساتے ہیں جس کے عوض انہیں رعایت دی جاتی ہے۔ انہیں کسی قسم کی چھٹی نہیں دی جاتی۔ عزیز و اقارب کو ملنے اور انہیں خط لکھنے کی اجازت نہیں۔ ہر سہ ماہی پر سپرنٹینڈنٹ جیل اپنے کارندے قیدیوں کی کارگزاری پر ان کی سزا معاف کی جاتی ہے اس سے اس قسم کے قیدی ہی مستفید ہوتے ہیں۔ جبکہ گوروں کے لیے ہر ہفتے پادری واعظ کرنے اور عبادات کرانے آتا ہے۔ ہفتے میں ایک چھٹی پکی جبکہ عیسائیوں کے تہواروں پر دعوت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ہر قسم کے میوے اور کھانے دیے جاتے ہیں۔ انہیں مشقت میں ہلکا کام دیا جاتا ہے اور یہ اپنے عزیزوں و دوستوں کو خط و کتاب اپنی آسانی سے کر سکتے ہیں۔ اور ہر سہ ماہی پر سپریٹینڈنٹ جیل کی طرف سے رعایت کے بھی مستحق پاتے ہیں۔ ملازمین جیل انہیں کوئی تکلیف بھی نہیں دے سکتے۔ الٹا ان کی غلطیوں پر چشم پوشی کرتے ہیں۔ عیاش اور بدمزاج قیدی یہ کہتے ہیں کہ ہمیں گھر سے بھی زیادہ جیل میں آرام و سکون ہے۔ گوروں کو ہر حال میں کالوں پر برتری حاصل ہے۔ ان کے دعووں

اور ان کے عملی دائرہ کار کا بخوبی جائزہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مقامی قیدیوں کا کس طریقے سے استحصال کر رہے ہیں۔[8]

برصغیر کا تہذیبی شعور کثیر ثقافتی اور متنوع حیثیت کا حامل ہے۔ یہاں پر مختلف قومیتوں اور زبانوں کے لوگ آباد ہیں اس لیے ہر طرف رنگا رنگی نظر آتی ہے۔ رنگوں کا یہ امتزاج نہ صرف خوبصورتی کا اظہار ہے بلکہ اسے زندگی اور زندہ دلی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے بمبئی کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ بمبئی میں پارسی مرد اور عورتیں انتہائی خوبصورت، گورے رنگ اور مالدار ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا تعلق آتش پرست زرتشت کی امت سے ہے۔ یہاں کی عمارات نہایت اونچی اور دیواروں میں بے شمار کھڑکیاں بنی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بمبئی شہر میں ایک جزیرہ بھی ہے اسے ایک بند باندھ کر براعظم ہند سے بلایا ہوا ہے۔ یہاں کی عورتیں اپنی ساڑھی کو اس طریقے سے باندھتی ہیں جس طرح مرد حضرات اپنی دھوتی پہن کر اس کو پیچھے کی طرف سے گانٹھ لگاتے ہیں اور ان کی آدھی پنڈلیاں کھلی رہتی ہیں۔ یہاں ہندوؤں کی پگڑیاں بھی بڑی بڑی اور لمبی لمبی ہوتی ہیں ایسے لگتا ہے جیسے سر پر ٹوکرا رکھا ہو۔[9] بمبئی کے لیے "ملنگ پٹ" کے اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ یہ ایک استعاراتی اصطلاح ہے۔ بمبئی بھارت کا سب سے زیادہ گنجان آباد شہر ہے۔ یہ شہر مختلف قومیتوں، ثقافتوں اور زبانوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے یہ شہر ایک خوبصورت حیاتیاتی ماحول کا مرقع ہے۔ بمبئی کے لیے "ملنگ پٹ" کے اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ یہ شہر کثیر الثقافتی عناصر سے مل کر ایک شاندار اور رنگین معاشرتی ڈھانچہ تشکیل دیتا ہے۔ اس شہر میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں جن میں ہندو، مسلمان عیسائی، سکھ، پارسی اور جین مت کے ماننے والے شامل ہیں۔ یہاں پر مختلف زبانوں کا گلدستہ بھی آباد ہے، جیسے گجراتی، مرہٹی، اردو، تمل، تیلگو، ہندی اور انگریزی وغیرہ۔ یہاں دنیا کے سب سے بڑی فلم انڈسٹری ہے جسے "بالی وڈ" کہا جاتا ہے ۔ یہاں پر مختلف آرٹ گیلریز اور تھیٹر موجود ہیں۔ یہ مضبوط ثقافتی مرکز ہے یہاں مختلف مذاہب کے لوگ اپنے تہوار بڑی دھوم دھام اور مذہبی جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ اس کے مخصوص کھانے اور فوڈ سٹریٹ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری لکھتے ہیں کہ ہمیں گرفتار کر

کے "کالا پانی" لے جانے کے لیے بمبئی میں بحری جہاز کے ذریعے لایا گیا۔ بمبئی کا اقتصادیات اور سیاسیات کے حوالے سے کوئی ثانی نہیں۔ ان کے سارے دوست رد استعماری تہذیبی شعور ایک متنوع تحریک تھی جس نے اس شہر کے سیاسی، تعلیمی، ثقافتی، سماجی اور ادبی حلقوں میں بیداری اور مزاحمت کو پروان چڑھایا اور یہی شعور بعد میں استعمار کے خلاف عوامی بیداری کا سبب بنا۔ جس میں مختلف سماجی، سیاسی اور ثقافتی عوامل شامل تھے۔ اس شہر نے استعمار کے خلاف بہت سارے سیاسی لیڈران مہیا کیے۔ جن میں مہاتما گاندھی، بال گنگا دھر تلک، دادا بھائی اور نوروجی وغیرہ شامل تھے۔ جنہوں نے عوامی رابطہ مہم کے ذریعے عوام الناس میں استعمار کے خلاف مزاحمتی شعور بیدار کیا۔ بعد میں برصغیر کی آزادی کی جدوجہد ہیں بمبئی قومی تحریک کا ایک اہم مرکز بنا۔ تعلیمی اداروں اور ادبی حلقوں میں برطانوی استعمار کے خلاف عوامی شعور بیدار ہوا۔ مختلف زبانوں میں کہانیاں، نظمیں، مضامین اور عوامی ریلیوں میں حب وطنی اور آزادی کا رنگ غالب رہا۔ فنون لطیفہ مزاحمت کی دیوار بن گیا۔ رسائل و جرائد نے عوام کو اس تحریک سے جوڑ دیا۔ استعمار زدہ کے حقوق کی بات کی گئی۔ سماجی امتیاز کو ختم کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے سے کم اور آہستہ آہستہ یہ معاشرہ خود مختاری اور مساوات کی طرف بڑھنے لگا۔[10]

سماج ایک مربوط نظام ہے۔ جو افراد کے درمیان باہمی تعلقات پر مبنی ہوتا ہے یہ نظام مختلف عناصر اور عوامل پر مشتمل ہونے کے ساتھ جو انسانوں کو ایک ساتھ زندگی گزارنے، کام کرنے اور ترقی کی منازل طے کرنے میں مدد و معاون ہے۔ جب قیدیان کو صدر مقام پورٹ بلیر پہنچا دیا گیا۔ تو وہاں کے مناظر قابل دید تھے۔ آگ کے شعلے اگلتا ہوا ایک گندھک کا پہاڑ، سوائے سور کے کسی چرند پرند کا نام و نشان نہ تھا۔ جنگل ہی جنگل تھا اور کئی قسم کے پائیدار اور قیمتی درخت، سپیاں، مختلف رنگوں کے قیمتی عقیق، رنگ برنگی کوڑیاں، آم، جامن، املی، ناریل اور پان وغیرہ سب وافر مقدار میں موجود تھے جو کہ بطور تحفہ مختلف ملکوں کو بھیجی جاتی تھیں۔ جزیرے کی آب و ہوا اب صحت بخش تھی۔ نام مکی نہ مچھر اور نہ ہی سردی تھی۔ سانپ اور بچھو تو تھے لیکن زہریلے نہ تھے۔[11] اس جزیرے کی معاشرت نے انہیں ایک بنیادی اکائی بنا دیا۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری نے

قید کے دوران ہی انگریزی سیکھی۔ انہوں نے انگریزوں اور دوسرے لوگوں کو فارسی ،اردو سیکھائی اور انگریزی میں ترجمہ کر کے اس میں خوب مشق حاصل کی۔ جس کی وجہ سے وہ ماہر ہو گئے اور انہیں بہت ساری مراعات حاصل رہیں اور انہوں نے فعال زندگی گزاری اورانہیں وہاں پر ہم عقیدہ اور روحانی مصاحبین میسر آئے۔ وہاں اپنے مذہب کے مطابق شادیاں کیں اور اپنے خاندان کو فروغ دیا۔ محنت اور جفاکشی سے انگریز سرکار کی ملازمت اِختیار کر کے اپنی اقتصادیات کو بہتر کیا۔ مختلف سماجی سرگرمیوں میں حصہ لیا اپنے عمل اور اخلاقیات سے لوگوں کے دل جیت کر کامیابی وکامرانی سے سرفراز ہوئے۔

جزائر انڈیمان کے مقامی قبائل کی بارہ ذاتیں ہیں اور انہیں وحشی کہا جاتا ہے۔ ہر ذات کی زبان دوسری ذات سے مختلف ہے اور یہ لوگ مخصوص مذہبی عقائد رکھتے ہیں۔ جزیرہ انڈمان کے مقامی وحشی قبائل کے تصور خدا میں کچھ پہلو مشترک دیکھے جاسکتے ہیں۔ خدا کے تصور میں وہ فطرت پرستی، روحانیت اور مخصوص مذہبی رسم ورواج کے قائل ہیں۔ ان کی زندگیوں میں فطرتی عناصر اور روحانی مخلوقات کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ان کی زندگی کے روزمرہ معاملات، سماجیات اور ثقافتی روایات میں خاصہ عمل دخل ہے۔ ان کے اہم قبائل میں اونگے، سیمٹینیلی، جاروا، اور عظیم انڈامانیز شامل ہں۔ یہ قبائل عام طور پر فطرت پرست ہیں اس لیے یہ فطرتی عناصر کی عبادت کرتے ہیں وہ اس بات کے قائل ہیں کہ خدا آسمانوں میں رہتا ہے وہی ہر ایک چیز کا خالق اور مالک ہے اور وہی سب کچھ عنایت کرنے والا ہے۔ وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا اور وہ ہمیشہ رہے گا۔ کوئی اسے دیکھ نہیں سکتا۔ اسی کے گھر سے پانی برستا اور بجلی کڑکتی ہے۔ موت وحیات کا مالک بھی وہی ہے اور وہی تحفظ فراہم کرتا ہے۔ اس کی ایک بیوی بھی ہے اور اسے بھی فنا نہیں ہے۔ اس کا درجہ خدا سے کم نہیں۔ اس کا کام سمندر میں مچھلیاں پیدا کرنا اور آسمان سے گرانا ہے۔[12] اونگے قبیلے کے لوگ پلوگا نامی خدا پر یقین رکھتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ کائنات کو بنانے والا اور اس نظام کو چلانے والا یہی ہے۔ یہ قبائل مختلف مذہبی رسومات کے ذریعے اپنے اپنے دیوتاؤں کی عبادت کرتے ہیں۔ اور ان کی عبادات عموماً رقص وسرور اور مذہبی گانوں پر

مبنی ہوتی ہیں وہ ان رسموں سے اپنے خداؤں کو خوش کرنے، برکات سمیٹنے اور برے اثرات سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جزائر انڈمان کے باسی قبائل تصور شیطان کے بھی قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سب برے کام شیطان کرواتا ہے۔ ان کے نزدیک شیطان بھی دو ہیں ایک زمین کا شیطان اور دوسرا سمندر کا شیطان۔ یہ لوگ فرشتوں کے بھی قائل ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مردوں میں بھی ہوتے ہیں اور عورتوں میں بھی ہوتے ہیں اور یہ انسانوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ لوگ بھوت پریت کے بھی قائل ہیں۔ لیکن ان کا عقیدہ ہے کہ یہ کسی نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں۔ وہ لوگ طوفان نوح کے بھی قائل ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک بہت بڑا طوفان آیا تھا جس سے ساری دنیا ڈوب گئی۔ ان جنگلیوں کے بزرگ نے ایک کشتی بنائی اور وہ ان کو سوار کر کے بہت دور بڑے پہاڑ پر جا کر رک گئی جسے جزائر انڈمان کہتے ہیں۔ ان قبائل کا تصور موت بھی الگ ہے۔ ان میں سے کچھ کا عقیدہ یہ ہے کہ آدمی مرنے سے نیست و نابود ہو جاتا ہے اور وہ دوبارہ زندہ ہونے اور آخرت کے حساب و کتاب کے قائل نہیں ہیں۔ وہ لوگ ناچتے اور گاتے ہیں ان کا نہ سر ہے نہ تال، نہ سردار ہے نہ ملاں اور وہ روپے پیسے کے قدردان بھی نہیں ہیں لیکن اخلاق، دیانت راست بازی ان کی اقدار ہیں۔ ان قبائل میں سے کچھ کا عقیدہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد روح ایک دوسرے جہاں میں چلی جاتی ہے جہاں اس کی زندگی اس کے)اعمال کے مطابق جاری رہتی ہے۔[13]

پورٹ بلئیر ایسی جگہ ہے۔ جہاں مختلف تہذیبی شعور کے لوگ آباد ہیں۔ ان کی الگ الگ شناخت بھی ہے شادی بیاہ کی رسومات بھی علاقائی رسم و رواج مختلف تہواروں کو منانے کا انداز مذہبی شناخت یقیناً مختلف ہیں۔ لیکن باہمی تعلق، میل ملاپ اور ان پروگراموں میں شمولیت سے تہذیبی آمیزش کے رنگ بھی نظر آتے ہیں اور یہ تہذیبی رنگوں کی آماجگاہ دیکھائی دیتی ہے۔[14]

مختلف قبائل، معاشرت اور ثقافت سے تعلق رکھنے والے لوگ جب آپس میں ملتے ہیں تو یہ مختلف ثقافتیں ایک دوسرے کی روایات، بود و باش، طرز زندگی اور معاشرت کو اپناتے ہیں۔ یہ آمیزش ثقافتی روایات کے تبادلے کا ذریعہ بنتی ہے جس سے معاشرتی سطح پر شائستگی، رکھ رکھاؤ، ایک دوسرے کی امداد اور باہمی احترام کے جذبات جنم لیتے ہیں۔ اور یہی ان کی شناخت بن جاتی ہے:

"کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔ تہذیب معاشرے کی طرز زندگی اور طرز فکر و احساس کا جوہر ہوتی ہے۔"[15]

- قوموں کی ترقی اور فلاح کی علامت ہیں۔ یہ صدیوں سے ہندوستان کی روایتی زندگی کی اقدار رہی ہیں۔ اور تہذیبی اقدار انہی رویوں سے پنپتی ہیں۔ اور یہی زندگی کا خاصہ ہے۔ اس کی عکاسی اس واقعے سے ہوتی ہے کہ جب لاہور میں مارشل لا کا نفاذ کر دیا گیا اور ذرائع نقل و حمل بند ہو گئے تو دیوان سنگھ اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہوا۔ قلعہ دیدار سنگھ اور کامونکی کے درمیان ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ تمام لوگ کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ ایک گھر میں مسلمان بوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ بھوک پیاس، پاؤں میں آبلے اور تھکاوٹ کے باعث دیوان سنگھ کا برا حال تھا۔ اس نے خاتون سے پانی مانگا۔ خاتون نے انتہائی لجاجت سے جواب دیا کہ یہ تمام گھر مسلمانوں کے ہیں ہندوؤں کا کوئی گھر نہیں۔ دیوان سنگھ نے جواب دیا کہ میں مسلمانوں کے گھر سے بھی کھا پی لیتا ہوں۔ خاتون نے حالت کو دیکھتے ہوئے چارپائی نکال کر دی اور مٹکے کا ٹھنڈا پانی پیش کیا۔ اور تھوڑی دیر بعد مکھن کے ساتھ لسی لے ائی۔ اس ضعیفہ نے تھوڑی دیر آرام کرنے کا کہا اور کھانا تیار کرنے کے لیے چلی گئی۔ جب کھانا پیش کیا گیا تو اس میں بینگن کی سبزی، گھر کے پراٹھے، دہی، مکھن اور لسی شامل تھے۔ جب کھانا کھانے اور آرام کرنے کے بعد دیوان سنگھ روانہ ہونے لگا تو خاتون کے پوتے کو کھیلتے ہوئے دیکھا۔ تو اسے دو روپے دینے کی کوشش کی جس پر وہ خاتون ناراض ہوئی اور اس نے کہا کہ ہم غریب ضرور ہیں لیکن روٹیاں بیچتے نہیں ہیں۔ اس خلوص اور محبت سے دیوان سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ اسے ضبط نہ کر سکا۔ اس محبت کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھا۔ یہ پنجاب کی تہذیب و ثقافت تھی جس نے اتنا عرصہ بعد بھی دیوان سنگھ کے دل میں وہ یادیں تازہ رکھیں۔[16] مرزا ہادی رسوا کا ناول "امراؤ جان ادا" 1899ء میں لکھا گیا ہے۔ اس

میں اس دور کے تہذیبی شعور کی عکاسی انتہائی عرق ریزی سے کی گئی ہے اس میں جہاں تہذیبی رکھ رکھاؤ، تعلیم وتربیت اور باہمی لحاظ ومروت کو بیان کیا گیا ہے وہاں پر سماجی مسائل اور طبقاتی تقسیم بھی واضح کی گئی ہے اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس دور میں طبقاتی تقسیم بڑھتی چلی گئی۔

استعمار کی حیلہ کاری اور رد استعمار کی جدوجہد ان کے کارناموں اور معاشی، سماجی اور مذہبی معاملات کی تفہیم سے منسلک رہی ہے اور اسے منتخب کردہ آپ بیتیوں کے تناظر میں پیش کیا گیا اور اسے تقویم کے آئنیہ میں رد استعماری تاریخی پس منظر دیکھا گیا جس نے اس تاریخی فہمائش کو مزید آسان کر دیا۔ استعمار کا رداستعماری قوتوں کے ساتھ سامنا ازل سے ہے لیکن یہ تاریخی کہانی ان آپ بیتیوں میں 1857ء کی جنگ آزادی سے شروع ہوتی ہے اور جس نے ایک نئی تاریخ رقم کر کے اس صنف کو اعزاز بخشا اور یہ برطانوی استعمار کے خلاف استعارہ بنی۔ سیپی"Sepoy " ایک فوجی اصطلاح ہے جو ہندوستان کے فوجیوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو برطانوی استعماری فوج کا حصہ تھے۔ برطانوی استعمار کے خلاف یہ ایک بہت بڑا احتجاج تھا۔ جنگی وجوہات و محرکات کچھ اس طرح تھیں:

- سیپی"Sepoy"کی جنگ نے استعمار زدہ کے اندر قومیت کے احساس کو فروغ دیا اور مذہب، ثقافت میں تبدیلی اور روایات کی بے توقیری نے استعمار کے خلاف متحد کیا۔
- فوجیوں نے کئی بار حکام بالا سے شکایت کی کہ بندوق کی گولیوں کے اوپر چربی ہے جو کہ مذہبی لحاظ سے اگر گائے کی چربی ہے تو ہندوؤں کے لیے ممنوع ہے اور اگر سئور کی چربی ہے تو مسلمانوں کے لیے ممنوع ہے اس لیے اس کا کوئی حل تلاش کیا جائے لیکن برطانوی استعمار نے اس پر توجہ نہ دی۔ آخر کار ہندوؤں اور مسلمانوں نے برطانوی استعمار کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔
- مقامی فوجیوں کی مراعات انتہائی کم تھیں اور سازوسامان بھی معیاری نہ تھا بلکہ ناقص تھا جس کی وجہ سے عرصہ سے فوج میں بے چینی تھی۔

- برطانوی استعمار کی معاشی پالیسیاں استعمار زدہ کے لیے معاشی قتل کے برابر تھیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے مختلف قوانین اور پالیسیوں کو نافذ کر رکھا تھا۔ جس پر عمل درآمد نہ کرنے کی صورت میں بڑے جرمانے اور سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔
- مقامی تجارتی اداروں اور صنعتوں کو برطانوی استعمار کی پالیسیوں سے نقصان پہنچا۔
- زراعت پر بھاری ٹیکسوں کا بوجھ ڈالا گیا جس سے کسان کی مالی حالت متاثر ہوئی۔
- سماجی سطح پر مذہبی و ثقافتی آمیزش کی گئی جسے ہندوؤں اور مسلمانوں نے قبول نہیں کیا بلکہ ان کے جذبات کو مزید مجروح کیا۔

یہ تمام محرکات 1857ء کی جنگ آزادی کا باعث بنے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے نزدیک یہ آزادی کی جنگ تھی جبکہ استعمار اسے بغاوت تصور کرتا تھا۔ اس نے اپنی بھرپور طاقت سے 1857ء کی بغاوت کو کچل دیا گیا اور 1858ء میں برطانوی استعمار نے ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ کرتے ہوئے ہندوستان میں براہ راست حکمرانی کا آغاز ملکہ وکٹوریہ کے اعلان سے کیا۔ 1857ء کی جنگ آزادی کو اس بے دردی سے کچلا گیا۔ اس کی فضائیں ڈری اور سہمی سی ہو گئیں۔ خونچکاں واقعات اور برطانوی استعمار کا رویہ مستقبل کی پیشگوئی کر چکا تھا کہ استعمازدہ خواب غفلت سے بیدار ہو چکا کیونکہ اس کی برداشت جواب دے چکی تھی اور وہ بغاوت کی طرف بڑھ رہا تھا اس کا مظاہرہ 1886ء میں کانگرس کے قیام کی صورت میں نظر آیا جسے استعمار زدہ کے تمام طبقات کی نمائندگی کا حق حاصل تھا۔ ہندوستان میں استعمار زدہ کی مذہبی اور ثقافتی شناخت کو مجروح کیا گیا کانگرس کا قیام استعمار زدہ کا سیاسی شعور تھا کہ وہ اس پلیٹ فارم پر متحد ہوئے۔ استعمار اپنی پوری مکاری کے ساتھ مصروف عمل تھا جس نے 1905ء میں تقسیم بنگال کی کیونکہ برطانوی استعمار کی اس تقسیم کے حوالے سے بھی سیاسی، معاشی اور سماجی محرکات نظر آتے ہیں۔ مشرقی بنگال مسلمانوں کا اکثریتی علاقہ جبکہ مغربی بنگال ہندوؤں کا اکثریتی علاقہ تھا۔ سیاسی طور پر ان دونوں مذاہب کو الگ کرنا تھا۔ تاکہ ان کا اتحاد ختم ہو ان میں تفرقہ پیدا کرنے کی خاطر اس میں ہندو مسلم کا فرق ڈالا گیا تاکہ قومی تحریکوں کو کمزور کیا جاسکے۔ برطانوی استعمار نے اپنی معیشت اور انتظامی مسائل کو حل کرنے کی خاطر اس کی تقسیم کی۔ لیکن اس تقسیم پر احتجاج کیا گیا جس کے نتیجے میں

1911ء میں تقسیم بنگال کو واپس لے لیا گیا۔ لیکن اس سیاسی عمل نے ہندوستان میں ایک خلفشار پیدا کر دیا اور سماجی سطح پر اضطراب کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ ہندو برادری نے اس کے خلاف بھرپور پروپگنڈا کیا لیکن مسلمانوں کی طرف سے ایک طبقہ اس کا حامی رہا۔ مسلمانوں میں اس پر رد عمل جزوی رہا جبکہ کانگرس نے اس پر بھرپور احتجاج کیا۔

برطانوی استعمار نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی اختلافات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جس پر مسلمانوں نے اپنے سیاسی مفادات کی حفاظت اور مذہبی معاملات کے تحفظ کے لیے الگ پلیٹ فارم کی ضرورت کو محسوس کیا۔ جس پر مسلمانوں نے اپنی الگ جماعت مسلم لیگ کے نام سے 1906ء میں قائم کی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ کانگریس کا جھکاؤ ہندوؤں کی طرف زیادہ ہے اور وہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت نہیں لیکن معتدل طبقہ کانگرس کا حامی رہا۔ جب مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تو مسلمانوں نے ایک نئے اور الگ زاویہ نگاہ سے دیکھنا شروع کیا اور برطانوی استعمار اور ہندوؤں کے خلاف اپنی سعی پیہم کا آغاز کیا۔ یہ دور قومی اور بین الاقوامی لحاظ سے بھی ہنگامہ خیز رہا۔ 28 جولائی 1914ء کو پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی اور 11 نومبر 1918ء تک جاری رہی۔ برطانوی استعمار نے ہندوستانی رہنماؤں سے مشورہ کیے بغیر اس کے تمام وسائل کو جنگ میں جھونک دیا۔ جس پر کانگرس نے عدم تعاون کی تحریک چلائی۔ 25 اکتوبر 1917ء کو روس میں انقلاب آیا جس نے پوری دنیا کا متاثر کیا۔ کارل مارکس کے نظریات کے تحت لینن کا روس میں انقلاب بپا کرنا پوری دنیا میں جبر و استبداد اور استحصالی قوتوں کے خلاف برسرپیکار تحریکوں کے لیے روشنی کی کرن بنا۔ کارل مارکس کے افکار و نظریات نے باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔

1919ء میں رولٹ ایکٹ نافذ کیا گیا جس کے تحت استعمار زد کے بنیادی حقوق سلب کر لیے گئے۔ اس قانون کے تحت کسی بھی شخص کو بغیر مقدمے کے قید کرنے کا اختیار گورنمنٹ کو حاصل ہوا اور اسے کسی بھی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے 13 اپریل 1919ء کو جلیاں والا باغ میں بیساکھی منانے اور رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کے لیے ایک جلسے کا انعقاد کیا گیا لیکن برطانوی استعمار نے اس جلسے کو خاک و خون کر دیا۔ اس سانحہ نے استعمار زدہ کے اندر اپنے حقوق کی جنگ کو مزید تیز کر دی اور برطانوی استعمار کے

خلاف نفرت کو ابھارا۔ اسی طرح 1919ء 1924ء تک تحریک خلافت چلائی گئی۔ تحریک خلافت کی بنیاد گذاروں میں جوہر برادران تھے اور اس تحریک کا مقصد سلطنت عثمانیہ کی حمایت، دفاع اور برطانوی استعمار کے خلاف احتجاج بھی تھا۔ اس تحریک نے مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد پیدا کیا اور گاندھی جی نے بھی اس کی حمایت کی اور اسے قومی تحریک کے ساتھ وابستہ کیا۔ اس حمایت سے استعمار زدہ کے درمیان یکسوئی دیکھنے میں آئی۔ 1919ء جس پر گاندھی جی نے سول نافرمانی "Non Obedience Movement" کی تحریک شروع کی۔ جس کے تحت برطانوی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا گیا اور مقامی مصنوعات کی ترجیحی بنیادوں پر حوصلہ افزائی کی گئی۔ بالآخر جنگ عظیم اول میں عثمانی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔ جس سے مسلمانوں میں غم و غصہ کے ساتھ تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ 1924ء میں خلافت عثمانیہ کا باضابطہ طور پر خاتمہ کر دیا گیا اور کمال اتاترک نے سیکولر حکومت قائم کی۔ اس کے ساتھ ہی تحریک خلافت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

1920ء سے 1922ء تک تحریک عدم تعاون "Non-cooperationMovement" کی تحریک چلی۔ برطانوی استعمار کے خلاف گاندھی جی نے اس تحریک کا آغاز کیا کیونکہ برطانوی استعمار نے مونٹگمری چیلمس فورڈ ریفارمز کے تحت ہندوستان میں محدود خود مختاری دی جس پر ہندوستانی زعماء نے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے اسے ناکافی قرار دیا اور ساتھ ہی 1920ء کی دہائی میں ہندوؤں کی یکجہتی اور مذہبی تہذیب و ثقافت اور شناخت کو پروان چڑھانے کے لیے شدھی تحریک چلائی گئی جس کا مقصد مسلمانوں کو ہندو بنانا تھا اس تحریک کے علمبرداروں میں مہاراجہ چکراوتی، سوارا جی برادری اور ہندو مہاسبا کی قیادت شامل تھی۔ اسی عرصہ میں سنگٹھن تحریک کی بھی بنیاد رکھی گئی جس کا مقصد ہندوؤں کو عسکری سطح پر مضبوط کرنا تھا تاکہ وہ معاشرتی سطح پر مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو دبایا جا سکے۔

1923ء میں فضل حسین جو وائسرائے ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے اور چھوٹو رام کی قیادت میں یونینسٹ پارٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس پارٹی میں ان لوگوں کو مدعو کیا گیا جو مختلف طبقات سے تعلق رکھنے کے ساتھ برطانوی استعمار کے خیر خواہوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے پیش نظر اس کا یہ حل سوچا گیا۔ دوسری طرف مسلمانوں اور ہندوؤں میں خلیج پیدا کی

گئی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی اور سیاسی تناؤ کی وجہ بنی۔ اس کے باعث 1927ء اور 1928ء کو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ 1927ء کے فسادات دہلی جبکہ 1928ء کے فسادات پنجاب اور اتر پردیش کے علاقوں میں ہوئے۔ جنہوں نے ایک نزاعی کیفیت پیدا کی۔

برطانوی استعمار نے آئینی اصلاحات کا جائزہ لینے کے لیے "سائمن کمیشن" برطانوی پارلیمنٹ کے رکن سر جان سائمن کی سربراہی میں 1927ء میں دہلی بھیجا۔ اس کمیشن میں مقامی نمائندگی نہ ہونے کی وجہ سے ہندوستان کی جماعتوں نے اسے غیر نمائندہ قرار دے کر اس کا بائیکاٹ کیا اور ہندوستان کے گلی کوچے سراپہ احتجاج بنے لیکن اس نے مختلف شہروں کا دورہ کیا اور اپنی رپورٹ مرتب کی اور چلا گیا۔

1928ء میں نہرو رپورٹ پیش کی گئی جس میں پنڈت جواہر لال نہرو نے خود مختاری کے متعلق بات کی لیکن 1929ء میں قائد اعظم نے 14 نکات پیش کیے جس میں سیاسی معاملات کے ساتھ مسلمانوں اور تمام اقلیتوں کے حقوق کے متعلق بات کی گئی۔ یہ دستاویز مسلمانوں کے حقوق اور ملکی سیاست کا دیباچہ تھا۔ برطانوی استعمار کے خلاف جگہ جگہ جلسے جلوس اور تقاریر کا سلسلہ پہلے سے ہی جاری تھا جس پر استعماری پولیس نے لالہ لجپت رائے پر تشدد کیا اور وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چند دن بعد ہلاک ہو گئے۔ لالہ لجپت رائے کی موت کا بدلہ لینے کے لیے سپرنٹنڈنٹ پولیس جیمز اے اسکاٹ کے قتل کی منصوبہ بندی کی گئی لیکن بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے غلط فہمی میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس جان سانڈرس کو قتل کر دیا۔ اس قتل کی وجہ سے ہندوستان کی سیاسی صورتحال مزید خراب ہو گئی۔

31 دسمبر 1929ء کو دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا اور اس میں برطانوی استعمار سے مکمل خود مختاری کا مطالبہ کیا گیا اور یہ مطالبہ آنے والے وقتوں میں تسلیم کیا گیا اور کشمیر کی آزادی کے لیے مختلف اوقات میں جدوجہد جاری رہی جسے 16 مارچ 1846ء کو برطانوی استعمار نے 75 لاکھ نانک شاہی کے عوض راجہ گلاب سنگھ کو فروخت کر دیا تھا لیکن یہ قضیہ مسلمانوں کے دلوں میں سوئی کی طرف پیوست تھا۔ 13 جولائی 1931ء کو کشمیر کی جامع مسجد میں ایک بہت بڑا اجتماع منعقد کیا گیا جس میں کشمیر کی آزادی اور استعماری چالوں کے حوالے سے بات کرتے ہوئے انہیں آشکار کیا گیا جو کہ برطانوی استعمار کی ناراضگی کا سبب بنا جس پر جامع

مسجد میں مسلمانوں پر فائرنگ کر دی گئی جس کے نتیجے میں 22 کشمیری مسلمان شہید اور بہت سارے زخمی ہوئے۔ یہ سانحہ اتنا اندوہناک تھا کہ جس نے ہندوستان کی فضا کو مکدر کر دیا۔

1929ء کو مجلس احرار الاسلام کی بنیاد رکھی گئی اور اس کے پہلے صدر مولانا محمد علی جوہر تھے اور یہ برطانوی استعمار کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوئی۔ اس نے مسلمانوں کے حقوق اور خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ 31 اکتوبر 1929ء کو غازی علم دین کو لاہور جیل میں پھانسی دے دی گئی۔ لاہور اس وقت پنجاب کا صدر مقام تھا کیونکہ ایک ہندو پبلشر راجپال نے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی توہین کی تھی جس کی وجہ سے غازی علم دین نے اسے قتل کر دیا۔

1930ء سے 1932ء کے درمیان تین گول میز کانفرنسیں منعقد کی گئیں اور اس میں ہندوستان کی نمائندگی چوہدری ظفر اللہ خان نے کی۔ پہلی گول میز کانفرنس بغیر نتیجے کے ختم ہو گئی جبکہ دوسری اور تیسری کانفرنسوں میں آئینی اصلاحات اور خود مختاری پر بات آگے بڑھی۔ مارچ 1930ء کو سول نافرمانی تحریک کا دوبارہ سے آغاز کر دیا گیا۔ اس تحریک کا اختتام مئی 1934ء میں ہوا۔ 5 مارچ 1931ء کو گاندھی ارون معاہدہ ہوا۔ مطالبات کی منظوری کی یقین دہانی پر سول نافرمانی تحریک کا خاتمہ ہوا، قیدیوں کی رہائی ممکن ہوئی، نمک پر سے پابندی اٹھالی گئی اور آئینی اصلاحات پر غور کے لیے رضامندی ظاہر کی گئی۔ 1932ء کو سری نگر کے مقام پر مولوی غلام محمد کی سربراہی میں جموں کشمیر مسلم کانفرنس بنائی گئی اس کا مقصد کشمیری مسلمانوں کے حقوق اور ان کی نمائندگی کرنا تھا۔ جب برطانوی استعمار نے اصلاحات کے لیے مذاکرات کی پیشکش کی۔ برطانوی پارلیمنٹ نے 1935 کا گورنمنٹ ایکٹ آف انڈیا منظور کیا۔ اس قانون میں استعمار زدہ کو کچھ خود مختاری فراہم کی گئی لیکن مکمل کنٹرول استعمار کے ہاتھ میں رہا۔ ہندوستانی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ ایک اہم سیاسی قدم تھا۔ 1935ء کو تحریک مسجد شہید گنج شروع کی گئی اور 1925ء میں گردوارہ ایکٹ بنا جس کے تحت اس کی ملکیت سکھوں کے نام کر دی گئی۔ جس پر برطانوی عدالت نے مسجد شہید گنج پر مسلمانوں کی ملکیت کو مسترد کر دیا۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں میں شدید غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور اس پر مسلمانوں نے شدید رد عمل دیکھایا۔

مسجد شہید گنج کے قضیہ پر راولپنڈی میں "مجلس اتحاد ملت" کے نام سے ایک نئی تنظیم بنائی گئی اس کے سربراہ پیر جماعت علی شاہ تھے اور مسجد کے حصول کے لیے کوششوں کو مزید تیز کر دیا گیا لیکن یہ معاملہ لاحاصل رہا۔ 1936ء میں محلہ سمیاں بھاٹی دروازہ مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ یہ مسلمانوں کا اکثریتی علاقہ تھا اور اس میں ایک ہی گردوارہ تھا سکھ برادری کی یہ شکایت تھی کہ مسلمان انہیں مختلف بہانوں سے تنگ کرتے ہیں جس کا ثبوت انہوں نے گردوارہ میں اکٹھے کیے گئے اینٹوں اور پتھر دکھا کر دیا لیکن مسلمان اس بات سے انکاری تھے پولیس چاہتی تھی کہ بہت بڑا دنگا ہو اور گولی چلانے کے احکامات صادر کر دیے گئے لیکن حالات کی نزاکت کے پیش نظر سپرنٹنڈنٹ پولیس نے اس صورتحال کو انتہائی مہارت سے قابو میں کیا اور اس نزاعی کیفیت سے نجات دلائی۔

مارکسی افکار و نظریات ایک باقاعدہ تحریک کی شکل میں ہندوستان میں 1936ء میں کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا کے قیام پر پروان چڑھے حالانکہ یہ نظریات 1920ء کی دہائی سے چلے آرہے تھے۔ اس کے علمبرداروں میں منموہن سنگھ، ساؤتری بائی پھولے اور دیگر رہنما شامل تھے۔ مزدوروں اور کسانوں کی حالت زار نے مارکسی نظریات کو ہندوستان میں پھلنے پھولنے کا موقع دیا جس سے ہندوستانی سیاسی تاریخ میں ایک نئے نظریہ مارکسیت کا اضافہ ہوا اور یہ تحریک ترقی پسند تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ 1937ء کو صوبہ جاتی خود مختاری کے لیے سیاسی بنیادوں پر انتخابات کروائے گئے جس میں کانگرس نے واضح اکثریت حاصل کی۔ یہ انتخابات ہندوستانی سیاست میں ایک اہم قدم تھا جسے اٹھانے کی استعمار نے اجازت دی لیکن یہ ہندوستانی سیاست میں استعمار زدہ کی پہلی بار سیاسی میدان میں کامیابی سمجھا جا سکتا تھا حالانکہ مکمل کنٹرول برطانوی استعمار کے پاس ہی تھا۔

دوسری جنگ عظیم ستمبر 1939 سے دسمبر 1945 تک یہ جاری رہی۔ یہ جنگ دو بین الاقوامی گروہوں کے درمیان اپنے اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے لڑی گئی۔ یہ جنگ تباہی و بربادی کے ساتھ بہت بڑی تبدیلی لائی اور مختلف ممالک کی آزادی کا پیش خیمہ بنی۔ 22 دسمبر 1939ء کو کراچی میں قائد اعظم نے آل انڈیا مسلم

لیگ کا اجلاس بلایا اور اس اجلاس میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اور سیاسی حکمت عملیوں کو عملی جامہ پہنانے کا عزم کیا گیا۔ قائد اعظم نے اس دن کو یوم نجات کا نام دیا اور یہ ہر سال علامتی طور پر منایا جاتا ہے۔

23 مارچ 1940ء کو منظور کردہ قرارداد لاہور میں قائد اعظم محمد علی جناح نے دو قومی نظریہ پیش کیا اور واضح طور پہ بتایا کہ ہندوستان میں دو قومیں آباد ہیں ان کی مذہبی، ثقافتی اور سماجی شناخت مختلف ہیں اس لیے ان کا ایک جگہ اکٹھے رہنا مشکل ہے جس کی بنیاد پر انہوں نے الگ وطن کا مطالبہ پیش کیا۔ جو پاکستان کے قیام کی وجہ بنا۔ 19 مارچ 1940ء کو خاکسار تحریک کے سالار علامہ مشرقی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی خاکسار پریڈ پر ملاقات ہوئی جس میں دونوں رہنماؤں نے یکجہتی کا اعلان کیا اور ہندوؤں، مسلمانوں کے درمیان بہتر تعلقات کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے ہندوستانی قوم کی ترقی اور آزادی کے لیے مشترکہ لائحہ عمل اختیار کرنے کی کوششوں کا اعادہ کیا۔ گو کے بعد میں ان کے اختلافات کی وجہ سے سیاسی تناؤ پیدا ہوا۔ 8 اگست 1942ء کو کانگرس نے سیاسی اور اقتصادی حقوق کے لیے برطانوی استعمار پر دباؤ برقرار رکھا اور آزادی کے لیے "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کا آغاز کر دیا جس پر برطانوی استعمار نے سختی کے ساتھ اس تحریک سے نپٹنے کی کوشش کی اور بہت سارے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا جس نے اس تحریک میں نئی روح پھونک دی اور اس کے بعد یہ تحریک بڑھتی ہی چلی گئی یہاں تک کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی۔

1942ء کو اسٹیفورڈ کرپس پھر آئینی اصلاحات کے حوالے سے کچھ تجاویز لے کر دہلی پہنچے جسے مسلم لیگ نے یکسر مسترد کر دیا لیکن وہ اپنے مشن پر عمل پیرا رہے اور مختلف طبقات سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ 1942ء کو سبھاش چندر بوس نے انڈین نیشنل آرمی کی بنیاد سنگاپور میں رکھی اور یہ فوج جاپانیوں کی مدد کے لیے تیار کی گئی تھی لیکن 1943ء میں آزاد ہند فوج نے ہندوستان میں بھی اپنی تنظیم سازی کی اور اپنے معاملات کو آگے تک بڑھاتے گئے یہاں تک کہ کانگریسی حکومت بننے کے بعد یہ وزیر داخلہ بھی رہے اور انہوں نے تمام معاملات کو اپنے کنٹرول میں لیا جس سے برطانوی استعمار کی گرفت برصغیر پر کمزور پڑ گئی۔ 1943ء میں ہی برطانوی استعمار نے اٹلی پر حملہ کر دیا اور اٹلی کو شکست دی۔ 25 جولائی 1943ء کو مسولینی کی فاشسٹ حکومت کا خاتمہ کیا اور اتحادیوں نے بعد میں مختلف حملوں سے اٹلی پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا۔

1946ء میں فرنڈم کے ذریعے بادشاہت کا خاتمہ کر کے جمہوری حکومت بنادی گئی اور نظام حکومت ان کے حوالے کر دیا گیا۔

26 جنوری 1945ء کو لیاقت ڈیسائی سمجھوتا ہوا۔ کانگرس اور مسلم لیگ کی قیادت نے متناسب نمائندگی کی بنیاد پر مشترکہ حکومت سازی پر اتفاق کیا لیکن بعد میں برطانوی استعمار نے اسے مسترد کر دیا۔ لارڈ ویول کی قیادت میں 25 جون 1945ء کو شملہ کانفرنس مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان ہوئی. جس میں قائد اعظم اور مولانا ابو الکلام آزاد کے درمیان عبوری حکومت پر بات ہوئی لیکن اختلافات کی بنیاد پر یہ کانفرنس ناکام ہوئی۔ وائسرائے ہند لارڈ ویول نے 1945ء میں ہندوستانی رہنماؤں کے درمیان اختلافات کو حل کرنے کے لیے ایک پلان پیش کیا۔ جس کے تحت مسلم لیگ کے مطالبے اور صوبائی خود مختاری کو مان لیا گیا اور وفاقی حکومت کا منصوبہ پیش کیا گیا جس میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم اور ہندوستانی حکومت کو زیادہ خود مختاری دینے کا وعدہ کیا گیا لیکن مسلم لیگ اور کانگرس نے اسے جزوی طور پر قبول کیا۔

1945ء کو جرمنی نے اتحادی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے جس کی وجہ سے جرمنی کے حصے بخرے کر دیے گئے۔ 30 اپریل 1945ء کو جرمنی کی شکست اور ذاتی تحفظ کے خدشہ کے دباؤ کی وجہ سے برلن کے زیر زمین بنکر میں ہٹر نے خود کشی کر لی۔ 1946ء میں برطانوی حکومت کی طرف سے تین رکنی وفد برطانوی وزیر ہند لارڈ پیتھک لرنس کی قیادت میں وزارتی مشن دہلی آیا۔ اس مشن کا مقصد ہندوستانی رہنماؤں اور برطانوی حکومت کے درمیان تعلقات کو خوشگوار بنانا، متفقہ آئینی ڈھانچہ تیار کرنا، انتخابات کے انعقاد کا جائزہ لینا اور ہندوستان کی آزادی کے لیے لائحہ عمل طے کرنا تھا۔ 1946ء کو برطانوی استعمار نے صوبائی اور قومی سطح پر انتخابات کروائے جس میں مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں میں مسلم لیگ نے فتح حاصل کی۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ کے مقابلے میں بڑی بڑی شخصیات آئیں اور ہار گئیں۔ ان انتخابات نے ثابت کیا کہ مسلمانوں کی نمائندگی کا حق صرف مسلم لیگ کو حاصل ہے اور وہ ہی ان کی نمائندہ جماعت ہے۔ ان دنوں مسلمانوں کا وظیفہ قائد اعظم، مسلم لیگ اور پاکستان تھا جس نے بھرپور پذیرائی حاصل کی اور پاکستان بنانے کی راہ ہموار

کی۔ ہندوستان میں 1946ء میں ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور یہ تین دن جاری رہے جس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو قتل کر دیا گیا۔ ان فسادات کو ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا دیباچہ کہا جا سکتا ہے کیونکہ استعمار اس خطے سے جانے کی تیاری کر رہا تھا اور یہ فسادات نقطہ آغاز تھا اس کے بعد ہندوستان نے اپنی آنکھوں سے وہ خونچکاں واقعات دیکھے جنہیں بیان کرنا انتہائی مشکل ہے۔ نواکھالی کی قتل وغارت گری روتی، چیختی اور بلبلاتی ہوئی انسانیت سوز مظالم کی داستان تھی۔ ان کے بعد صوبہ بہار میں فسادات شروع ہو گئے اور یہ فسادات پہلے فسادات سے زیادہ خطرناک اور انسانیت سوز تھے جسے دیکھ کر مہاتما گاندھی بھی لرزہ براندام ہو گئے۔ اور انہیں "ستیہ گری" اور "اہنسا" تعلیمات کا جنازہ نظر آیا۔

انڈین سیفٹی ایکٹ 1947ء کی تنسیخ کا مطالبہ کیا گیا کیونکہ یہ انسانی بنیادی حقوق کے خلاف تھا اس قانون میں کسی بھی شخص کو بغیر کسی عدالتی کارروائی کے گرفتار کرنا اور سزائیں دینا شامل تھا۔ اس قانون کی ستم ظریفی یہ رہی کہ اب تک اسے سیاسی مخالفین اور آزادی کے کارکنوں کے لیے استعمال کیا گیا اور اظہار رائے پر پابندی عائد کر دی گئی اس صورتحال کے پیش نظر ہندوستان کی تمام جماعتوں نے اس کی منسوخی کا مطالبہ کیا جسے منظور کر لیا گیا۔ 20 فروری 1947ء کو برطانوی وزیر اعظم لارڈ ٹیلیگھن نے اعلان کیا کہ وہ ہندوستان کی خود مختاری کا طریقہ کار طے کرے گی۔ ان کے اس بیان سے آزادی کی تحریکوں میں مزید تیزی آگئی جس سے وائسرائے ہند لارڈ ویول اور برطانوی وزیر اعظم کے اختلافات بڑھ گئے جس پر لارڈ ویول کو مستعفی ہونا پڑا۔ ان کی جگہ پر 22 مارچ 1947ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن مکمل اختیارات کے ساتھ گورنر جنرل بنے اور 8 مئی 1947ء کو برطانوی حکومت سے آگاہی کے لیے لندن گئے اور 31 مئی 1947ء کو تقسیم ہند کا منصوبہ لے کر واپس آئے اور 3 جون 1947ء کو یہ منصوبہ پیش کیا۔ اس منصوبے کے تحت ہندوستان کو دو آزاد ممالک میں تقسیم کیا جانا تھا۔ اس منصوبے کے تحت 15 اگست 1947ء کو دونوں ممالک کو آزادی نصیب ہوئی اور علاقائی تنازعات کو حل کرنے کے لیے سر سائرل ریڈکلف مشن مقرر کیا گیا تاکہ دونوں ممالک کے سرحدی تنازعات کو حل کیا جا سکے لیکن دونوں ممالک کی حدود کے تعین کا اعلان 17 اگست 1947ء کو ریڈکلف نے کیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد 25 اپریل 1945ء کو امریکہ میں 50 ممالک کی نمائندگی سے اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس ادارے کا مقصد حقوق انسانی کا تحفظ، ممبر ممالک کی معیشت کو ترقی دینا اور دنیا میں امن وسلامتی قائم رکھنا تھا۔ اسرائیل کا قیام بھی 14 مئی 1948ء کو اقوام متحدہ کے منظوری کے ساتھ عمل میں آیا اور پھر 29 نومبر 1947ء کو فلسطین کی تقسیم کا منصوبہ پیش کیا گیا اور اس کی منظوری دی گئی یعنی فلسطین کو دو ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا جس میں ایک عرب ریاست اور دوسری یہودی ریاست بنی اور یورشلم کو بین الاقوامی شہر کا مرتبہ دیا گیا۔ اس طرح مسلمانوں کے سینے میں خنجر گھونپا گیا۔

طاقتور اقوام آج بھی ترقی پذیر ممالک کا استحصال جاری رکھے ہوئے ہیں لیکن اس کا طریقہ کار مختلف ہے۔ یہ بین الاقوامی سطح پر مختلف تبدیلیوں کے ساتھ آج بھی اپنی حیلہ کاریوں کے ساتھ کار فرما ہے۔ اول: طاقت کا خمار اور اسے متوازن رکھنے کے لیے مختلف اقدامات کرنا تاکہ اس کی شناخت عالمی سطح پر قائم رہے۔ دوم: بین الاقوامی اداروں کی مضبوطی جو اس کی اپنی سلامتی، طاقت میں اضافہ اور معاشی سطح پر مضبوطی کا باعث ہوں ان کا دفاع شامل ہے۔ سوم: مختلف ممالک کے درمیان باہمی تعلق اور تعاون کو مزید وسعت دینا تاکہ انہیں کسی وقت بھی اپنا حلیف قرار دیتے ہوئے ساتھ رکھا جائے۔ یہ وہ نظریات ہیں جنہیں عالمی سطح پر کنٹرول کے زمرے میں دیکھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔ ان کی امثال میں اقوام متحدہ، ورلڈ بینک، سلامتی کونسل اور نیو ورلڈ آرڈر وغیرہ جیسے ادارے اور احکامات شامل ہیں۔ اس سیاسی و معاشرتی نظریہ کو نئی نو آبادیاتی تھیوری "Neo-colonialism Theory" کا نام دیا جاتا ہے۔ جدید دنیا میں جدید طریقوں سے طاقتور اقوام یا کارپوریشنیں یا بڑی ملٹی نیشنل کمپنیز یا ادارے ترقی یافتہ ممالک کا معاشی، معاشرتی اور ثقافتی استحصال جاری رکھے ہوئے ہیں اور اپنے مفادات کو براہ راست کنٹرول کرنے کی بجائے بین الاقوامی بنائے گئے اداروں کے دباؤ سے کیا جاتا ہے جن کا تذکرہ مذکور ہے۔ جو ترقی پذیر ممالک کی معیشت پر ان اداروں کے ذریعے براہ راست اثر انداز ہوا جاتا ہے جس سے ان ممالک کے عمومی اور بنیادی پالیسیوں میں دخل اندازی کی جاتی ہے اور وہ ممالک اس حد تک مجبور ہوتے ہیں کہ انہیں ان کی شرائط کو بلا چوں چرا ماننا پڑتا ہے اور ان کی مکاری کا یہ

جال دن بدن ترقی کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات ان ممالک کی سلامتی کے معاملات انہیں درپیش ہوتے ہیں۔

باب چہارم

حوالہ جات

1. محمد جعفر تھانیسری، ڈاکٹر ،"کالا پانی المعروف تواریخ عجیب "، محمدن اینگلو اورینٹل پریس، لاہور،1879ء،ص:39-40
2. حسرت موہانی، مولانا،"قید فرنگ"،کتب خانہ اردوئے معلی،کانپور،1929ء،ص:41
3. ایضاً،ص44
4. ایضاً،ص45
5. ایضاً،ص116
6. فاروق عثمان ڈاکٹر،"اردوناول میں مسلم ثقافت"بیکن بکس,ملتان،2003ء،ص:310
7. حسرت موہانی، مولانا،"قید فرنگ"،کتب خانہ اردوئے معلی،کانپور،1929ء،ص:88-99
8. ایضاً،ص121-125
9. محمد جعفر تھانیسری، ڈاکٹر ،"کالا پانی المعروف تواریخ عجیب "، محمدن اینگلو اورینٹل پریس، لاہور،1879ء،ص:50
10. ایضاً،ص55-56
11. ایضاً،ص55-56
12. ایضاً،ص58-60
13. ایضاً،ص58
14. ایضاً،ص92
15. سبط حسن،"پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء"،مکتبہ دانیال،کراچی،2002ء،ص:17
16. دیوان سنگھ، سردار مفتون،"ناقابل فراموش"،مکتبہ جدید پریس،لاہور،1954ء،ص:172

باب پنجم ماحصل:

1۔ مجموعی جائزہ:

رد استعماریت ایک علمی نظریہ ہے جو استعماری قوتوں کے پیدا کردہ حالات و اثرات کا بغور جائزہ لے کر بعد کے پیدا کردہ حالات و واقعات کا تفصیلی مطالعہ ہے کیونکہ یہ استعماری دور کے بعد کے اثرات کا فکری جائزہ ہے جو کہ انتہائی گنجلک اور متنوع ہے اور یہ ہر علاقے کے لحاظ سے مخصوص سماجی و ثقافتی، سیاست اور معیشت کے مطابق مختلف ہوتا ہے۔ اگر نو آبادیاتی علاقوں میں استعماری اثرات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ استعمار تو چلا گیا لیکن ان نو آبادیاتی علاقوں میں اپنی باقیات چھوڑ گیا جیسے روایات، لباس، زبان، تعلیمی نظام، نسلی اور مذہبی امتیازات سیاسی سطح پر آزادی اور خود مختاری دے کر گیا لیکن حد بندی میں غیر منصفانہ اور جانب دارانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے نسلی، قبائلی اور مذہبی تنازعات کو جنم دے گیا۔ معاشرہ سیاسی ابتری اور خلفشار کی طرف چلا گیا۔ اسی طرح جمہوری حکومتیں لائی گئیں لیکن آمرانہ حکومتیں بن گئیں۔ آمرانہ حکومتیں سیاسی عدم استحکام، معاشی مشکلات اور باہمی تنازعات کی وجہ سے معرض وجود میں آئیں جن میں لاطینی امریکہ، افریقہ، ایشیا اور مشرق وسطی کے ممالک شامل ہیں۔ استعمار کے چلے جانے کے بعد معاشی بدحالی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ مقامی صنعتوں کو جان بوجھ کر بند کیا گیا تھا جس سے مقامی معیشت تباہ ہوئی۔ اب ان صنعتوں کی بحالی کے لیے سرمایہ کی ضرورت تھی۔ استعمار کی طاقت کی پالیسی کے پیش نظر بعد میں بھی معاشرتی عدم مساوات قائم رہی جس سے وسائل محدود اور انفراسٹرکچر نہ ہونے کے باعث ترقیاتی مسائل نے جنم لیا۔ بین الاقوامی سطح پر نئے اتحاد معرض وجود میں آئے اور نئے بلاک بنے۔ مابعد نو آبادیاتی نظریہ وہ فکری رجحان ہے جو رد استعماری معاشرت کا جائزہ پیش کرتا ہے۔

استعماریت وہ نظام حکومت ہے جو طاقتور اقوام کمزور علاقوں پر اپنا تسلط قائم کر کے ان کا معاشی، سیاسی اور ثقافتی سطح پر استحصال کرتے ہیں اور پھر ان ممالک کے ہر قسم کے وسائل سے بھرپور استفادہ کرتے

ہوئے اپنی معیشت کو مضبوط و مستحکم کرتے ہیں۔ استعماری نظام کے عزائم توسیع پسندانہ ہوتے ہیں۔ یہ دوسرے علاقوں پر قبضہ کرتے ہوئے اپنی نو آبادیات قائم کرتے ہوئے اس ملک کا سیاسی اور معاشی استحصال بھی کرتے ہیں ۔ استعمار ان علاقوں میں اپنی زبان، ثقافت، رسم و رواج مسلط کرتا ہے تاکہ مقامی زبان و ثقافت دب جائے۔ ادب میں استعماریت کا اندازہ ادبی تخلیقات سے لگایا جاسکتا ہے کیونکہ ان ادبی تخلیقات میں استعماریت کے اثرات کے ساتھ اس کے خلاف مزاحمت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ جس کا اظہار مختلف اصناف سخن سے ہوتا ہے جس میں آپ بیتی، ناول، افسانہ، ڈرامہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا تذکرہ کیا جاتا ہے جیسے "آزادی کی راہ پر" از مولانا ابو الکلام آزاد ، "نقش فریادی" از فیض احمد فیض, "ادھوری کہانیاں", "ٹوبہ ٹیک سنگ" از سعادت حسن منٹو, "چنگاری" از کرشن چندر، "گرداب" از سجاد ظہیر، "انگارے"، "طلسم ہوشربا" از منشی نول کشور وغیرہ ان تخلیقات کے علاوہ "افتادگان خاک" از فرانز فینن، "شرق شناسی"، "امپیریلزم" ازایڈورڈ سعید, "The location of culture" از ہومی کے بھابھا، "Can the Subaltern Speak?" از گیاتری چکرورتی وغیرہ ان ادبی شہہ پاروں میں استعمار اور استعمار زدہ کے حالات وواقعات بیان کیے گئے ہیں۔ استعماری تسلط کے دوران استعمار زدہ پر ظلم و تشدد، بربریت اور ناانصافیوں کی داستانیں رقم ہیں۔ استعمار زدہ کی آواز کو کس طریقے سے دبایا گیا اور انہوں نے اپنے مسائل و مشکلات کا حل کیسے نکالا یہ تمام تجربات ان میں شامل ہیں۔ استعمار زدہ کی رد استعماری کاوشیں اور مزاحمتی تحریکوں کی روداد بھی موجود ہے۔ ان میں استعماری دور کی سماجی، ثقافتی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی صورتحال کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ استعمار نے استعمار زدہ کی مقامی زبانوں، ثقافت اور شناخت کو دقیانوسی قرار دیتے ہوئے اپنے ثقافتی کلچر کو پروان چڑھانے میں کس طرح مرکزی کردار ادا کیا۔ ثقافتی پیوند کاری کیسے کی گئی یعنی ثقافتوں کے اختلاط سے نئی ثقافتوں کی تشکیل کا مطالعہ شامل ہے۔

نو آبادیات "Colonialism" ایک ایسا تصور ہے جس میں طاقتور ممالک کمزور ممالک کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر کے وہاں پر کچھ لوگوں کو نو آبادیات کی شکل میں بساتے ہیں تاکہ ان علاقوں کے مقامی لوگوں پر اپنی عملداری قائم کی جا سکے۔ استعماریت "Imperialism" ایک وسیع تصور ہے جبکہ

نو آبادیات استعماریت کی ایک مربوط شکل ہے دوسرے ملک پر قبضہ کرنا اور وہاں پر نو آبادیاتی نظام قائم کرنا شامل ہے۔ ان ممالک کی معیشت کو کنٹرول کیا جاتا ہے اور پھر انہیں بین الاقوامی سطح پر نگرانی کرتے ہوئے تجارت سرمایہ کاری اور پھر عصر حاضر کی طرح بڑے بڑے قرضے فراہم کرے احسان کرنے ہوئے انہیں مقروض بنایا جاتا ہے۔ آئی ایم ایف اور عالمی بینک استعمار کے وہ جدید ہتھیار ہیں جو آج کل انتہائی کار گر ثابت ہو رہے ہیں۔ ان کے ذریعے سیاسی اثر رسوخ بڑھایا جاتا ہے حکمرانوں کو اپنے مفادات کے تابع کرتے ہوئے اپنی من مرضی کی پالیسیاں بنوائی جاتی ہیں تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے مجبور و مقہور ہوں اور اس کے تابع رہیں۔ یہ کھیل ایسے غیر محسوس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ جیسے "ون مین شو" ہو لیکن اس میں "مین" تو بہت زیادہ ہیں لیکن اپنے مفادات, حیلہ کاری اور مکاری کے باعث ایک دکھائی دیتا ہے کیونکہ ان سب کے مفادات ایک جیسے ہیں اس لیے یہ سارے متحد ہیں اور ان ممالک کا استحصال کیے ہوئے ہیں جنہیں اتفاق و اتحاد کی اہمیت کا احساس ہی نہیں وہ اپنی معیشت کو کیوں کر بہتر کر سکتے ہیں۔ علامہ اقبال نے بانگِ درا کی نظم "شمع اور جگنو" کا ایک شعر پیش نظر ہے:

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

مسلمانوں میں نا اتفاقی کی وجہ بھی یہی استعمار ہے۔ معاشرتی بے راہ روی، اپنے نصب العین سے روگردانی اور سماجی بندھنوں کی بے توقیری بھی استعماری ثقافتوں کے اختلاط سے وجود میں آئی اور جو نوجوان نسل کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔ اس میدان میں بھی استعمار کا ہتھیار کار گر ثابت ہوا۔ مقامی اسلامی کلچر و ثقافت اور روایات معدوم یا برائے نام دکھائی دیتی ہیں۔ مغربی پروپیگنڈے اور ثقافتی یلغار کے سامنے بے بس نظر آتی ہیں۔ اس سے اندازہ لگانا آسان ہے کہ طاقتور اقوام کی حکمت عملی کار گر ثابت ہوئی۔

نو آبادیاتی تناظرات کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی ایسی ہی صورتحال کا ادراک ملتا ہے۔ عالمی منظر نامے میں طاقتور اقوام کے مفادات آج بھی ترجیحی بنیادوں پر دیکھے جاتے ہیں۔ کمزور اقوام کا خون بھی پانی دکھائی دیتا ہے اور انصاف کی بجائے ناانصافی کا چورن عمدہ انداز سے پیش کیا جاتا ہے ساتھ ہی فلاح و بہبود کے

بلند و بام دعوے کیے جاتے ہیں تا کہ اقوام عالم ان معاملات کو ان کی نظر سے دیکھیں تا کہ ان کے لیے ستائش کا باعث بنے۔ جس سے عالمی سطح پر عدم توازن اور نا انصافی کی صورتحال مزید گمبھیر ہوتی دکھائی دیتی ہے ہیں۔ نو آبادیات کی وجہ سے ترقیاتی مسائل جنم لیتے ہیں جس سے ان ممالک کی ترقی محدود سے محدود تر ہوتی چلی جاتی ہے کیونکہ اس کے ثمرات کا بڑا حصہ طاقتور اقوام کو قرض کی ادائیگی کی شکل میں منتقل ہو جاتا ہے۔ مذہبی اور ثقافتی صورتحال بھی بین بین ہے کیونکہ استعمار نے اپنے مفادات کے لیے استعمار زدہ کی زبان و ثقافت کے ساتھ مذہبی ازادی و تعلیمات کو مشتشرقین کی نظر سے دکھانے کی کوشش کی ہے اور وہ کافی حد تک کامیاب ہو چکا ہے جس کی وجہ سے معاشرتی مذہبی تناؤ اور کشیدگی دیکھنے میں آئی ہے۔ ثقافتی اختلاط کی گواہی ہمارے میڈیا سے لی جاسکتی ہے جو بڑی شد و مد سے اس فریضہ کی انجام دہی میں مگن ہے۔ استعمار کے اس اعزاز کی وجہ سے مقامی ثقافتی اور شناخت دب کر رہ گئی ہیں۔ اس دور کی ادبی صورتحال تمام تفکرات کی غماز ہے اور یہ درج ذیل مفکرین کی کتب سے اخذ کی جاسکتی ہیں۔ " The Wrechard of the Earth" از فرانز فینن اس میں نفسیاتی و سماجی مسائل کے ساتھ آزادی کی تحریکوں اور نو آبادیاتی اثرات سے چھٹکارا پانے کے متعلق بات کی گئی ہے۔ "Culture and Imperialism" اس میں استعماری ادب اور ثقافت کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ "Accumulation on The World Scale" سمیر امین نے اپنی تحریروں میں واضح طور پر ان محرکات کی نشاندہی کی ہے جن کی بدولت استعمار منصوبہ سازی کے ذریعے استعمار زدہ کی اقتصادیات کو کمزور کرتا ہے۔

مابعد نو آبادیات " Postcolonialism" بھی دوسرے نظریات کی طرح علمی اور فکری نظریہ ہے۔ یہ نظریہ استعمار کی باقیات، اثرات اور اس کے خلاف رد استعماری تحریکوں سے وابستہ مسائل کو مطالعات کی مدد سے اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی مدد سے رد استعماری دور کے حالات و واقعات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ جب استعماریت کا خاتمہ ہوا اور استعمار زدہ نے آزادی حاصل کی تو ماہرین و محققین نے استعمار زدہ کی زبان، ادب، فنون، ثقافت اور سماجی روایات پر استعماری اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی بحالی کے لیے اقدامات تجویز کیے۔ اسی طرح سیاسی اور معاشی میدان میں ان اثرات کا جائزہ لیا

گیا تا کہ حالات کو قابل گرفت بنایا جا سکے کیونکہ استعمار نے سیاست اور اقتصادی میدان میں اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لیے کچھ اس قسم کے اقدامات لیے جن سے نو آبادیاتی علاقوں کی معاشی حالت پسماندہ رہی۔ مابعد نو آبادیات کا نظریہ ایسی صورتحال کی بحالی کے لیے معاون ثابت ہوا۔

استعماریت اور رد استعماریت کی ارتقا پذیری کو دو عنوانات "عروج اور زوال" سے دیکھا جا سکتا ہے۔ استعماریت کا عروج پندرویں صدی سے انیسویں صدی تک رہا اس عرصہ کے دوران اس نے اپنی توسیعی مہمات کو تقویت دی۔ امریکہ، افریقہ اور ایشیا بر اعظموں میں داخل ہو گیا۔ اقتصادی سطح پر ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی گئی اور مختلف ممالک میں تجارتی کوٹھیاں تعمیر کی گئیں۔ جس سے نو آبادیات کا قیام عمل میں آیا اور یورپی اقوام نے براہ راست حکمرانی کی اور اپنی زبان، ثقافت اور تعلیمی نظام کو ان نو آبادیاتی ریاستوں پر مسلط کیا۔ استعماریت کا زوال انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد آزادی کی تحریکوں میں تیزی آئی اور کئی ممالک نے آزادی حاصل کی اس طرح استعماریت کا خاتمہ ہوتا چلا گیا۔ رد استعماریت کا ابتدائی دور 1940ء سے 1960ء تک کا ہے۔ اس دور میں بہت سارے ممالک نے ان استعماری طاقتوں سے آزادی حاصل کی جن میں فرانس، برطانیہ، امریکہ، اٹلی، سپین، بیلجیم اور ان 1948ء میں اقوام متحدہ کے منظوری سے اسرائیل کو وضع کیا گیا۔ ان نو آبادیاتی ریاستوں کی آزادی کے بعد رد استعماری تشخص تہذیبی شعور اور لسانی شعور ترتیب پایا جس سے اس قوم کی قومی شناخت تشکیل پائی۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور مذہبی صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے ان مسائل کا حل نکالا گیا۔ اسی طرح بین الاقوامی تعلقات، تجارت اور سیاسی میدانوں میں تبدیلیاں کی گئیں تا کہ وہ بین الاقوامی برادری کا حصہ بن سکیں۔

رد استعماری لسانی شعور کا سیاسی تجزیہ کیا جائے تو سب سے پہلے استعماری زبانوں کا تذکرہ آتا ہے۔ استعمار نے جہاں جہاں نو آبادیات قائم کیں وہاں اس نے مقامی زبانوں کی جگہ اپنی زبانوں کو مستعمل کیا جیسے برطانوی استعمار نے ہندوستان، افریقہ اور کریبین میں انگریزی کو فروغ دیا جبکہ فرانسیسی استعمار نے افریقہ اور اس کے مختلف علاقوں میں فرانسیسی کو مروج کیا ایسے ہی ہسپانوی استعمار نے لاطینی امریکہ اور مختلف

ممالک میں ہسپانوی زبان کا چلن کیا ہے اور پرتگالی استعمار نے برازیل اور افریقی ممالک میں پرتگالی زبان کو فوقیت دی جس سے ان ممالک کی مقامی زبانیں دب کر رہ گئیں جس سے ان کی بقا کا خطرہ پیدا ہوا کیونکہ بدیشی زبانیں آہستہ آہستہ سرکاری اُمور کی بجا آوری کے علاوہ تعلیم اور تجارت میں اہمیت اختیار کرتی چلی گئیں۔ استعمار نے سرکاری سرپرستی میں تعلیمی اداروں میں بدیسی زبانوں کو فروغ دیا اور پھر سرکاری سطح پر اعلیٰ ملازمتوں کے لیے انہی کو فوقیت حاصل رہی جس نے معاشرتی سطح پر طبقاتی نظام کو جنم دیا اور اس طبقاتی تفریق نے معاشرتی سطح پر تعصب کو جنم دیا۔ جس سے غیر ملکی زبانوں کو فروغ ملا۔ نئی نسلوں کی آبیاری بدیسی زبانوں سے ہوئی جس سے مقامی زبانوں کی مقبولیت میں کمی آئی یہاں تک کہ نئی نسل آہستہ آہستہ اپنی زبانوں سے دور ہوتی چلی گئی جس سے مقامی زبانوں کی ترقی رک گئی۔ استعمار نے مقامی ادبیات کا بدیشی زبانوں میں ترجمہ کیا جس سے بدیسی اثرات مقامی ادب میں داخل ہوئے۔ جس سے مقامی زبانوں اور ثقافتی اقدار میں تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری نے بھی انگریزی زبان سیکھی اور اس سے استفادہ کرتے ہوئے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ انگریزی زبان کی وجہ سے انہوں نے بہت سارے قیدیوں کی مدد کی اور انہوں نے برطانوی استعمار کو پڑھا اور اسے عربی اور فارسی کی تعلیم دی۔ برطانوی استعمار اپنے ساتھ فنون لطیفہ لایا۔ جس کے اثرات نے مقامی ثقافت اور روایات میں تبدیلی پیدا کی۔ ردِاستعماری جدوجہد نے مقامی زبانوں کی مدد سے اپنی روایتی کہانیاں اور روایات کو زندہ کیا ہے جس کی بدولت ان کی ثقافتی اقدار اور شناخت مضبوط ہوئی۔ تعلیمی نظام میں بنیادی سطح پر مقامی زبانوں کی تدریس کو رواج دیا گیا۔ آہستہ آہستہ اعلیٰ سطحوں پر مقامی زبانوں کی تعلیم کو فروغ ملا جس سے مقامی زبانوں میں نئی ادبی تخلیقات کا رواج پڑا۔ مقامی زبانوں کی طاقت نے استعمار زدہ کے اندر سیاسی شعور بیدار کیا جس سے مزاحمت کو تقویت پہنچی اور جدوجہد میں تیزی آئی۔ مقامی زبانوں میں تحریر کردہ مضامین نے عوامی شعور کو بلند کیا کیونکہ مقامی زبانیں استعمار زدہ کے دلوں تک پہنچنے کا ذریعہ بنیں جس سے اپنائیت کا احساس ہوا۔ زبان و قلم سے ردِاستعماری تخلیقات نے مزاحمت کو جنم دیا۔ سیاسی سطح پر اسے بطور ہتھیار استعمال کیا گیا۔

رد استعماری تشخص نے آزادی کے جذبے کو فروغ دیا۔ علاقائی زبان و ثقافت کے تحفظ نے مشترکہ مقاصد کی جدوجہد کے لیے تحریک پیدا کی اور اس تحریک نے مزاحمتی شکل میں استعمار زدہ کی قومیت کو ابھارا اور وہ اپنے قومی مفادات اور تشخص کے تحفظ کے لیے قومی تحریکوں سے وابستہ ہو گئے۔ جس نے استعمار کے خلاف استعمار زدہ کی خواہشات کو بڑھاوا دیا اور یہ تحریکیں خود مختار ریاست کی طرف گامزن ہوئیں۔ جن میں پان امریکن موومنٹ، اشعب پارٹی، ویتنام ورکر پارٹی، مصر قومی پارٹی، انڈونیشین نیشنل پارٹی، کانگو نیشنل موومنٹ، افریقن نیشنل کانگرس، کانگرس اور مسلم لیگ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ استعمار کے طرز حکمرانی کے خلاف یہ تحریکیں میدان عمل میں آئیں اور انہوں نے استعمار سے اپنے مطالبات کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ ان تحریکوں کو کچلنے کے لئے تشدد کا سہارا لیا گیا اس سے ان کے اندر مزید پختگی پیدا ہوتی گئی لیکن استعمار زدہ نے اپنے مشن کی کامیابی کی خاطر عدم تشدد کی راہ لی۔ عدم تشدد فلسفے کے روح رواں لیو ٹالسٹائی ایک روسی فلسفی تھے ان کے خود نوشت A Confession "" میں روحانی بیداری کا ذکر کرتے ہوئے "عدم تشدد" پر زور دیتے ہیں۔ انہوں نے عدم تشدد کے ساتھ محبت، انسانی برابری، سادگی اور خود کفالت کی راہ اپنانے کا کہا ہے۔ مہاتما گاندھی نے بھی تشدد کی مخالفت کرتے ہوئے عدم تشدد کا فلسفہ پیش کیا اور وہ کہتے ہیں کہ تمام مسائل کا حل اور امن رہنے سے ہے۔ اس کے علاوہ سچائی، پیار، محبت، انسانی حقوق، خود انحصاری اور سادگی کو فروغ دینے کی تعلیمات دیتے تھے۔ بدھ مت کا فلسفہ عدم تشدد بھی پیار، محبت، امن اور ہمدردی کی تعلیم دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے برطانوی استعمار نے وزارتی مشن ہندوستان بھیجا۔ نئی قانون سازی کے متعلق بات کی گئی جس میں انہیں مقامی شناخت اور خود مختاری کے ساتھ مقامی حکومتوں کی تشکیل کے لیے راہ ہموار کرنے کی کوشش کی گئی۔ جس سے استعمار زدہ کو اپنے متحدہ مقصد کے لیے راستہ نظر آیا۔ اخر کار وہ دن بھی آیا جب استعمار زدہ نہیں اپنی خود مختار ریاستیں قائم کیں اور اپنا نظام حکومت بنانے کا اختیار حاصل کیا۔ آزاد شدہ ریاستوں نے جمہوری انداز میں آزادانہ انتخابات اور سیاسی جماعتوں کی معاونت سے عوامی نمائندے منتخب کر کے اپنی مقامی خود مختار حکومتیں قائم کر لیں اس کے بعد مقامی حکومتوں کے ذریعے مقامی اداروں کو فعال بنایا گیا تاکہ مقامی سطح پر استعمار زدہ کے مسائل کو اچھے اور بہتر انداز سے حل کیا جا سکے۔ آئینی و قانونی

اصلاحات کی گئی جس میں مقامی زبان و ثقافت کے تحفظ اور نظام عدل کی ضمانت دی گئی۔ استعماری دور کی اقتصادی اور تعلیمی پالیسیاں تبدیل کی گئیں تاکہ ایک خوشحال معاشرہ قائم کیا جا سکے۔ مقامی قیادت کے ابھرنے سے مقامی لوگوں کو حکومتی عہدوں پر لگایا گیا جس سے سماجی سطح پر ترقی و خوشحالی کا اغاز ہوا۔

سماجی سطح پر مقامی ثقافتی ورثے کے تحفظ کے لیے مختلف اقدامات اٹھائے گئے جن میں ثقافتی سینٹر کا قیام، میوزیم اور مقامی روایتی فنون کے فروغ کے لیے باقاعدہ ادارے قائم کیے گئے۔ سماجی سطح پر پرانے وقتوں سے میلے منعقد ہو رہے تھے اور وہ بھی تہذیب و ثقافت کے بہترین عکاس تھے جیسے لاہور میں میلہ چراغاں شالیمار باغ صوفی بزرگ شاہ حسین کے مزار پر منعقد ہوتا تھا۔ اسی طرح پار کا میلہ جو ہر سال مقبرہ جہانگیر میں منعقد ہوتا تھا جس میں امرتسر اور گردونواح کے لوگ جوق در جوق ٹرینوں کے ذریعے میلہ دیکھنے آتے تھے اور اپنے اپنے خیمے لگا کر سکونت اختیار کرتے اور مقامی روایتی پکوانوں سے لطف اندوز ہوتے ۔میلے میں قسم و انواع کی سرگرمیاں منعقد کی جاتیں۔ لوگ سارا سال میلے کا انتظار کرتے۔ اسی طرح کے اب بھی روایتی میلوں کا انعقاد ہوتا ہے جو قومی اور بین الاقوامی سطح پر تہذیب و ثقافت کا اظہار ہے۔ تہذیبی آمیزش سے نئے رنگ بکھرتے ہیں۔ تعلیمی اداروں کے اندر مقامی تشخص کو اجاگر کرنے کے لیے مقامی زبانوں، مقامی تاریخ، مقامی ثقافت اور روایات کو نصاب کا حصہ بنایا گیا تاکہ نئی نسل اپنی تاریخ اور روایات سے جڑی رہے۔ مقامی اساتذہ کی تربیت اس انداز سے کی گئی کہ طلباء اپنے اسلاف کی امانتوں کے امین رہیں۔ مقامی زبانوں کو باقاعدہ نصاب سازی کا حصہ بنایا گیا۔ روایتی میلوں ٹھیلوں اور مقامی تہواروں کے ذریعے مقامی رسم و رواج کو دوبارہ زندہ کرنے اور تحفظ کے لیے ان کا انعقاد کیا گیا۔ جس نے وقت کے ساتھ استعماری اثرات کو معدوم کر دیا۔

آزادی کے بعد نئی حکومتوں نے مذہبی رواداری کو فروغ دیا اور جسے آئینی اصلاحات کے ذریعے قانونی تحفظ فراہم کیا گیا۔ مذہبی اقلیتوں کے حوالے سے آزادانہ قوانین اور پالیسیاں مرتب کی گئیں تاکہ وہ نئی نسل کو اپنی مذہبی تعلیمات سے آگاہی دے سکیں اور ان کی تعلیم و ترقی اور تحفظ کے لیے حکومتی سطح پر اقدامات کیے گئے سرکاری سطح پر مذہبی اداروں کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے ذریعے آبادی کے لحاظ سے

مزید عبادت گاہیں بنائی گئیں تا کہ عوامی سطح پر لوگ اپنے عقیدے اور تعلیمات کے مطابق آزادی سے مذہبی رسومات ادا کر سکیں۔ مذہبی رواداری کے باعث مذہبی ادارے قائم کیے گئے جن میں قدیمی متون، تعلیمی مواد اور تحقیقی کتب کے تحفظ اور اشاعت کا بندوبست کیا گیا۔ مذہبی رسومات و روایات کی پاسداری کے لیے آئینی اصلاحات کے ذریعے قانونی ضمانت دی گئی۔ مذہبی تہذیبی اور ثقافتی تبادلے کے لیے بین المذاھب مکالمہ اور سیمینارز کا بندوبست کیا گیا۔ مقامی سطح پر مذہبی تقریبات، مذہبی تہواروں، مقامی مذہبی رسومات کی اجازت دی گئی تا کہ ان کا احیاء کیا جاسکے جس سے بین المذاہب ہم اہنگی کو فروغ دیا گیا۔

ایک تہذیب اپنے اندر اقدار کا نمائندہ ہوتی ہے وہ متغیر مسائل کو پیدا کرتی ہے اور پھر اس کا حل پیش کرتی ہے یہ تہذیبی حصار کے اندر رہتی ہے یہ ایک فطری عمل ہے اور غیر محسوس انداز سے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ استعماری تہذیب نام کی کوئی چیز نہیں کیونکہ استعمار کو کسی ملک پر قبضہ کرنے کا جواز نہیں ہے یہ طاقت کا فیصلہ ہے طاقت اور تہذیب کا کوئی جوڑ نہیں بنتا لیکن مشرقی تہذیب کو برباد کرنے کا فریضہ پورا ہو جاتا ہے۔ رد استعماری تہذیبی آمیزش کے سیاسی محرکات و اثرات کا مطالعہ استعمار کے اس سیاسی رویے کی نشاندہی کرتا ہے کہ جس نے استعمار زدہ کو اس سے چھٹکارا حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ استعمار نے تسلط کو قائم رکھنے اور مقامی وسائل سے بھرپور استفادہ کرنے کے لیے سخت سے سخت اپنے قوانین متعارف کروائے جو مقامی قوانین کا متبادل ٹھہرے۔ جس سے مقامی عدل و انصاف متاثر ہوا جس سے استعمار زدہ کے حقوق اور مفادات کی حفاظت مشکل ہو گئی۔ قانونی تبدیلیاں آنے سے مقامی انتظامیہ میں رد و بدل کیا گیا مقامی روایتی اہل کار آہستہ آہستہ غیر فعال ہوتے چلے گئے۔ مقامی سطح پر نئی ٹیکس پالیسیوں کا نفاذ کیا گیا ہے جس نے مقامی اقتصادی خود مختاری کو نقصان پہنچایا اور ان کی سیاسی نمائندگی کو محدود کر دیا گیا۔ اور یہ تبدیلیاں استعمار کو مضبوط کرنے کے لیے کی گئیں۔ استعمار زدہ کے ساتھ غیر انسانی سلوک روا رکھا گیا اس استحصال کے نتیجے میں استعمار زدہ کی مالی حالت کمزور ہوتی چلی گئی جس نے مقامی سطح پر انتشار، عدم مساوات اور بے چینی کو جنم دیا جو آخر کار احتجاج کی شکل میں نمودار ہوا اور اس طرح آزادی کی تحریکوں نے پنپنا شروع کر دیا۔ استعمار نے اپنے کلچر و ثقافت کو مروج کرنے کے لیے مقامی ثقافتوں اور روایات کو معدوم کیا جس سے استعمار زدہ نے اپنی

شناخت اور ثقافت کے تحفظ کے لیے صدائے احتجاج بلند کی۔ تعلیمی اصلاحات کے نام پر تعلیمی نظام کو یکسر بدل دیا گیا استعمار زدہ کو جدید تعلیمی نظام سے آگاہی نے مزید برانگیختہ کر دیا۔ قانونی لحاظ سے تو پہلے ہی استعمار نے استعمار زدہ کا بندوبست کر لیا تھا جب پانی سر سے گزرا تو مقامی قیادت نے استعمار کے خلاف آواز اٹھائی تو جلیانوالہ باغ کا سانحہ کر دیا گیا جسے بھرپور قوت سے دبانے کی کوشش کی گئی لیکن یہ آواز دبا نہ سکے۔ سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی مقامی قیادت کو گرفتار کر لیا گیا جس سے آزادی کی تحریکیں مزید تیز ہوتی چلی گئیں۔ ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک نے استعمار کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔

سماجی سطح پر مقامی اور بدیسی ثقافتوں کی آمیزش نے نئے سماجی نظام کو جنم دیا جیسے مغرب میں لاطینی امریکی ثقافت پروان چڑھی۔ یہ ثقافت مقامی قبائل اور ہسپانوی و پرتگالی ثقافتی اثرات کی آمیزش کا نتیجہ تھی۔ اسی طرح برصغیر میں یورپی اقوام کے ساتھ مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں کی ثقافتی آمیزش نے نہ صرف معاشرتی روایات میں تبدیلی پیدا کی بلکہ رہن سہن، کھانا پینا اور حتی کہ تہذیب و تمدن میں بھی کافی فرق پڑا۔ اس نے مذہبی رسومات میں بھی اپنا بھرپور حصہ ڈالا۔ چین اور جاپان کی تہذیبی آمیزش بھی ایک دوسرے کے ثقافتی ورثہ میں تبدیلی کا باعث بنیں۔ اسی طرح مختلف ممالک کی تہذیبی روایات ایک دوسرے ممالک کی تہذیبی روایات میں نفوذ پذیری رکھتی ہیں۔ استعمار نے اپنا مکمل تعلیمی نظام متعارف کروایا جس کی وجہ سے مقامی نظام تعلیم اور نصاب میں تبدیلیاں کی گئیں جس سے ایک نیا تعلیمی نظام وجود میں آیا جو مغربی تعلیم سے ہم آہنگ تھا اور جو ان معاشروں میں مغربی تعلیم اور جدید علوم متعارف کروانے کا باعث بنا۔ نظام تعلیم کو عالمی سطح سے ہم آہنگ کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ مقامی نصاب تعلیم کو مغربی نصاب کے ساتھ ہم آہنگ کیا گیا۔ جس سے مغربی موضوعات کو پزیرائی ملی جس کی وجہ سے روایتی مقامی تعلیمی روایات کمزور ہوتی چلی گئیں۔ مغربی زبانوں کی تدریس نے مقامی زبانوں کو کمزور کیا اور وہ ان زبانوں کے ساتھ مخلط ہوئی۔ اور آہستہ آہستہ مقامی ادبیات میں کمی واقع ہوتی چلی گئی۔ استعمار نے سماجی اور انتظامی سطح پر ان لوگوں کو اعلی تعلیم دی جو مقامی سطح پر اس کے نظام کو برقرار رکھنے میں اس کے معاون ثابت ہو سکتے تھے اور یہ مغربی اعلی تعلیم ایک مخصوص طبقہ فکر کے لیے تھی۔ جس نے مقامی سطح پر تعلیمی میدان میں عدم توازن پیدا کیا۔

استعماری اور مقامی تہذیبوں کے مخلوط ادب اور قدیمی نسخوں کے بدیسی زبان میں تراجم کیے گئے جس سے مقامی کہانیوں اور روایات میں دونوں ثقافتوں کے اثرات ملتے ہیں۔ ثقافتی سینکریٹزم " Cultural Syncretism " پیدا ہوا۔ مختلف ثقافتوں کی آمیزش سے معاشرتی سطح پر شادیوں، تہواروں اور سماجی تقاریب میں مشترکہ اثرات نظر آنے لگے۔ کھانوں میں، لباس میں، غذاؤں میں یہاں تک کہ انداز پیشکش بھی تبدیل ہو گئے۔ اس طرح ایک نئی ثقافت نے جنم لیا۔

میکس ویبر (Max Weber) ایک مشہور جرمن فلسفی تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب۔ (The protestant Ethic and the Spirit of capitalism) میں سرمایہ داری کو الوہی مذہب ثابت کیا ہے اور سرمایہ داری اور مادی ترقی میں جدید آزاد کردہ ممالک میں ترقی کا معیار بنا دیا جس کا مشرقی تہذیب سے (مذہبی تہذیب) کہ اندر سرمایہ داری کے متعلق یہ خاص محتاط رویہ ہے تہذیبی آمیزش سے مذہب اور مشرقی تہذیب کو نقصان پہنچا اس لیے یہ تمام ممالک تہذیبی شعور کی نشاۃ الثانیہ نہیں کر سکے اس لیے ان ممالک کی معیشت استعماری ممالک کی دست نگر ہے۔ استعمار نے مذہبی سینکریٹزم (Religious Syncretism) تخلیق کیا۔ استعمار نے مذہبی سطح پر مختلف مذہبی روایات، رسم و رواج کی آمیزش سے نئی مذہبی صورتیں پیدا کیں جس سے ایک مذہبی تنوع پیدا ہوا اس کا تجربہ لاطینی امریکہ میں عیسائیت اور مقامی قبائل کے رسم و رواج، عقائد کو یکجا کر کے ایک نئی شکل وضع کی۔ استعماری طاقتوں نے عیسائیت کی تبلیغات کے لیے مقامی علاقوں میں مذہبی مشنریوں کو بھیجا تاکہ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ کے ساتھ عیسائیت قبول کرنے پر راضی کریں۔ انہوں نے اپنے مذہب کی ترویج کے لیے مشنری سکول، ہسپتال اور عبادت گاہیں قائم کیں۔ مذہبی ترویج و اشاعت کے لیے قانونی اور انتظامی اصلاحات کی گئیں جس سے استعمار زدہ کی مذہبی سرگرمیوں کو محدود کر دیا گیا جبکہ استعماری مذہب کی بھرپور حمایت کی گئی۔ جس کی وجہ سے مقامی مذہبی ادارے اور استعمار زدہ کے عقائد کمزور پڑتے گئے۔ استعمار نے ان کی مذہبی رسومات اور عقائد میں تحریف کر کے مذہبی شناخت کو گم کر دیا اور مختلف تعاملات سے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی۔ اس طرح مذہبی تنازعات پیدا کیے گئے جیسے مسجد شہید گنج کا واقعہ ہوا خوب قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا گیا اور قید و بند کی

صحبتوں میں ڈالا گیا۔ فتنہ قادیانیت پیدا کیا گیا اس نے مسلمانوں میں رجعتی عناصر پیدا کیے جنہوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ بہت سارے ممالک میں استعمار کے لیے جاسوسی کی خدمات انجام دیں۔ دوسری اقوام سے زیادہ مسلمان کاسہ لیسوں نے استعمار کا ساتھ دیا۔ جس کی وجہ سے مسلمان اکثریت نے تقسیم ہندوستان کے وقت نقصان اٹھایا۔

2۔ تحقیقی نتائج:

- ❖ استعمار کے چلے جانے کے بعد استعمار زدہ کو آزادی حاصل ہوئی اور انہوں نے خود مختار حکومتیں قائم کیں۔
- ❖ خود مختار ریاستوں کے سیاسی نظام میں تبدیلی آئی ۔ ان میں سے کچھ ریاستوں میں جمہوری حکومتیں بنیں اور ان میں سے کچھ سلطنتیں قرار دی گئیں۔
- ❖ استعمار کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے مختلف محکموں میں اصلاحات لائی گئیں ۔ انتظامی معاملات کو بہتر کرنے اور نظام عدل کے لیے مختلف قوانین متعارف کروائے گے۔
- ❖ مقامی ثقافتوں کے احیاء کے لیے کوششیں کی گئیں ۔ مقامی زبان ، شناخت اور روایات کی بحالی کے لیے کوششیں کی گئیں۔
- ❖ تعلیم اور صحت کے نظام میں تبدیلیاں لائی گئیں۔
- ❖ معاشرتی طبقاتی فرق کو ختم کیا گیا اور برابری کے اصول کو اپنایا گیا۔
- ❖ معاشی ترقی کو فوقیت دی گئی اور خود انحصاری کی طرف بڑھا گیا۔ ایسے قوانین وضع کیے گئے جس میں زراعت، تجارت، صنعت و حرفت اور سرمایہ کاری کو فروغ ملا۔ اور مقامی وسائل کو بہتر انداز سے استعمال کرنے پر توجہ دی گئی۔
- ❖ برطانوی استعمار کے خلاف مختلف جماعتیں وجود میں آئیں ۔ ان میں نمایاں کانگرس اور مسلم لیگ تھی اور اس کے خلاف آزادی کی تحریکیں شروع ہوئیں۔

❖ ہندوستان میں سول نافرمانی کی تحریک چلائی گئی۔

❖ جنوبی افریقہ میں نیلسن منڈیلا نے نسل پرستی کے خلاف جدوجہد کی تحریک چلائی۔ مختلف افریقی ممالک نے قوم پرستی کے خلاف تحریکیں چلائیں جن میں کنگو کی تحریک بیلجیم استعمار کے چلاف چلائی گئی جبکہ گھانا کی آزادی کی تحریک برطانوی استعمال کے خلاف چلائی گئی۔

❖ عربوں میں ترک عثمانی سلطنت کے خلاف قوم پرستی کی تحریک چلی۔ مصر میں برطانوی استعمار کے خلاف آزادی کی تحریک چلائی گئی۔ فلسطینیوں نے قومی تحریک چلائی جس میں انہوں نے سہونیت کے خلاف مزاحمت پیش کی۔ یمنیوں نے استعمار کے خلاف مزاحمت کی اور جنوبی یمن میں تحریک چلی۔

❖ لیبیا نے اٹلی میں استعماری قبضے کے خلاف تحریک چلائی اور جنگ کی۔چین میں قوم پرستی کے خلاف تحریک چلی جس نے چینی سلطنت کو ختم کیا لاطینی امریکہ کی تحریک چلی جس نے اسپین کی نوآبادیات کے خلاف جنگ کی۔اٹلی میں نو آبادیات کے خلاف تحریک چلی جس نے اٹلی کو متحد کیا۔

❖ منتخب آپ بیتیوں میں آپ بیتی نگاروں نے استعمار کے تسلط اور انگریزی، فرانسیسی اور ہسپانوی زبانوں کے رائج ہونے جبکہ مقامی زبانوں کو دبانے کی کوششوں کا ذکر کیا لیکن رد استعماریت نے مقامی زبانوں اور ثقافتوں کی بحالی پر زور دیا۔ جس کی وجہ سے مقامی زبانیں اور ثقافتی ورثہ دوبارہ زندہ ہوااور مقامی زبانوں کو دوبارہ سے پذیرائی حاصل ہوئی۔

❖ اردو کی آپ بیتیوں میں دوہری شخصیت اور استعمار کا بیان واضح ہے کہ رداستعماریت میں استعمار زدہ نے اپنی مقامی شناخت کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی لیکن دوہری شخصیت کا اثر آج بھی نو آبادیاتی خطوں میں پایا جاتا ہے حالانکہ انہیں استعمار سے آزادی حاصل کیے نصف صدی سے اوپر ہو چکا ہے۔

❖ منتخب آپ بیتیوں میں بیان ہوا ہے کہ استعماریت کے دوران مقامی اور استعماری ثقافتوں کا اختلاط ہوا۔ رد استعماریت میں یہ تہذیبی آمیزش مثبت صورت میں نظر آئی ۔ مقامی اور نو آبادیاتی عناصر نے مل کر نئی ثقافتی تہذیب کو جنم دیا۔ جسے مقامی معاشرے نے قبول کیا۔

3۔ سفارشات

- اردو ناول میں انگریز استعمار کے مقامی تہذیب پر اثرات: تنقیدی مطالعہ
- اردو افسانے میں برطانوی استعمار کی مذہبی یلغار: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ
- برطانوی اور امریکی استعمار کہ اردو نظم پر اثرات: تحقیقی اور تنقیدی جائزہ
- استعمار کے مقامی ادب پر ہونے والے اثرات: تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ
- استعمار کے مقامی سماجی ڈھانچے پر ہونے والے اثرات: تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ
- رد استعماریت میں معاشی ترقی کے اثرات: تحقیقی مطالعہ
- استعمار کی وراثت: رد استعماریت کے تناظر میں اصلاحات کا تجزیاتی مطالعہ
- اردو ادب میں استعمار اور رد استعماریت کی اصلاحات کا تجزیاتی مطالعہ
- رد استعماریت: مقامی زبان و ثقافت کے تحفظ کی کوششوں کا تجزیاتی مطالعہ
- اردو غزل میں رد استعماریت کا اظہاریہ: تجزیاتی مطالعہ
- رد استعماریت: تعلیمی نصاب تعلیم میں زبانوں کے کردار کا مطالعہ

کتابیات

بنیادی ماخذ:

محمد جعفر تھانیسری، ڈاکٹر، "کالا پانی المعروف تواریخ عجیب"، محمدن اینگلو اورینٹل پریس، لاہور، 1879ء

حسرت موہانی، مولانا، "قید فرنگ"، کتب خانہ اردوئے معلی، کانپور، 1929ء

شورش کاشمیری، "بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل"، مکتبہ ناصر، لاہور، 1960ء

دیوان سنگھ، سردار مفتون، "ناقابل فراموش"، مکتبہ جدید پریس، لاہور، 1954ء

ثانوی ماخذ:

1. ایڈورڈ سعید , "Culture and Imperialism"، بینگوئن بکس، انگلینڈ۔1995ء
2. ٹی بی میکالے، "Macaulay's Minute"، مشمولہ: میکالے اور برصغیر کا نظام تعلیم، سید شبیر بخاری: آئینہ ادب، لاہور 1986ء
3. سر سید احمد خان، مقالات سر سید، جلد سیز دہم، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1963ء
4. احمد، سہیل، "ردنو آبادیاتی تنقید"، مشمولہ: تسطیر، راولپنڈی، 1998ء
5. نیر، ناصر عباس، "مابعد نو آبادیات اُردو ادب کے تناظر میں"، کراچی، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2013ء
6. نیر، ناصر عباس، "جدیدیت اور نو آبادیات"، کراچی، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2021ء
7. انور سدید، ڈاکٹر، "اردو ادب کی تحریکیں"، کراچی، انجمن ترقی اردو، س ن
8. سر ہمفری گلبرٹ، "ہمفرے کے اعترافات"، انجمن نوجوانان پاکستان، لاہور، س ن
9. جان لاک وڈ کپلنگ، "Beast and man in India" البیرونی، لاہور، 1978ء
10. سی ایل انس، "The Cambridge Introduction to Post colonial Literature in English"، کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج، 2007ء
11. ایڈورڈ سعید، "orientalism"، بینگوئن بکس، انگلینڈ، 1995ء
12. فرانز فینن، "افتادگان خاک"، فکشن ہاوس، لاہور، 2017ء
13. ٹریولین، چارلس ایڈورڈ، "On the education of the people of India"، لانگ مین، ارمی براون، گرین اینڈ لانگ مینز، لندن، 1838ء

14. لارڈ تھامس بینگٹن میکالے، "مقالہ میکالے"، مشمولہ: میکالے اور برصغیر کا نظام تعلیم، مرتبہ: سید شبیر بخاری، آئینہ ادب، لاہور، 1986ء

15. حسین احمد مدنی، مولانا، "برطانوی راج نے ہمیں کیسے لوٹا"، طیب پبلیشرز، 2014ء

16. ششی تھرور، "عہد ظلمات"، عکس پبلی کیشنز، لاہور، 2021ء

17. ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر، "Our Indian Musalman"، مکی دارالکتب، لاہور، ص: 62

18. محمد افضال، ڈاکٹر، "اردو ناول میں سماجی شعور"، پورب اکیڈمی، اسلام آباد،

19. سبط حسن، "پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء"، مکتبہ دانیال، کراچی، 2002ء

20. سبط حسن، "پاکستان کے تہذیبی و سیاسی مسائل"، مکتبہ دانیال، کراچی، س ن

21. طارق ہاشمی، "داغ دہلوی کا مابعد نو آبادیاتی مطالعہ"، سلیم نواز پرنٹنگ پریس، فیصل آباد، 2018ء

22. محمد عامر سہیل، "نو آبادیات و مابعد نو آبادیات: نظریہ، تاریخ، اطلاق"، عکس پبلی کیشنز، لاہور، 2019ء

23. شورش کاشمیری، "پس دیوار زنداں"، مکتبہ ناصر، لاہور، 2019ء

24. سر سید احمد خان، "اسباب بغاوت ہند"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2016ء

25. شازیہ جعفر، "بلوچستان اور برطانوی سامراج: ایک تاریخی جائزہ"، فکشن ہاوس لاہور، 2016ء

26. محمد حبیب، خلیق احمد نظامی، "جامع تاریخ ہند"، اے ایس پرنٹرز، لاہور، 2018ء

27. ظہیر دہلوی، "داستان غدر"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2007ء

28. مبارک علی، ڈاکٹر، "برطانوی راج"، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، 2016ء

29. K.K.Aziz,"The Making of Pakistan:A Study in Nationalism", Izharsons printers, Lahore , 2015

30. سجاد، محمد، "نو آبادیات اور علاحدگی پسندی کی مزاحمت: مظفر پور کے مسلمان 1857ء کے بعد"، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، س ن

31. محمد علی، چراغ، "تاریخ پاکستان"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1987ء

32. زاہد حسین، انجم، "تاریخ پاکستان: 1947ء تا حال"، نیو بک پیلس، لاہور، س ن

33. ایڈورڈ سعید، "ثقافت اور سامراج"، مترجم: یاسر جواد، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، 2009ء

34. عبد القادر، امتیاز، "پس نو آبادیات: مشرق کی بازیافت کی تحریک"، مشمولہ: اورینٹل کالج میگزین، جلد 31، 2016ء

35. جمیل جالبی، "پاکستانی کلچر: قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ"، مشتاق بک ڈپو، کراچی، 1964ء

36. محمد نعیم، "اُردو ناول اور استعماریت: انیسویں صدی کے ناول کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ"، کتاب محل، لاہور، 2017ء

37. شائستہ شریف، "اُردو میں مابعد نوآبادیاتی مطالعات: ایک جائزہ"، مشمولہ: میگزین گورنمنٹ کالج برائے خواتین، گلبرگ لاہور، سن ن

38. اطہر قسیم، "مقالہ: اُردو ادب کی آپ بیتیاں: تحقیقی و تنقیدی جائزہ"، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، پاکستان، جون 2007ء

39. جیورجی رودینکو، "استعماری اور نو آبادیاتی نظام: ماضی و حال"، مترجم: ڈاکٹر ظفر عارف، کراچی اسٹڈی سرکل، کراچی، سن ن

خدا حافظ